رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

ہمایوں بابت ماہِ جولائی ۱۹۳۳ء

تصویر:- محبت کا مندر

قیمت فی پرچہ ۱۰؍ — ولایت یک سالہ ۸؍ — چندہ سالانہ [illegible]

طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) مدیرِ ہمایوں کی تازہ تصنیف

کے متعلق

اہلِ ملک کی رائیں

جناب شوکت تھانوی ایڈیٹر سرپنچ لکھنو

میں "طلسمِ زندگی" کے حسنِ طباعت یا اس کی عروسانہ زینتوں سے مرعوب ہو کر نہیں بلکہ اس کے سیاہ الفاظ کی گہرائیوں تک پہنچنے کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کے مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ آپ کا دیوان ہے۔ آپ شاعر ہیں اور یقیناً شاعر بلکہ آپ کا درجہ اُن شعرا سے یقیناً بلند ہے جو عروض کے قیود میں پھنس کر اِن حسین و جمیل، بلند و بالا، لطیف اور نازک تخیلات کو کھو بیٹھتے ہیں جو "طلسمِ زندگی" میں اپنی قدرتی شکل کے ساتھ بکھرے پڑے ہیں۔ "طلسمِ زندگی" کا ہر جملہ مجھ کو ایک خوبصورت مصور شعر نظر آیا۔ آپ نے شاعری بھی کی ہے اور مصوری بھی۔ آپ کے مضامین سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ہر وقت کن بلندیوں پر اڑا کرتے ہیں۔

یہ کتاب یقیناً ہندوستان کی ایک یادگار تصنیف ہے اور اردو لٹریچر کی ایک تاریخی کڑی۔

جناب ہارون خانصاحب شروانی پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن)

تمہاری "طلسمی طلسمِ زندگی" آنے کے چند منٹ بعد اس کی دیدہ زیبی پر عش عش کر گئے تھیں اور تمہاری "رفیق زندگی" صاحبہ انتساب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ کتاب ہر آئین اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کرتی ہے۔

جناب سید عابد علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پروفیسر ڈی۔ ایس کالج لاہور

آپ کی طرف سے میں اپنے دل میں جو جذباتِ عقیدت رکھتا ہوں ان کا اظہار ایک رسمی بات ہوگی لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں در حقیقت آپ کے مضامین کی اشاعت کے لئے بیتاب تھا مگر وہاب پروردگار نے اس کی اجازت دی کہ گاہ گاہ آپ کی صحبتِ بابرکت سے مستفید ہوتا لیکن آپ کے دل افروز اور زندگی بخش مضامین کے ذریعے سے اس بشیر احمد کی زیارت نصیب ہوتی رہی ہے جسے بہت کم آدمی جانتے اور سمجھتے ہیں۔ میں کیا اور میری رائے کیا لیکن انشاء اللہ ایک مضمون کے ذریعے سے اپنے جذبات کا اظہار کروں گا۔ **قیمت فی جلد پانچ روپے۔**

سید عبد اللطیف۔ دفتر رسالہ "ہمایوں" ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

جہاں نما

دوسری جنگ عظیم کا مہیب تصور

زہریلی گیس کے بم

رل آف سالزبری نے اپنے ایک مضمون میں اُس صورت حالات کا خوفناک نقشہ کھینچا ہے جو کسی دوسری جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے پیدا ہو سکتی ہے ــــ "لندن کے لاکھوں نفوس موت کے آغوش میں پڑے ہوں گے۔ وادی ٹیمز کی فضا ہفتوں تک زہریلی گیس سے اٹی رہیگی اور گیس کے حملوں سے بچاؤ کی سب تدبیریں بیکار ہو جائینگی"۔

لارڈ سالزبری نے ایسی سخت۔ زہریلی گیسوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کو عذاب سے اتنا دیوانہ بنا دیں گی کہ اسے تنفس کے مصنوعی آلات سے کام لینے کی تاب ہی نہ رہے گی۔ انہوں نے ایسے بموں کا ذکر کیا ہے کہ صرف ایک بم ریجنٹ پارک سے لے کر ٹیمز تک کی تمام آبادی کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ تین بڑے بڑے غیر ملکی کارخانوں کے متعلق معلومات حاصل کی گئی ہیں اور معلوم ہوا ہے کہ ان کارخانوں میں سے ہر ایک نہایت قلیل مدت میں بے پناہ زہریلی گیسیں تیار کر سکتا ہے۔

لارڈ سالزبری لکھتے ہیں کہ :-

"اس زمانے میں اگر وسیع پیمانے پر کوئی جنگ ہوئی تو شہری آبادی پر اس قدر خوفناک تباہی نازل ہوگی جس کا تصور ممکن نہیں یہ جنگ ہماری موجودہ تہذیب کا نام و نشان مٹا دیگی۔ گزشتہ "جنگ عظیم" تو آئندہ ہلاکت خیزیوں کے امکانات کا محض ایک افسانہ تھی اگر لندن جیسے بڑے بڑے شہروں پر گیس کے بم پھینکے گئے تو شہر کے باشندے زہریلی گیسوں کے مقابلہ کی کوئی پر اثر تدبیر اختیار کرنے کے قابل نہ ہونگے اگر شہروں کی آبادی کے لاکھوں نفوس کو مصنوعی آلات تنفس مہیا کر بھی دیئے جائیں تو ان کے استعمال کے لئے تجربہ کاری کی ضرورت ہے علاوہ ازیں اس قسم کے آلات کا بار بار معائنہ کرنا بھی ضروری ہے تاکہ مرمت وغیرہ سے وہ ہر وقت قابل استعمال حالت میں رہیں۔

آئندہ تباہی اور ہلاکت انگیزی کا تصور کرتے وقت ہمیں محض کلورین یا فاسگین کو مد نظر نہ رکھنا چاہیئے۔ آئندہ ان سے بہت زیادہ تباہ کن اور ہلاکت خیز گیسیں استعمال ہوں گی۔

اس تباہی کا تصور پیش نظر کرتے وقت ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان گیسوں کی زد صرف گیس روک خندقوں میں چھپے ہوئے سپاہیوں ہی پر پڑیگی بلکہ بڑے

بڑے تجارتی شہروں کی گنجان آبادی اور لاکھوں بے یار و مددگار مردوں عورتوں اور بچوں کی تباہی کا نقشہ پیش نظر لانا چاہیے۔
موجودہ زہریلی گیسوں میں سے بعض میں سنکھیا کی آمیزش ہوتی ہے اور یہ سیال حالت میں بھی ادھر اُدھر پہنچائی جا سکتی ہیں۔ انہیں بند کرنے کے لئے خاص طور پر مضبوط کیسے بنانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ یہ مقابلۃً بہت کم خرچ سے زہریلے دھوئیں کی صورت میں تبدیل کی جا سکتی ہیں۔
یہ گیسیں نہایت ہی طاقتور ہیں اگر ہوا کے بیس کروڑ حصوں میں (Diphenylchlorarsine) کا ایک حصہ بھی ملا دیا جائے تو وہ ناک میں جلن پیدا کر سکتا ہے اور اگر ہوا کے پانچ کروڑ حصوں میں اس گیس کا ایک حصہ ملا دیا جائے تو اس کے نمایاں اثرات ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہوا اور گیس کے اس تناسب میں انسان صرف پانچ منٹ تک زندہ رہ سکتا ہے انسان اس سے سخت دماغی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس پر پژمردگی کے آثار چھا جاتے ہیں۔ اگر گیس ذرا زیادہ مقدار میں چھوڑ دی جائے تو آدمی مارے درد اور تکلیف کے پاگل ہو جاتا ہے اور اُسے اپنے دماغ پر قابو نہیں رہتا۔
اگر کسی شہر پر پہلے سنکھیا کی گیس کے بم پھینکے گئے اور بعد ازاں سکتہ طاری کرنے والی نئی گیس چھوڑی گئی تو اس کی آبادی بالکل نیست و نابود ہو جائے گی۔
اگر کسی شہر پر بڑے بڑے بھک سے اڑنے والے بموں کے بجائے نئی گیس کے بم پھینکے گئے تو وہ اُن سے کہیں زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہونگے۔ بالفرض اگر کوئی بڑے سے بڑا بھک سے اڑنے والا بم پکڈلی سرکس پر پھینکا جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ کرائیٹرین جیسی عظیم الشان عمارت کو تباہ کر سکتا ہے اور تقریباً پچاس نفوس کی جان لے سکتا ہے لیکن موجودہ گیس کا صرف ایک بم ریجنٹس پارک سے لے کر ٹیمز تک کے قصبے کے ایک ایک فرد کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔
جن کارخانوں کا ذکر کیا گیا ہے اگر وہ اپنا معمولی کام بند کر دیں تو ایک ہفتے کے اندر اندر وہ روزانہ (Diphenylchlorarsine) کے پچاس ٹن تیار کر سکتے ہیں اور اس زہر کی کوئی بھی مقدار نہایت آسانی سے سوڈیم سائنائیڈ یا پوٹاشیم سائنائیڈ کے عمل سے (Diphenylcyanoarsine) میں تبدیل کی جا سکتی ہے۔
اب لندن کا بڑا حصہ ٹاٹنہم ومبلڈن جوچمنڈ اور بارکنگ کریک کے درمیان واقع ہے لیجئے۔ اس رقبہ کی فضا کو چالیس فٹ کی بلندی تک مہلک بنانے کے لئے زہریلی گیس کے صرف چالیس ٹن کافی ہیں۔
اگر اس گیس کی متذکرہ بالا مقدار تیار کر کے لندن پر جنگ سے پہلے چند دنوں میں پھینک دی گئی تو اس کا کیا ردعمل ہو سکتا ہے؟ ۱۹۲۲ء میں گیسوں کے مقابلہ کے لئے جو دفاعی تدابیر سوچی گئی تھیں وہ عملاً ناکام ثابت ہوئیں اور معلوم ہوا کہ وہ لندن کو بچانے پر قادر نہیں لندن کی سرزمین ان آنکھوں میں گیس کے گھنے بادلوں کی لپیٹ میں آ جائیگی جو ٹیمز کی وادی پر دنوں بلکہ ہفتوں تک چھائے

رہیں گے۔ دو تین دن کے اندر اندر شاید ہی کوئی فرد بشر زندہ باقی رہے۔

جب دشمن لندن سے بنٹ لیں گے تو پھر برمنگھم۔ مانچسٹر۔ لورپول اور دوسرے بڑے بڑے تجارتی شہروں پر بھی ہلّہ بول دینگے"

بنگالی ادب کے موجودہ رجحانات

"ترمینی" میں بنگالی ادب کے موجودہ رجحانات کے متعلق ایک قابلِ قدر تنقید چھپی ہے۔ یہ تنقید چونکہ اس ملک کی دوسری زبانوں کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہے اس لئے یہاں ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں:۔

ادبیات میں حقیقت نگاری کے اصولوں پر بحث کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ موجودہ بنگالی ادب اپنے اندازِ اظہار اور مقاصد کے اعتبار سے حقیقت نگاری کا نمونہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ موجودہ ادب کا جنسی مسائل کی طرف مائل ہونا بعض لوگوں کے نزدیک اس لئے قابلِ قدر ہے کہ وہ اسے "رومانیت" کا نقیض سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ وہ محض ایک "رومانیت" سے نکل کر دوسری "رومانیت" میں پھنس رہے ہیں۔ اب تصویر کی دلچسپی کا مرکز زندگی کی نرم و نازک اور لطیف و شیریں چیزوں کے بجائے بدی، بدصورتی اور کراہت کا غائر مطالعہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن زندگی کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کی طرف حد سے زیادہ متوجہ ہو جانا اس دقیق اور نازک تصویر میں روشنی اور سائے کے تقابل پر اثر انداز ہو کر اسے بدل دیتا ہے اور ہمارے سامنے ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو لازماً "رومانی" ہوتی ہے۔

اسی بات کو ایک اور طرح بھی واضح کر سکتے ہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ تمام جنسی مسائل سے ہمیں ایک مریضانہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے لاکھوں ہم جنس زندگی قائم رکھنے کے لئے سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے ہیں لیکن ہمارے ادب میں اس افلاس، جہالت، کم ہمتی، بیماری اور ناخوشی کا کوئی اثر نظر نہیں آتا جس کی نحوست ہمارے گرد و پیش ہر وقت منڈلاتی رہتی ہے۔ ہمارے ادیب اپنے ملک کی غلامی کی ذلت کا احساس نہیں رکھتے اور نہ اُن کی تحریروں میں اہلِ ملک کی جد و جہدِ آزادی کے ہنگاموں کی صدائے بازگشت کا کوئی سراغ مل سکتا ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس جد و جہد کے خالص سیاسی پہلو سے ادبیات کا بہت کم تعلق ہے لیکن زندگی کے اس زبردست جوش کا عکس ہمارے ادبا کی تحریروں میں ضرور نظر آنا چاہیئے جو قوم کی روح کی گہرائیوں سے اٹھ رہا ہے۔ لوگ فن کاروں سے متوقع ہوتے ہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش کی اشیا کے متعلق نہایت نازک اور ذکی احساس رکھتے ہوں لیکن جب وہ اُن ہنگاموں سے بھی متاثر نہ ہوں جو ایک عام انسان کی توجہ بھی اس کے روزانہ کاروبار سے ہٹا لیتے ہیں تو ہم ایسے فن کاروں کے تصور اور احساس کے متعلق کیا رائے قائم کریں؟

اس رومانیت کی جو ہمارے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی ہے کئی صورتیں ہیں۔ فی الحقیقت یہ زندگی سے ایک قسم کی پناہ طلبی ہے جس کی طرف ہمارے میل کی سب سے بڑی وجہ ہماری سیاسی غلامی ہے جو کچھ ہم ہیں ہم اس سے مطمئن نہیں۔ اس لئے ہم خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس طرح اپنی زندگی کی کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں ہم اسی لئے تنقید سے بھی گھبراتے ہیں کہ ہمیں اپنی قابلیت پر پورا اعتماد نہیں ہم اپنے گزشتہ اور آئندہ خوابوں اور خیالوں پر ناز کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ وقت مع اپنی تمام تکلیف دہ خصوصیتوں کے ہماری روح پر سوار ہے اور رہے گا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ادب میں حقیقت نگاری کا عنصر مفقود ہے اور یہ فقدان ڈرامے میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ سیرت نگاری اور جذبات کے اعتبار سے ہمارا ڈراما محض باطل ہے۔ ہمارے ہاں بے اعتدالی "تعلیت" کا بہروپ بھر لیتی ہے اور زبردست اور جوشیلے ولولوں کی جگہ مریضانہ جذبات کو مل جاتی ہے۔ ایسے ڈرامے کے متعلق کم از کم اتنی بات ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ "حقیقت طرازی" سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔

محبّت کا مندر

ایراس، محبت کا دیوتا قدیم خیال کے مطابق اس عالم کون وفساد میں خود بخود نمودار ہوا اور اس کے روحانی تصرف سے دنیا کے باہم آویز عناصر میں یک بیک ہم آہنگی و یک جہتی پیدا ہوگئی محبت کا یہ نفیس تصوّر رفتہ رفتہ گردشِ روزگار کے دھندلکے میں غائب ہوگیا اور ایراس کی جگہ ننھے اور شریر کیوپڈ نے لے لی جس کے ہاتھ میں ایک سنہری کمان رہتی ہے اور اس کی مدد سے وہ ہر وقت مختلف کمین گاہوں سے نوجوانوں کے دلوں پر اپنے بے پناہ تیروں کی بارش کرتا رہتا ہے۔

ایراس محض صنفی محبت ہی کا دیوتا نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ وہ ہر قسم کی محبت کا سر چشمہ متصور ہوتا تھا، خواہ دوستانہ محبت ہو یا حبِ وطن ہو یا ماں باپ کی محبت ہو۔ قدیم یونانی ایراس کو جنگ اور حبِ وطن کے جذبات کا آفریدگار سمجھتے تھے اور اہلِ سپارٹا جنگ کو جانے سے قبل ایراس کے معبد پر قربانیاں کرتے تھے اور وہیں یہ عہد و پیمان بھی استوار کرتے تھے کہ ہم باہم بھائیوں کی طرح رہیں گے اور آزمائش کے وقت ایک دوسرے کے وفادار ثابت ہوں گے۔

ایراس کے نام پر اُن دنوں جا بجا مندر تعمیر کئے گئے تھے جہاں خاص خاص موقعوں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔

ایراس کے مندر کی اس تصویر میں مصوّر نے پجاریوں کے گروہ کا ایک خوبصورت تصوّر پیش کیا ہے حسین پجاریوں کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں اور وہ گلاب کے پھولوں اور فاختاؤں کا ندرانہ لئے مندر کی قربان گاہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مشعلوں کی دلکش لَو مندر کی فضا کو اور بھی مسحور کن بنا رہی ہے۔

یہ تصویر انگریز مصوّر ہربرٹ شیملز کی فن کارانہ قابلیت کا نتیجہ ہے۔

ظرافت کی حقیقت و ماہیّت

(۱)

خندہ و گریہ کے افعال انسان سے مخصوص ہیں کیونکہ یہی ایک ایسی ذی حیات ہستی ہے جس میں اشیا کی ہیئتِ مثالی اور ہیئتِ کذائی کے مابین تفریق و تمیز کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ جب زندگی کے اہم اور سنجیدہ معاملات میں ہمیں ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور ہماری ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں تو صدمہ کی وجہ سے ہم رونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن ادنیٰ اور خفیف معاملات میں جب ہماری سوچی ہوئی باتیں پوری نہیں ہوتیں تو ہمیں ہنسی آتی ہے۔ یہ صورتیں تو اپنی زندگی سے متعلق ہیں اب ذرا دوسروں کی حالت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جب ہم بنی نوع انسان میں سے کسی کو آلام و مصائب میں گرفتار پاتے ہیں تو ہمارے دل میں ہمدردی و غمگساری کا احساس پیدا ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس جب کسی شخص سے کوئی لغو حرکت سرزد ہوتی ہے یا اس کو یکایک کوئی بے موقع حادثہ پیش آتا ہے تو ہم خواہ مخواہ ہنس دیتے ہیں کیونکہ اس سے ہماری ہمدردی یا غم و غصہ کا جذبہ مشتعل نہیں ہوتا۔

خندہ و گریہ کی تشریح دراصل حیاتِ انسانی کی تشریح ہے کیونکہ یہ دونوں عناصر زندگی کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں۔ **ایمرسن** نے انسان کی تشبیہ ایک ایسے رقاص سے دی ہے جو اشک اور تبسم کے درمیان ڈُھلتا رہتا ہے۔ فی الحقیقت جامۂ حیات رنج و راحت، غم و شادی یا گریہ و خندہ ہی کے متضاد تار و پود سے تیار ہوا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی بڑے درجہ یا منصب پر فائز کیوں نہ ہو، اس کی زندگی میں بھی اُتار چڑھاؤ واقع ہوتا رہتا ہے۔ اسے بھی ناکامیوں اور نامرادیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ الغرض آلام و مصائب زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ جب بارِ غم ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے تو انسان آہ و نالہ کے ذریعے سے اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اشک ریزی سے دل کو قدرے تسکین حاصل ہوتی ہے لیکن جب انسان سے کوئی احمقانہ فعل سرزد ہوتا ہے یا اس کو کوئی بے ڈھب واقعہ پیش آتا ہے تو جذبۂ ہمدردی کا فقدان ہمیں ہنسنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اگر انسان کی ہر فطری کمزوری، ارادی غلطی یا غیر اختیاری حادثہ پر ہم درد محسوس کریں اور ہنسنے کے بجائے رحم اور ترس کھایا کریں تو ہماری

زندگی ہی تلخ ہو جائے گی۔ اس لئے قدرت نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ جب کسی کو معمولی سی گھبراہٹ یا پریشانی کا کوئی موقعہ یکایک پیش آجاتا ہے تو ہماری توجہ اس کے ناخوشگوار نتائج کی جانب منعطف ہونے کے بجائے اُس کے عجب اور بے ڈھنگے پن پر مبذول ہوتی ہے۔ تمسخر کا جذبہ رحم پر غالب آتا ہے اور ہم غم کے عوض خوشی محسوس کرتے ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ خود وقت ہر درد کا مداوا ہے۔ انسان کو کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ پیش آئے لیکن بہ امتدادِ زمانہ اس کی سختیاں کم ہوتی جاتی ہیں اور آخر کار وہ اپنی قسمت پر صبر کر لیتا ہے۔ البتہ واقعات پر غور کرنے، معاملات کو سوچنے سمجھنے اور صبر و تحمل سے کام لینے کے لئے کافی وقت ضرور ملنا چاہیئے۔ اس کے برعکس اگر انسان کا دل و دماغ کسی شدید ناگہانی جذبہ سے مغلوب ہو جائے اور اس کو غور و فکر کرنے اور اپنی زندگی کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق بنانے کے لئے کافی وقت نہ ملے تو اضطراب کے عالم میں اس کا گریہ و زاری کرنا فطری ہوگا۔ اسی طرح خندہ بھی ایک غیر اختیاری و غیر ارادی فعل ہے جو جذبۂ سراسیمگی اور اصولِ تقابل کے زیر اثر رونما ہوتا ہے۔ یہاں بھی انسان کو سوچنے سمجھنے اور اپنے خیال و یقین کو متضاد مظاہر کے مطابق بنانے کا موقع نہیں ملتا۔

ہیزلٹ نے خندہ و گریہ کی کیفیتوں کو چند معمولی مثالوں سے واضح کیا ہے جو چھوٹے بچوں کی روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم کوئی نقلی چہرہ لگا کر کسی بچہ کے پاس جائیں تو اس بھونڈی اور بے ڈھنگی صورت کو دیکھتے ہی وہ ہنسنے لگے گا لیکن اگر ہم ایک لفظ بھی بولے بغیر نہایت خاموشی کے ساتھ اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے جائیں تو وہ گھبرا کر رونے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اب اگر ہم یکایک نقلی چہرہ اُتار لیں تو ہماری اصلی مانوس شکل پر نظر پڑتے ہی اس کا سارا خوف و ہراس دور ہو جائے گا اور وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگے گا۔ لیکن فرض کرو کہ پہلے مصنوعی چہرہ کے نیچے دوسرا ڈراؤنا چہرہ پوشیدہ ہے۔ پہلا چہرہ ہٹانے پر ایک خوفناک صورت بچہ کے پیش نظر ہوگی جس کو دیکھتے ہی اس کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے اور وہ یکایک چیخ اُٹھے گا۔ لاکھ سمجھاؤ کہ یہ سب محض کھیل تھا۔ چہرہ نقلی و مصنوعی ہے لیکن بہت دیر تک وہ اپنے جذبات پر قابو حاصل نہ کر سکیگا۔ اشک و تبسم یا خندہ و گریہ کے ان معمولی واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ صورتِ حالات کی یکایک تبدیلی یا ہماری توقعات کے خلاف واقعات کی رونمائی خوش طبعی کی محرک ہوتی ہے لیکن اگر تبدیلی محض ناگہانی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ خوفناک نتائج وابستہ ہوں تو فاہشت کا جذبہ خوش مذاقی پر غالب آجائے گا اور خندہ کی جگہ گریہ لے لے گا ؛

بچوں کو خوش کرنے اور ہنسانے کا ایک آسان طریقہ اُن کے سامنے تالیاں بجانا ہے۔ لیکن اگر کسی بچہ کی آنکھ کے بالکل نزدیک ہاتھ لے جا کر زور زور سے تالیاں بجاؤ تو وہ خوش ہونے کے بجائے گھبرا کر دایہ کی گود میں منہ چھپا لے گا۔

فرض کرو کہ یہی بچہ ذرا بڑا اور سمجھدار ہونے پر اپنے شفیق باپ کی تلاش میں ایک ایسی جگہ جاتا ہے جہاں اس کو اس سے ملنے کی توقع تھی لیکن سوء اتفاق سے وہاں اُس کی اپنے باپ سے ملاقات نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے شگفتہ چہرے پر پژمردگی چھا جائے گی اور اس کے رخسار زرد پڑ جائیں گے۔ وہ اپنے طفلانہ غم کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے جو رائگاں ثابت ہوتی ہے۔ بالآخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ اب اگر کئی روز کے بعد بچہ کی اپنے شفیق باپ سے یکایک ایسی جگہ ملاقات ہو جائے جہاں اس کے ملنے کا سان وگمان بھی نہ تھا تو وہ فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے گا۔ نتیجہ وہی ہوگا جو پہلے برآمد ہو چکا ہے لیکن بالکل دوسرے بلکہ برعکس حالات کے تحت۔ انتہائی خوشی کی وجہ سے بچہ کے چہرے پر خون دوڑنے لگے گا۔ اس کی زبان ساکت ہو جائے گی۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوگی اور اس کے ننھے قلب پر سے جوشِ محبت اور تعجب و مسرّت کے جذبات کی گرانی کم کرنے کے لئے آنسوؤں کا تانتا بندھ جائے گا۔ دل پر بار خواہ انتہائی غم کے جذبہ کا ہو یا انتہائی خوشی کے جذبہ کا لیکن دونوں حالتوں میں بوجھ ہلکا کرنے کا واحد ذریعہ اشک ریزی ہے۔ مذکورہ بالا واقعات ہمارے نزدیک کیسے ہی خفیف و غیر اہم سہی لیکن بچہ کے لئے وہ غم و خوشی کے انتہائی جذبات کے محرک ہیں۔ اب ایسے واقعات پر غور کرو جو بچوں کے لئے بھی زیادہ سنجیدہ و معنی خیز نہ ہوں۔ فرض کرو کہ وہی بچہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ ڈھونڈنے کے دوران میں کبھی وہ ان کو ایسی جگہ پالیتا ہے جہاں ان کے ملنے کی کوئی امید نہیں ہوتی اور کبھی متوقع مقام پر انہیں نہ پاکر اسے ایک گونہ مایوسی ہوتی ہے لیکن دونوں صورتوں میں بچہ خوش ہوتا اور ہنستا ہے۔ بات یہ ہے کہ ساتھیوں کی تلاش میں بچہ کی کامیابی یا ناکامی کوئی معاملہ نہیں ہے۔ یہ تو محض کھیل ہے اور کھیل ہنسنے ہنسانے کی چیز ہی ہے۔ آنکھ مچولی کے کھیل میں بچے کا دماغ خاموش و پرسکون حالت سے گزر کر کے ہیجان اور سنسنی پیدا کرنے والی حالت کی طرف منتقل نہیں ہوتا بلکہ یہاں تو صرف متوقع اور غیر متوقع امور کے تاثرات کی باہمی تبدیلی کا سوال ہے۔ واضح رہے کہ کسی مقصد کی تکمیل کے لئے دماغ میں خیالات کا ایک سلسلہ قائم ہوتا ہے لیکن اگر اتفاق سے مجوزہ طریقہ کے خلاف وہ مقصد فی الفور حاصل ہو جائے تو خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس نفسی و تخیلی انتشار کے مطابق اعصاب و عضلات کی حرکتوں میں بھی درہمی پیدا ہوگی جس کا نتیجہ ہنسی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ غرض کہ ہمارے جذباتِ نفسی اور مظاہراتِ جسمانی میں گہرے تعلقات پائے جاتے ہیں یعنی جسمانی آثار کا کم یا زیادہ نمایاں ہونا جذبہ کے ضعیف یا قوی ہونے پر منحصر ہے۔ اسی بنا پر جو قصّہ ہمارے لئے ناقابلِ یقین ہوتا ہے اس پر ہم مسکرا لیتے ہیں لیکن جو واقعہ قیاسِ عامہ کے منافی اور بعید از عقل ہوتا ہے اس پر ہم قہقہہ لگاتے ہیں۔

ظرافت میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو خندہ کی محرک ہوسکتی ہیں لیکن ظرافت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں متانت کی ماہیت سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ متانت کا تقاضا ہے کہ واقعات و معاملات میں ایک خاص قسم کی باقاعدگی، تسلسل، نظم اور ترتیب پائی جائے اور نتیجہ منطقی اصول کے مطابق برآمد ہو لیکن اگر ہماری خواہشات اور حقیقی واقعات یا ہماری توقعات اور پیش آنے والے حادثات یا خیر اور شر کے درمیان ایسا شدید اختلاف و تصادم واقع ہو کہ ہمارے قلوب صدمات سے مغلوب ہو جائیں تو یہ متانت بلکہ حزن و ملال کا موقع ہوگا۔ اب تیسری صورت پر غور کرو اور فرض کرو کہ واقعات کی وہ ترتیب جس کی متانت متقاضی ہے اچانک بدل جائے تو ایسی حالت میں ظرافت وجود پذیر ہوتی ہے غرض کہ خیالات کی بے ربطی۔ تاثرات کی یکایک تبدیلی۔ اشیا کی "عجوبگی" اور واقعات کی "بے موقعگی" خندہ کی محرک ہوتی ہے۔

تفنن اور دلچسپی کے لحاظ سے ظرافت کے کئی مدارج ہیں۔ اگر کوئی غیر اہم حادثہ جس کا پہلے سے سان و گمان بھی نہ ہو اچانک پیش آئے یا کوئی معمولی واقعہ ہماری توقعات کے خلاف رونما ہو تو وہ صرف خندہ آور ہوگا۔ اگر واقعہ بے محل، بے ڈھنگا، رسم و رواج کے خلاف اور کسی قدر نامرغوب بھی ہو تو وہ مضحکہ خیز ہوگا۔ لیکن اگر واقعہ ناخوشگوار اور خلاف دستور ہونے کے علاوہ لغو، نامعقول اور عام انسانی فہم و ادراک کے منافی بھی ہو تو وہ تمسخر انگیز ہوگا اور اس کے ڈانڈے ہجو اور استہزا سے ملے ہوں گے۔ الغرض شدت و اہمیت کے لحاظ سے ظرافت کے یہ تین درجے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر نہایت سطحی اور عارضی ہے کیونکہ کسی غیر اہم واقعہ کے اچانک پیش آجانے سے ہمیں جو تعجب اور حیرانی ہوتی ہے اس کے رفع ہو جانے کے بعد کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جو ہماری توجہ اور دلچسپی کو قائم رکھ سکے۔ دوسری قسم کی ظرافت ذرا زیادہ گہری اور دیرپا ہوتی ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ناخوشگوار و نامرغوب عنصر زیادہ تعجب خیز ہوتا ہے اور تخیل پر قدیم رسم و رواج کی گرفت زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ آخر الذکر ظرافت جو انسان کے ارادی افعال کی نامعقولیت اور لغویت پر مبنی ہوتی ہے سب سے زیادہ گہری اور قوی سمجھی جاتی ہے لیکن اس میں ویسی لطافت و نفاست نہیں پائی جاتی جو ثانی الذکر کا طغرائے امتیاز ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی شخص کی ناموزوں حرکات یا کسی بھونڈے واقعہ کا مضحکہ اڑانے میں حقارت و نفرت کا جذبہ شامل رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا کثیف جذبہ سچی مسرت اور لطیف مذاق کے منافی ہے۔ بہر حال یہ امر ذہن نشیں رہے کہ ظرافت کے ان تینوں مدارج یعنی خندہ، مضحکہ اور تمسخر کی تہ میں جس شے کی مشترکہ کارفرمائی پائی جاتی ہے وہ اصولِ تقابل ہے۔ اس اصول پر مبنی شدت سے عمل ہوگا اتنا ہی ظرافت کا اثر دیرپا اور استوار ہوگا۔

اب خندہ ظرافت کے چند مواقع ملاحظہ ہوں جس طرح بچپنے میں ہم نقلی چہرے کے یکایک دور ہونے سے ہنستے ہیں اسی طرح بڑے ہو کر ہم ریاکاری و مکاری کا پردہ فاش ہونے پر خوش ہوتے ہیں۔ ہر حال میں بے ڈول، بے ڈھنگی اور بھونڈی چیزوں کا نظارہ مضحکہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ ایک طویل القامت انسان کے سامنے ایک پستہ قد گویا ایک دیو کے پہلو میں ایک بونے کو یا "آغوشِ رقیب میں کسی بتِ طناز کو" دیکھنے سے اصولِ تقابل کے تحت ہمیں ہنسی آتی ہے۔ تمام غیر متناسب تشبیہات کی خندہ ریزی میں اسی اصول کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ دیہاتی لوگ شہریوں کی وضع قطع پر اور شہر کے باشندے دہقانوں کی چال ڈھال اور بول چال پر ہنستے ہیں۔ اگر کوئی شخص اجنبی لباس یا قدیم وضع یا بالکل جدید فیشن میں نظر آئے تو وہ بھی ہدفِ ظرافت بنتا ہے۔ یہاں محض عجب خندہ کا محرک ہوتا ہے۔ اگر ہم کسی کو پھسل کر یا ٹھوکر کھا کر گرتے دیکھتے ہیں یا کسی کو ایسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا پاتے ہیں جو غیر اہم ہونے کی وجہ سے ہمارے جذبۂ ہمدردی کو متحرک نہیں کرتی تو ہمیں بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ ہیزلٹ کا قول ہے کہ "ہمارے دوستوں اور عزیزوں کی مصیبتوں میں بھی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں ہم خوشی محسوس کرتے ہیں"۔ لڑکے جب کسی ہکلے، متوالے، دیوانے یا حد سے زیادہ موٹے آدمی کو دیکھتے ہیں تو وہ اپنی ہنسی روک نہیں سکتے۔ ریاکاری، حیلہ جوئی، تصنع، ڈینگ، شیخی، شوخی، شرارت وغیرہ بھی مضحکہ خیز امور ہیں۔ جس بات پر ہمیں یقین نہ آئے یا جو واقعہ عقل و استدلال کے خلاف ہو اس پر بھی ہمیں ہنسی آتی ہے۔ بسا اوقات ہم دوسروں کے ایسے معاملات پر ہنس دیتے ہیں جو خود ہمارے لئے اہم اور سنجیدہ ہوتے ہیں وجہ یہ ہے کہ حُبِّ ذات کا جذبہ ہمدردی کے جذبہ سے زیادہ قوی ہوتا ہے ہنسی مذاق کے وقت بالعموم کسی نہ کسی شخص کی دل آزاری ہوتی ہے۔ دنیا میں ایسے ایماندار لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جو اپنی لغویت و مہملیت پر بھی ویسے ہی دل کھول کر ہنسیں جیسے وہ اپنے ہمسائے کی معمولی معمولی غلطیوں پر بغلیں بجاتے ہیں۔ ہم انہیں مصیبتوں اور تکلیفوں پر ہنستے ہیں جن میں ہماری حیثیت شریک و سہیم کی نہیں بلکہ محض تماشائی کی ہوتی ہے۔ کسی آفت زدہ شخص کے لئے جو امور نقصان، مایوسی، پریشانی اور شرم کا موجب ہوتے ہیں انہیں سے غیر متعلق لوگوں کو مذاق، شماتت اور لطف اندوزی کا موقع ملتا ہے۔ غرض کہ ایک شخص کی تذلیل کو دوسرا شخص اپنی کامیابی تصور کرتا ہے کبھی کبھی انسان اپنی بیوقوفی، عیب، تکلیف، خفت، جھینپ اور جذبۂ رشک کو چھپانے کے لئے بھی ہنستا ہے۔ ہماری اصطلاح میں اسے خندہ نہیں بلکہ زہرخندہ کہتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ ہم کسی کو ہنسنے پر مجبور نہیں کر سکتے اور نہ یہ سمجھا سکتے ہیں کہ کب اور کیوں ہنسنا چاہیئے۔ ہنسنے کے موقع پر ہنسی خود بخود آتی ہے۔ وہ ایک قسری فعل ہے ہنسی کے موقع پر ضبط کی کوشش بالکل بے سود

ثابت ہوتی ہے بلکہ دباؤ سے وہ اور زیادہ اُبھرتی ہے۔ جس طرح بہتے پانی کو روک دینے سے اس کی قوت جمع ہونے لگتی ہے اور بالآخر کناروں کو توڑ کر پانی بڑے زور شور سے بہ نکلتا ہے اسی طرح ہنسی کو روکنے سے اس کی قوت مجتمع ہو کر قہقہہ کی صورت میں نمودار ہوتی ہے کسی مضحک خیال کو دور کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جاتی ہے اتنی ہی اس کی یاد اور جلد جلد آتی ہے اور ہمیں ہنسنے پر مجبور کرتی ہے۔ موقع کی سنجیدگی اور خندہ کے محرکات کے درمیان تناسب معکوس پایا جاتا ہے یعنی موقع جتنا سنجیدہ ہوگا اتنی ہی آسانی سے ہنسی آئے گی۔ عام طور پر جن باتوں پر ہمیں معمولی سی ہنسی آتی ہے وہی باتیں سنجیدہ موقعوں پر قہقہہ کی محرک بن جاتی ہیں۔ چنانچہ عدالتی فضا کی متانت و سنجیدگی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوگا کہ عدالتی کارروائیوں کے ضمن میں متخاصمین کی ادنیٰ سے ادنیٰ قولی یا فعلی لغزش متانت شکن ثابت ہوتی ہے اور معمولی معمولی باتوں پر عدالت کا کمرہ قہقہہ کی آواز سے گونج اٹھتا ہے۔

اوپر جو کچھ تفصیلات و جزئیات بیان ہوئیں ان پر اگر غائر نظر ڈالی جائے اور اُن کی علمی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ خندہ کے محرکات دو تین عنوانوں میں محصور کئے جا سکتے ہیں۔ **ہوبس** کا قول ہے کہ "خندہ نتیجہ ہے اُن جسمانی آثار و مظاہر اور عضلاتی حرکات کا جنہیں تفوق و برتری کا جذبہ روبکار لاتا ہے۔ جب انسان اپنی دانست میں کوئی شاندار کام انجام دیتا ہے تو اسے نہ صرف خوشی حاصل ہوتی ہے بلکہ اپنی بڑائی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ پھر جب وہ دوسروں میں کوئی خامی، نقص یا عیب پاتا ہے تو ان سے اپنی حالت کا مقابلہ کر کے قہقہہ کے ذریعے اپنی برتری کا اظہار کرتا ہے۔"

برگساں بھی جس کو تین صدیوں کی فصل زمانی ہوبس سے جدا کرتی ہے اپنی کتاب "فلسفۂ خندہ" میں جذبۂ استکبار کو ہنسی کی لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں علوم و فنون کی ترقی نے خندہ کے مسئلہ پر بہت موشگافیاں کی ہیں اور اس کے متعدد محرکات قرار دیئے ہیں تاہم تمام حکما اس بات پر متفق ہیں کہ ہنسی کا سب سے اہم اور سب سے بڑا سبب اپنی بڑائی کا احساس ہے۔ **بورس سیڈس** (Boris Sidis) نے اپنی کتاب "نفسیات خندہ" میں ہنسی کی نوعیت و ماہیت پر وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ہم دوسروں پر اُس وقت ہنستے ہیں جب ان میں کوئی کمزوری یا نقص پاتے ہیں۔ جو چیز دستور اور معمول کے خلاف ہو اس پر بھی ہنسی آتی ہے۔ پرانے اعتقادات، دقیانوسی خیالات اور جاہلوں کے توہمات و مزعومات بھی خندہ کے محرک ہوتے ہیں۔ ہم دوستوں کو چھیڑنے اور ہمسایوں پر شماتت کرنے سے بھی خوش ہوتے اور ہنستے ہیں۔ آخر ان تمام موقعوں پر ہم کیوں ہنستے ہیں؟ صرف اس لئے کہ اوروں کے مقابلہ میں ہم اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں"۔ **اڈلین** کا بھی یہی خیال ہے کہ خندہ کی بنیاد جذبۂ تفاخر پر قائم ہے۔ جب ایک شخص دوسرے شخص میں کوئی نقص یا خامی پاتا ہے (خواہ یہ نقص فطری ہو یا اکتسابی حقیقی ہو یا

ذہنی، تو وہ خود کو مقابلۃً بڑا تصور کر کے خوش ہوتا اور ہنستا ہے۔ غرض کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اپنے بڑاپے کا احساس خندہ وظرافت کی لازمی شرط ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہر بڑا آدمی ظرافت کا دلدادہ ہوتا ہے، یا جو شخص جتنا زیادہ بڑا ہوگا اتنا ہی زیادہ ہنسے گا بھی۔ لاول کا قول ہے کہ دنیا کے اکابر مثلاً بڑے بڑے مصلحین قوم، محبانِ وطن، پیشوایانِ دین، بزرگانِ ملت باوجود اپنے تفوق و برتری کا علم رکھنے کے بہت کم ہنستے ہیں۔ الم دوست فلسفی اور قنوطی شاعر بھی بڑی حد تک ظرافت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ زاہدوں اور عابدوں کی خشک مزاجی تو ضرب المثل کا حکم رکھتی ہے۔ غرض کہ خندہ کے لئے صرف بڑائی کا احساس کافی نہیں ہے بلکہ انسان میں زندہ دلی وشگفتہ مزاجی کا وافر مادہ بھی پایا جانا چاہیئے۔ کھیل کو ہنسی مذاق سے گہرا تعلق ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہنسنے میں لاعبانہ جبلہ غالب ہو۔ کھیل انسان کا جبلی فعل ہے لیکن بعض لوگ اس جبلہ کو عدمِ استعمال کی وجہ سے کمزور بلکہ مردہ بنا دیتے ہیں اور اس طرح شگفتہ مزاجی و زندہ دلی کے سرچشمہ کو خشک کر دیتے ہیں جسے فی الحقیقت خدا کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت خیال کرنا چاہیئے تھا۔ واضح رہے کہ زندہ دلی وشگفتہ مزاجی ایک قسم کی توانائی (انرجی) ہے۔ اس ذخیرۂ توانائی میں جب جذبۂ تفوق سے تحریک وروانی پیدا ہوتی ہے تو خندہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ لیکن جذبۂ استکبار کی رونمائی کے لئے خارج میں کوئی ایسی شئے موجود ہونی چاہیئے جس میں کسی قسم کی خامی، نقص، لغویت یا بھونڈا پن پایا جائے۔ کیونکہ جب انسان کسی فروتر شئے سے اپنی حالت کا مقابلہ کرتا ہے اسی وقت اس کے دل میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ غرض کہ کوئی بھونڈی چیز جذبۂ تفوق کی تکوین کا باعث ہو سکتی ہے اور جذبۂ تفوق زندہ دلی کی قوت کو متحرک کرتا ہے جس کا نتیجہ خندہ کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ مختصر الفاظ میں خندہ کے لوازم تین ہیں۔ اول کسی خارجی شئے کا بھونڈا پن، دوم اپنی بڑائی کا احساس، سوم زندہ دلی کا وافر ذخیرہ۔ چونکہ ظرافت کے ان اجزائے ثلاثہ کی قدر و قیمت اور اہمیت مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف ہوتی ہے اس لئے ہر شخص ظرافت سے یکساں طور پر لطف اندوز نہیں ہوتا۔ مختلف اشخاص میں استکبار و تفاخر یا تفوق و برتری کا جذبہ مختلف مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ہر شخص کا مذاق اور رجحان جداگانہ ہوتا ہے۔ بعض خیالات کو سب لوگ یکساں دقیانوسی نہیں سمجھتے۔ زندہ دلی وشگفتہ مزاجی کا مادہ بھی کسی میں کم اور کسی میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ ظرافت کے مختلف مدارج ہیں۔ اس میں ہزل اور پھکڑ سے لے کر لطیف مذاق اور نازک خوش طبعی تک ہر درجے اور ہر نوع کا سامانِ تفنن شامل ہے۔ لیکن ظرافت کے انتہائی حدود کے متعلق بھی رایوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر ہر شخص ظرافت سے یکساں طور پر لذت گیر و مسرت اندوز نہیں ہو سکتا۔ جو شخص جس قسم کی ظرافت سے جس حد تک تاثر پذیر ہوتا

ہے اس سے اس کے مزاح و مذاق کی لطافت یا کثافت کا بہ آسانی پتہ چل سکتا ہے۔

خندہ کے اسباب و لوازم کی مذکورہ بالا بحث سے واضح ہے کہ ہنسی کے محرکات دو قسم کے ہیں۔ ایک کا تعلق ایسے حرکات و سکنات یا اعمال و افعال سے ہے جنہیں ہم صرف آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں مثلاً نقال کے اعضا و جوارح کے حرکات یا چشم و آبرو کے اشارے یا کسی بے ڈھنگی اور بھونڈی چیز کا نظارہ یا کسی کا پھسل کر گرنا وغیرہ۔ دوسرے کا تعلق ایسی مضحکہ خیز باتوں سے ہے جو الفاظ کا جامہ پہن سکتی ہیں اور جنہیں ہم کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں ایسے ہی خندہ زا امور کی الفاظ میں ترجمانی کرنے سے ادبی ظرافت وجود پذیر ہوتی ہے کبھی تو ادبی ظرافت صرف چھوٹے چھوٹے لطیفوں، چٹکلوں، نقروں، حاضر جوابیوں اور معقولوں پر مشتمل ہوتی ہے اور کبھی بڑی بڑی داستانیں، افسانے، ناول اور طربیہ ڈرامے زعفران زار یا دیوارِ قہقہہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مغربی ادیبوں نے ظرافت کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک کو انگریزی میں "ہیومر" کہتے ہیں اور دوسری کو "وِٹ"۔ کسی بہتر اصطلاح کی عدم موجودگی میں ہم انہیں علی الترتیب "مزاح" اور "بذلہ سنجی" کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ دونوں میں کیا فرق ہے کسی مضحکہ خیز چیز کو من وعن بیان کر دینا مزاح ہے۔ لیکن کسی دوسری شے کے ساتھ اس کا مقابلہ و موازنہ کر کے مضحکہ خیزی کی صفت کو خاص طور پر نمایاں کرنا بذلہ سنجی کا کام ہے۔ مزاح گویا قدرت اور بخت و اتفاق کی پیداوار ہے۔ برخلاف اس کے بذلہ سنجی صنعت گری اور خیال آرائی کا نتیجہ ہے۔ مزاح میں کسی مضحک واقعے، یا موقع یا کردار کی یا انسان کی کسی فطری یا اکتسابی خامی و کمزوری کی نقل اتاری جاتی ہے لیکن بذلہ سنجی محض محاکات و نقالی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ دو چیزوں کے اچانک تشابہ یا تقابل کے ذریعے سے وہ مضحکہ خیزی کی صفت کو المضاعف کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہم جہاں صرف مسکراتے تھے وہاں اب قہقہہ لگاتے ہیں۔ پہلے ہم جہاں صرف مذاق کرتے تھے وہاں اب نفرت آمیز استہزا کرنے لگتے ہیں۔ مزاح میں انسان کی جن لغو حرکات کا ذکر کیا جاتا ہے وہ قسری و غیر ارادی ہوتی ہیں لیکن بذلہ سنجی میں نقال قصداً لغو و مہمل حرکتیں کرتا ہے۔ اور تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر خود کو بے خبر اور انجان ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ مزاح کی ایک امتیازی خصوصیت اس کی وسعت و ہمہ گیری ہے۔ وہ وسیع رقبہ پر اور بسا اوقات پوری تصنیف میں پھیلی رہتی ہے کسی خاص عبارت یا کسی خاص سطر پر انگلی رکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مزاح یہیں موجود ہے۔ اس کا اثر منبسط اور بالواسطہ ہوتا ہے۔ "فسانۂ آزاد" اور "حاجی بغلول" جیسی ضخیم داستانیں شروع سے اخیر تک مزاحیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مزاح کی یہی خاصیت یعنی اُس کی وسعت و ہمہ گیری ظرافت نگار کو نرمی اور رواداری کا سلوک اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ برعکس اس کے بذلہ سنجی کا دائرہ نہایت تنگ و محدود ہوتا ہے وہ بجلی کی چمک کی طرح عارضی و ناپائدار ہوتی ہے۔ اس کے لئے ایک فقرہ کی

چستی، زبان کی صفائی، حاضر جوابی اور ایک ذہنی چمک کافی ہے۔ چونکہ یہاں تمام ظرافت صرف ایک جملہ یا ایک سطر میں مرکوز ہوتی ہے۔ اس لئے قدرتاً یہ زیادہ تیز اور زیادہ چبھتی ہوئی ہوتی ہے جب کسی بڑے شیشے سے دھوپ گزرتی ہے تو اس میں گرمی اور تیزی کم پائی جاتی ہے لیکن جب آتشی شیشے سے ہو کر شعاعیں ایک نقطۂ ماسکہ پر مجتمع ہوتی ہیں تو جو چیز وہاں لائی جائے اس میں فوراً آگ لگ جاتی ہے۔ لاول کا قول ہے کہ مزاح میں تندِ مکرر کا مزا ملتا ہے جتنی بار پڑھو اس کا لطف بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن بذلہ سنجی سے صرف ایک بار پوری خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے مکرر مطالعہ سے انبساطی کیفیت کم ہوتی جاتی ہے۔

ظریفانہ تصنیفات میں مزاحیہ افسانوں اور طربیہ ڈراموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بذلہ سنجی تو محض وقتی چیز ہے لیکن مزاحیہ کتابوں کے پورے مطالعہ کے دوران میں ایسا لطف و انبساط حاصل ہوتا ہے کہ بغیر ختم کئے ہوئے کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہرحال مزاحیہ تصنیفات میں خوش طبعی اور ظرافت کا ایک اہم ذریعہ غلط فہمی ہے۔ بولنے والے کا مقصد کچھ ہو لیکن سننے والا کچھ اور ہی سمجھ لے تو اس سے طرح طرح کی ظرافت اور مذاق کے موقعے پیدا ہوتے ہیں۔ جامعۂ عثمانیہ میں بی اے کا امتحان ہو رہا تھا۔ ایک لڑکے نے اُٹھ کر کہا کہ دوات میں "سیاہی" نہیں ہے۔ شمالی ہند کے نگرانکار پروفیسر صاحب نے چپراسی کو حکم دیا جلد "روشنائی" لاؤ۔ دکنی چپراسی کے کان روشنائی کے لفظ سے ناآشنا تھے۔ اس نے گلاس میں ٹھنڈا پانی لاکر متعلمِ مذکور کو پیش کیا۔ اس نے کہا حضرت مجھے "روشنائی" نہیں چاہیئے "سیاہی" چاہیئے۔ اس پر سارا امتحان گاہ قہقہہ کی آواز سے گونج اٹھا۔ ایک حکیم صاحب نے اپنے گنوار مریض سے پوچھا کہ اشتہا کے ساتھ کھانا کھایا ہے؟ اس نے جواب دیا حضور اشتہا کے ساتھ تو نہیں البتہ پودینہ کی چٹنی کے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ طربیہ ڈراموں کی اکثر نقلیں اسی قسم کی غلط فہمیوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ اسی ضمن میں وہ مغالطے بھی شامل ہیں جن کے تحت مرد پر عورت کا، عورت پر مرد کا۔ بوڑھے پر جوان کا۔ بونے پر بچے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ایک جوان وردی پہن کر تماشا گاہ میں آتا ہے۔ ایک شخص اسے فوجی افسر سمجھ کر اس کی عزت اور خوشامد کرتا ہے۔ دوسرا شخص اسے رہزن سمجھ کر اس سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ ایک ڈرامے کے مزاحیہ منظر میں ایک شخص انسپکٹر جنرل کے بھیس میں آتا ہے۔ تمام دفاتر کی تنقیح کرتا ہے اور سب سے کچھ نہ کچھ رشوت لے کر چمپت ہو جاتا ہے۔ اگر نقالی کے وقت ہدفِ ظرافت کوئی سادہ لوح شخص ہو جسے کچھ پتا نہ چلے کہ لوگ اس پر کیوں ہنس رہے ہیں اور وہ مجمع میں بھوچکا بنا کھڑا رہے تو اس سے استہزا کی قوت اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ظرافت کی انتہائی صورت یہ ہے کہ ظریف قصداً کوئی مضحکہ خیز کلام یا لغو حرکت کر کے ایسا انجان اور سنجیدہ بن جائے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کا ارادہ ظرافت کا نہ تھا بلکہ اس کی حرکت یا کلام میں ظریفانہ عنصر کا پتا لگانے والے خود ناظرین ہیں۔ بہرحال

غلط فہمی و مغالطہ خواہ قدرتی ہو یا مصنوعی، حقیقی ہو یا نقلی، اس کی تہ میں اصولِ تقابل و ابہام ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ظرافت کا ایک ذریعہ کذب و افترا بھی ہے۔ خود کوئی مضحکہ خیز کام کر کے لوگوں کو مغالطہ دینے کے لئے اسے کسی اور سادہ آدمی کے سر تھوپ دینے سے بھی ہنسی کا موقع پیدا ہوتا ہے۔

اگرچہ کرداری مزاح اور واقعاتی مزاح جداگانہ چیزیں ہیں لیکن دونوں کے یکجا ہونے سے ظرافت میں قوت و تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک گنوار آدمی کی بولی بذاتِ خود خندہ آور ہوتی ہے لیکن اگر موقع ایسا پیدا ہو جائے کہ دہقان کو کسی اہلِ زبان سے گفتگو کرنی پڑے تو اس کی بولی کا نقص اور بھونڈا پن زیادہ نمایاں ہو جائے گا۔ اور سننے والوں کو پہلے سے زیادہ ہنسی آئے گی۔ علاوہ بریں کرداری مزاح میں طنز کا اضافہ ہوئے ظرافت کو دوآتشہ بنا دیتا ہے۔ لیکن مزاحیہ افسانوں اور ڈراموں میں ظرافت کی سب سے زبردست محرک وہ شے ہے جسے اصطلاحاً "ظریفانہ کردار کا تسلسل" کہتے ہیں۔ تسلسل کا اقتضا یہ ہے کہ ظریف کے تمام حرکات و سکنات اور اقوال و افعال مزاحیہ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ اور تمام واقعات اور مواقع بھی لغو، ناممکن الوقوع اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہوں۔ بایں ہمہ ان میں ربط و تسلسل اور ترتیب باقاعدہ پائی جائے۔ بن جانسن کہتا ہے کہ اگر کسی شخص پر کوئی عجیب صفت یا ظریفانہ بے اعتدالی اس قدر مستولی ہو کہ اس کے تمام اعمال و افعال میں، اس کی ہر بات اور بول چال میں۔ اس کی کل مصروفیتوں اور مشغولیتوں میں، اس کی ساری کارگزاریوں اور کارناموں میں، اس کے تمام عیب و ہنر میں اسی صفت کی جھلکیاں نظر آئیں تو اس کا شمار بہترین مزاحیہ کرداروں میں ہونا چاہیئے۔ مغربی ادبیات میں ایسے دُھن کے پکے کردار کی بہترین مثال ڈان کوئگزوٹ ہے اردو میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنی ظرافت آمیز کتاب "خدائی فوجدار" میں کوئگزوٹ کے کردار کو خوب نبھایا ہے۔ جس طرح "خدائی فوجدار" کرداری مزاح کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اسی طرح سرشار کا "فسانۂ آزاد" واقعاتی مزاح کی بہترین مثال ہے۔ اس ضخیم افسانہ میں ظرافت کے ہزاروں واقعات و مواقع بیان ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ آزاد کا مزاحیہ کردار وہ رشتہ ہے جو ان تمام واقعات و مواقع کو باہم منسلک و مربوط رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ سنجیدہ معاملات اور معقول باتوں میں ربط و تسلسل کا پایا جانا کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے لیکن لغویات، مہملات، ناممکنات، توہمات اور مزعومات میں ترتیب و یکسانیت پیدا کرنا اور انہیں کسی خاص اصول کے تحت لانا سخت حیرت کی بات ہے۔ ڈان کوئگزوٹ سے مختلف موقعوں پر جو افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ عقل و استدلال کی نظر میں کیسے ہی لغو، مہمل، بھونڈے اور مضحک کیوں نہ معلوم ہوں لیکن خود اس ہیرو پر جو خبط سوار ہے اور وہ واقعاتِ عالم کو جس نقطہ نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے اس کے مدِ نظر اس بطلِ افسانہ کے تمام حرکات و سکنات بالکل قدرتی، واجبی اور مبنی بر حقیقت معلوم ہوتے ہیں

واقعاتی و کرداری مزاح کے ضمن میں ایک قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ اگر ناگہانی حادثات یا خود آفریدہ حالات کے موقع پر بطلِ قصہ کو خفت، جھینپ، پریشانی اور ناچاری سے دوچار ہونا پڑے تو ظرافت میں شدت اور قوت پیدا ہوجاتی ہے۔ ہیزلٹ نے اس کی تشریح کے لئے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک امیر آدمی سونے کے دستہ کی ایک قیمتی چھڑی ہاتھ میں لے کر ہر روز باغِ عامہ میں سیر کو جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہاں ایک لنگڑا فقیر اس کے پاس آیا اور دستِ سوال دراز کیا۔ امیر آدمی نے اس پر ترس کھا کر اُسے کچھ پیسے دے دیئے۔ دو تین روز یہی واقعہ پیش آتا رہا یعنی فقیر سوال کرتا اور امیر کچھ پیسے دے دیا کرتا۔ لیکن امیر آدمی کی رحمدلی اور سخاوت نے لنگڑے بھکاری کو گستاخ اور حریص بنا دیا۔ اب وہ دولتمند کو تنگ کرنے لگا اور زیادہ پیسے مانگنے شروع کئے۔ ایک روز جب فقیر حسبِ عادت امیر آدمی سے حجت و اصرار کر رہا تھا اس وقت وہاں ایک شریف صورت و سفید پوش آدمی اتفاقاً آگیا۔ صورتِ حال دیکھ کر اس نے دولتمند سے کہا کہ جناب ذرا اپنی چھڑی تو دیجئے۔ میں اس کمینے بھکاری کو اس کی گستاخی کا مزا چکھاتا ہوں۔ امیر کے ہاتھ سے چھڑی لے کر وہ فقیر پر جھپٹا۔ فقیر جو آج تک لنگڑے کا سوانگ بھرے ہوئے تھا بے تحاشا ایک طرف بھاگا۔ فقیر بھاگتا جاتا تھا اور سفید پوش چھڑی گھماتا ہُوا اس کا تعاقب کر رہا تھا بالآخر دونوں دغا باز نظروں سے غائب ہوگئے اور امیر آدمی اپنی بیش قیمت چھڑی کے گم ہوجانے پر خفت کی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

اوپر ظرافت کی جتنی مثالیں بیان کی گئی ہیں وہ زیادہ تر اصولِ تقابل پر مبنی ہیں۔ عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ظرافت کے لئے دو یا زیادہ خیالات و اشیا کا تقابل و تشابہ لازمی امر ہے اس لئے جن اعاظم رجال کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد یا خیال ہو وہ ظرافت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ یہ واحد مقصد جتنا اعلیٰ ہوگا اتنا ہی اسے خندہ و ظرافت سے بُعد ہوگا۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے مصلحین و بزرگانِ دین کو ظرافت و بذلہ سنجی بالطبع نامرغوب ہوتی ہے لیکن لاول کا خیال ہے کہ وحدتِ مقصد ہر حال میں ظرافت کے منافی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کو ایک ہی بات کی دُھن ہو لیکن وہ بات نہایت ادنیٰ اور خفیف ہو یا کسی کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد ہو لیکن وہ اس میں انتہائی غلو و مبالغہ کا اظہار کرے تو ایسی صورت میں نتیجہ نہایت مضحکہ خیز و تمسخر انگیز برآمد ہوتا ہے۔ لاول ایک مذہبی پیشوا کی مثال دیتا ہے جس کا اعتقاد تھا کہ کائناتِ صغریٰ یعنی جسمِ انسانی کی تمام خرابیاں روحانی اسقام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس میں غلو سے کام لے کر وہ کہنے لگا کہ کائناتِ کبریٰ یعنی عالمِ خارجی میں اگر کوئی بدنظمی یا بے ترتیبی رونما ہوتی ہے تو اس کا باعث بھی ہماری ہی اخلاقی برائیاں ہیں اور جب اس کا جوشِ مذہبی جنون کی حد تک پہنچ گیا تو وہ محورِ زمین کے جھکاؤ، مدارِ ارضی کی گردیت، نصف النہار کے انحنا اور آفتاب کے داغ کا ذمہ دار بھی انسان ہی کو قرار دینے لگا۔ اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز مبالغہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

طربیہ ڈراموں میں بھی ظرافت کی اکثر ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں جو اصولِ تقابل یا قانونِ تشابہ سے بے نیاز ہیں۔ یہاں کسی عارضی خوشی یا ادنیٰ مقصد کے حصول کے لیے جس سرگرمی اور جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے وہ حد درجہ مسخر انگیز ہوتا ہے۔ طربیہ ڈراموں میں بھیس بدلنے۔ سوانگ بھرنے۔ طرح طرح کے خطرات کا مقابلہ کرنے، پھر بال بال بچ جانے مشکلات پر غالب آنے، جان جوکھوں میں ڈالنے اور دشوار مہمات سر کرنے کے بیسیوں واقعات پائے جاتے ہیں جو حد درجہ سنسنی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں غلط کاریوں اور کوتاہیوں، امیدوں اور کامیابیوں، حیلہ جوئیوں اور عذر تراشیوں ہتھکنڈوں اور چالبازیوں، چالاکیوں اور ابلہ فریبیوں، جوڑ توڑ اور سازباز، طنز و تعریض اور تملق و چاپلوسی کے دلفریب نظارے سونے پر سہاگے کا کام دیتے ہیں۔ پھر عاشق کی بیتابیاں اور نیازمندیاں، فریب خوردگیاں اور زود اعتقادیاں معشوق کا غرور و تمکنت، بے التفاتی و بے پروائی، صبر آزمائی و ستم رانی، مشاطہ کی مکاری و چرب زبانی، زرطلبی و سبیل بندی، مصاحبوں کی خوشامد و بے حیائی، دروغ بافی و فتنہ انگیزی وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو قصہ کی دلچسپی اور لطف میں چار چاند لگا دیتی ہیں۔ لیکن ان تمام بلند بانگ و پُرشور باتوں کی تہ میں ایک نہایت معمولی اور حقیر مقصد کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ وہ مقصد کیا ہے؟ کسی ادنیٰ درجہ کی عورت کو ہتھے چڑھانا جہاں وہ قبضہ میں آئی کہ تماشے کا آخری پردہ گرا اور لوگ جوق درجوق ہنستے بولتے تماشاگاہ سے باہر نکلے۔

(باقی) **محمد حسین ادیب**

مہاتما گاندھی کے اقوال

"سچائی کی راہ دلیروں کی راہ ہے۔ یہاں بزدلوں کا گذر نہیں"۔

"تشدد آمیز تقریر اتنی ہی ضرر رساں ہوتی ہے جتنا تشدد آمیز عمل۔ ایک منصفانہ تحریک کو کوئی ایک جلد باز لفظ یا عمل کیوں خراب کر دے؟"

"استبداد سے مجھے نفرت ہے۔ میں جس طرح اپنی آزادی کا خواہاں ہوں اسی طرح دوسروں کی آزادی کا حامی ہوں میں کسی شخص کو کچھ بھی منانا نہیں چاہتا اگر میں عقل کی رو سے اُسے نہ منا سکوں"۔

"تسلی سعی میں مضمر ہے نہ کہ تحصیل میں۔ مکمل سعی مکمل فتح ہے"۔

تصویر

افرادِ قصہ :- ایک بھائی اور بہن

ایک کمرہ ہے جس میں ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک پلنگ ہے جس پر اجلا بچھونا ہو رہا ہے۔ پاس ایک تپائی رکھی ہے جس پر کچھ کتابیں پڑی ہیں۔ دیواروں پر مغربی مصوری کے عریاں نمونے آویزاں ہیں۔ ایک طرف گراموفون ہے۔ اور دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں لگی ہیں۔ ایک جوان لڑکا آرام کرسی پر لیٹا ہوا پڑھ رہا ہے۔ لڑکی داخل ہوتی ہے)

لڑکی :- بھائی جان، امی جان بلاتی ہیں۔

لڑکا :- کیا کہتی ہیں؟

لڑکی :- مجھے تو معلوم نہیں نیچے چلے چلیئے۔

لڑکا :- تو خواہ مخواہ کیوں چلی آئی ہو۔ ذرا پوچھ تو آؤ۔ میں بہت مصروف ہوں۔

لڑکی۔ امی جان خفا ہوں گی آپ چلیں تو سہی۔ کیا حرج ہے؟

لڑکا۔ حرج کیا ہے! میں کہتا ہوں حرج نہیں تو اور کیا ہے؟ کسی وقت پڑھنے بھی دو گی یا نہیں۔ ابھی ابھی تو آیا ہوں اور اب پھر بلاوا آ گیا۔

لڑکی۔ مگر بھائی جان آپ کو آئے ہوئے تین گھنٹے تو ہو گئے۔ ایک منٹ کے لئے ہو آیئے ذرا ضروری کام ہے۔

لڑکا۔ ابھی کہتی تھیں مجھے معلوم نہیں، اب کہتی ہو ضروری کام ہے۔ یہ جھوٹ کب سے بولنا شروع کیا ہے۔

لڑکی۔ (جھنجھلا کر) تو آخر مجھے کیا؟ آپ کو بلاتی ہیں مجھے تو نہیں بلاتیں۔ میں کہے دیتی ہوں نہیں آتے۔

لڑکا۔ اور کیا کرو گی، لگائی بجھائی تو ہو نا۔ بتانا ہی قسم ہے، آخر بتا ہی کیوں نہیں دیتیں۔ گناہ ہے؟

لڑکی۔ گناہ کیوں ہونے لگا! آپ کی بات ہے۔ نیچے چلے چلتے خود سن لیتے۔ میں کیا بتاؤں، یہی آپ کے رشتے کے متعلق ہے۔

لڑکا۔ کیا؟ رشتے کے متعلق! کیوں؟ میرے رشتے کے متعلق کیوں ہونے لگا کیسی لغو باتیں کرتی ہو۔ میں نہیں جاتا، جاؤ کہہ دو۔

لڑکی۔ تو آپ مجھ سے کیوں جھگڑتے ہیں، امی جان سے پوچھ لیجئے اور آپ رشتہ کے نام سے گھبراتے کیوں ہیں جیسے کوئی بُری بات ہو۔ پھر رشتہ بھی بُرا نہیں۔

لڑکا۔ رشتہ! رشتہ!! رشتہ!!! کیوں؟ میں نے کسی کی منت کی ہے اور کسی کے پاؤں پڑا ہوں کہ خدا کے واسطے شادی کردو، ورنہ مرجاؤں گا، امی جان سے خدا بچائے، ہر وقت کوئی نہ کوئی انوکھی بات ہی انہیں سوجھتی رہتی ہے۔ بھلا مجھے رشتہ کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کبھی ذکر بھی کیا؟ اور اب یہ نیا شگوفہ کھلا۔ دیکھو سلمیٰ جا کے کردو مجھے بالکل اس چیز کی فی الحال ضرورت نہیں اور مجھے اس وقت معذور رکھیں۔

لڑکی۔ مگر بھائی جان آپ امی جان کی تو سن لیجئے۔ وہ خفا ہونگی اور کچھ نہیں تو دل ہی دل میں کڑھیں گی۔

لڑکا۔ انہیں تو کڑھنے کی عادت ہے، میں کیا کروں؟

لڑکی۔ واہ بھائی جان آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ایک ذری سی بات ہے، ذری ان کے پاس ہو آؤ۔ رشتہ بہت ہی اچھا ہے۔ خدا کی قسم لڑکی بہت خوبصورت ہے۔

لڑکا۔ چھوڑو میں جانتا ہوں تمہاری پسند کو۔ خوبصورت ہے! خاک ہے! جب مجھے ضرورت ہی نہیں تو مجھے خوبصورت بدصورت سے سروکار ہی کیا؟

لڑکی۔ پھر میں کہوں گی تو آپ لڑیں گے۔ ضرورت کیوں نہیں، شادی کے روز تذکرے ہوتے ہیں، میں ایسی کروں گا، ویسی کروں گا، چاند کا ٹکڑا ہو گی، شعر ہو گی! نغمہ ہو گی! کیوں آپ منہ کھلواتے ہیں، آپ تو کہتے ہیں اتنی پڑھی لکھی ہو، ذوق رکھتی ہو، مذاقِ سلیم رکھتی ہو، یہ ہو، وہ ہو، اور اب امی جان نے شادی کا ذکر کیا تو چراغ پا ہو گئے مجھے کیا، میں جاتی ہوں (جانے لگتی ہے)

لڑکا۔ (کچھ دب کر) جاؤ میری بلا سے کتنی زبان دراز ہے! میں امی جان سے کہتا ہوں۔ توبہ!

لڑکی۔ (ٹھیر کر) جی! میں زبان دراز ہوں! یہ زبان درازی ہوئی نا۔ روز تو شادی کا ذکر ہوتا تھا۔ اب امی جان نے گفت و شنید شروع کی ہے تو بس کانوں پر ہاتھ دھر لئے۔

لڑکا۔ کیا گفت و شنید اور کونسا رشتہ، باؤلی ہوئی ہو، میں تو بھئی تم ماں بیٹیوں سے تنگ آگیا ہوں۔ خدا کی قسم امی جان سا بھی جلد باز کوئی نہ ہوگا۔ لیجئے میں نے کبھی سنا بھی نہیں اور اب پانچ منٹ میں نامہ و پیام بھی ہو گیا! کیوں نہیں، کل منگنی کر دو پرسوں بیاہ میں بھی کوئی ننھا ہوں نا! مجھے شادی کی ضرورت ہو یا نہ ہو اس سے غرض ہی نہیں، میں اس طرح شادی کرنا پسند ہی نہیں کرتا۔ واہ! مجھے علم ہی نہیں اور جناب سلسلہ جنبانی شروع ہے۔ میں بھی کوئی

تم ہوں ناکہ گٹھڑی باندھی اور اٹھا کے حوالے کر دی۔

لڑکی۔ جی! یہ بھی میرا قصور ہے نا۔

لڑکا۔ مجھے کیا خبر، امی جان سے پوچھ لو۔ میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ لڑکا چھوڑ لڑکی سے صلاح مشورہ کر کے بلکہ اگر ممکن ہو تو لڑکے لڑکی کی ایک آدھ ملاقات کے بعد طے کرنا چاہیئے اور اب تمہیں چھوڑ امی جان مجھی پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی ہیں۔

لڑکی۔ قسم خدا کی اگر امی جان سنیں تو انہیں سخت صدمہ پہنچے۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔

لڑکا۔ کیوں میں جھوٹا ہوں! مجھے تو پوچھا تک نہیں اور یہ سلسلہ شروع کر دیا۔ جاؤ مجھے بھی ضد ہے میں یہاں تو ہرگز نہیں کرونگا میں مر نہیں جاؤں گا۔

لڑکی۔ بھائی جان! ابھی تو امی جان کو جلد باز کہہ رہے تھے اور اب آپ کیا کر رہے ہیں۔ ابھی ہوا ہی کیا ہے کہ آپ کو اطلاع دیتے۔ کیا اقرار ہو گیا؟ نکاح نامہ لکھا جانے لگا؟ کیا ہُوا؟ آپ امی کی بات تو سُن لیتے۔ شاید آپ کے مشورے کو کہہ رہی ہوں اور جہاں تک مجھے خبر ہے آپ کو اطلاع دینا تھی کہ یہ لڑکی ہے۔ یہ خصائل ہیں، یہ ناک نقشہ ہے، اس بات سے ہے، شاید بی اے میں پڑھتی ہے ......

لڑکا۔ کیا! بی اے میں! کہاں؟

لڑکی۔ کیوں آپ کو تو ضرورت ہی نہیں آپ کیوں پوچھیں؟

لڑکا۔ تو پوچھنا بھی گناہ ہے! نہ بتاؤ لے جاؤ سوغات کو ......

لڑکی۔ ...... اٹھارہ سال کی عمر ہے، اچھا موزوں قد ہے، موتیا کا سا رنگ ہے ......

لڑکا۔ کون ہے یہ لڑکی؟

لڑکی۔ کوئی نہیں یونہی ایک لڑکی ہے، لڑکیوں کے لاہور کالج میں پڑھتی ہے، ایف اے میں وظیفہ لیا تھا، باپ انجنیئر ہے، راوی روڈ پر بہت بڑی کوٹھی ہے ......

لڑکا۔ اوہو مجھے معلوم ہو گیا۔ وہی نا جس کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی ہے، ذرا آنکھوں سے بھینگی ہے، بال بھی سر پر قدرے کم ہیں، رنگ دھوئیں دار ہے ......

لڑکی۔ جی کیوں نہ ہو، بالکل وہی! آپ سے ملاقات ہو گی؟

لڑکا۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا ہے، دو سامنے کے دانت بھی ٹوٹے ہوئے ہیں، بہت شوخ رنگ کے

کپڑے پہنتی ہے۔

لڑکی۔ بس کیجئے بس! آپ زہرا کو دیکھ لیں تو آنکھیں چکا چوند ہو جائیں میں نے ایک دفعہ دیکھی تھی آپا سعیدہ کے گھر چائے کی دعوت کے موقع پر آئی ہوئی تھی۔ ان کی ہم جماعت ہے نا۔ سچ کہتی ہوں میرا تو سانس بند ہو گیا تھا۔ جسم کیا ہے چاندی کی لہر ہے اعضا متناسب ہیں کیا بتاؤں۔ وہ تو امی جان ہی آپ کے لئے کوشاں ہیں۔ ورنہ آپ کو تو نہیں ملنی چاہیئے۔

لڑکا۔ نوازش! آپ کی اور امی جان کی یہ کوششیں اور میں ناہنجار اور احسان فراموش!

لڑکی۔ آپ کو تو مذاق کرنا آتا ہے اور جھگڑنا۔ پہلے تو یہ اُودھم مچایا تھا اب کیسے چپ ہیں۔

لڑکا۔ مبہوت ہوں مبہوت! یہ حسن! یہ آب و تاب! بلی وہ اپنے گھر میں کیسے رہتی ہوگی سارا محلہ روشن ہوتا ہوگا۔ میں تو کسی قابل نہیں ہوں یہ کس لئے اتنی کدو کاوش کرتی ہو۔

لڑکی۔ اب رہنے دیجئے۔ میں جانتی ہوں آپ کو! کہاں وہ چیخ پکار۔ اور کہاں یہ چپ چاپ! میں جا کے کہتی ہوں امی جان رہنے دیجئے بھائی جان کو بالکل پسند نہیں۔ وہ ابھی کئی سال تک شادی نہیں کرنا چاہتے۔

لڑکا۔ یہ بھی کہ دینا، وہ کہتا ہے اگر زبردستی ہاتھ پاؤں باندھ کے شادی کر دی تو خودکشی کر لوں گا، راوی میں ڈوب مروں گا اگرچہ مجھے تیرنا آتا ہی ہے۔

لڑکی۔ توبہ کرو بھائی جان توبہ! مذاق بھی آپ کو کرنا ہوتا ہے تو اور قسم کا کیا کیجئے کبھی تو کوئی اچھی بات منہ سے نکالنی چاہیئے۔

لڑکا۔ تم رہنے دو یہ نصیحتیں! اسی بھینگی کی سناؤ! اس کے باپ کو ہوا کیا ہے کہ وہ ہمارے سر پر یوں بلا کی طرح نازل ہوئے ہیں۔

لڑکی۔ جی! اتنی منتیں کرتے ہیں کہ الاماں! نیچے آپ کے نام کا بھی ایک خط پڑا ہے میں نے کھول لیا تھا۔ دو صفحے تو بالکل التجاؤں سے منتوں سے گذارشوں سے پُر ہیں کہ خدا کے لئے میری لڑکی کو عقد میں لے لو، ورنہ وہ بیچاری مر جائے گی میں تباہ ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا۔

لڑکا۔ اچھا اب بک بک نہ کرو، میرا دماغ نہ چاٹو۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔

لڑکی۔ تو امی جان انکار لکھ کے بھیج دیں۔

لڑکا۔ مجھے خبر نہیں جس طرح مرضی ہو کریں۔

لڑکی۔ ہوں!! تو اس کی تصویر بھی واپس بھیج دیں۔ میں کہتی ہوں اب اس کی کیا ضرورت ہے؟

لڑکا۔ کیا! تصویر؟ ذرا دکھاؤ تو سہی۔

لڑکی۔ کچھ نہیں یونہی منہ سے بات نکل گئی تھی، کچھ بھی نہیں۔

لڑکا۔ اب مجھ سے تو یہ فریب نہ کرو۔ تصویر ہے تو دکھا دو۔ جاؤ سچ مچ لے آؤ۔ میری اچھی بہن، تم سے اچھا دنیا جہان میں کوئی نہیں۔

لڑکی۔ بھائی جان آپ سے بڑھ کر بھی کوئی چالاک نہ ہوگا کتنے مسکین بنے ہیں۔

لڑکا۔ تو آخر میں نے کیا کہا ہے۔ ذرا تصویر دکھا دو۔ کس نے بھیجی ہے اس کے والد نے؟ میں کبھی نہیں مان سکتا اگر ایسی ہی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے تو انہیں کیا ضرورت پڑی ہے تصویریں بھیجتے پھریں۔

لڑکی۔ جی! آپ کیا جانیں! بیچاری امی جان اتنی محنت کرتی پھریں اور آپ کو خیال ہی نہیں۔ کہاں امی جان کہاں آپا سعیدہ کا گھر۔ امی جان! اور کسی سے کوئی چیز مانگتیں؟ یہ آپ ہی کی خاطر تھی اور پھر میں نے انہیں مجبور کیا۔ آپا سعیدہ کی والدہ سے امی جان نے بات کی تھی، انہوں نے چوری چوری آپا سعیدہ کے ہینڈ بیگ سے وہ تصویر نکال کر ایک دن کے لئے بھیجی ہے۔ شام کو واپس بھیج دینی ہے۔ میرا خیال ہے آپ پڑھیئے۔ اب تو دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ابھی نوکر کے ہاتھ واپس بھیج دیتی ہوں۔

لڑکا۔ تم تو کہتی تھیں امی جان بلاتی ہیں۔

لڑکی۔ نہیں تو کب؟ انہوں نے تو ذکر تک بھی نہیں کیا۔ کیوں! آپ چلتے ہیں؟ ناحق کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ جانے دیجئے، بیٹھے رہیئے، کتاب پڑھیئے، بڑی دلچسپ ہوگی۔

لڑکا۔ نہیں تو، چلے ہی چلتے ہیں، آخر امی جان کا حکم ہے۔ کیوں مجھے گنہگار بناتی ہو۔

(جاتے ہیں)

فیاض محمود

ہمیں تو گھر میں نہ چین آیا کہ آہ کرتے ادھر سے نکلے

تمہارا آرام کس نے کھویا کہ ہو کے بیتاب گھر سے نکلے

گرمی کے دن

چھوڑ چھوڑ کرنوں کے لُو کے[1] سُورج چکّر کھاوے
اُٹھے بونڈ لا[2] بھوم بھاڑ[3] سے وایو[4] ناچ نچاوے
لہ لہ[5] لُوہ چلے یا اگنی[6] دھن دیپک کی گاوے
برسے آگ اور پرتھوی جیون[7] ہانپ ہانپ رہ جاوے
آئے دن گرمی کے دھرتی پیاس پیاس چلاوے

بھاپ اگن[8] کی مُنہ سے نکلے لُو کا لپٹ دکھاوے
پکُھ پکُھ[9] کے انگ[10] پسیجے دنت[11] پسینہ آوے
تن جھر سے اور بھیجا پگھلے ہیہ[12] ڈول ڈول رہ جاوے
پنکھا پانی! پنکھا پانی! رٹنت رٹنت جیہ جاوے
آئے دن گرمی کے دھرتی پیاس پیاس چلاوے

جھیل ہوئی دلدل اور دلدل سوکھ دھس جاوے
جل پاتال[13] چھپے اس[14] جا کے کوئی تھاہ[15] نہ پاوے

---

۱ شعلے ۲ بونڈلا یعنی بگولا ۳ بھوم بھاڑ یعنی زمین کا تنور یعنی جلتی ہوئی زمین ۴ وایو ہوا یا ہوا کا دیوتا ۵ لہ لہ۔ لوہ کی آواز ۶ اگنی یعنی آگ کی دیوی۔ کہا جاتا ہے کہ دیپک دھن سے آگ لگ جاتی ہے ۷ پرتھوی معنی زمین۔ جیون معنی جان یعنی زمین کی جان۔ ۸ اگن معنی آگ اگن بھاپ سے یہاں سانس مراد ہے ۹ یعنی اُبل اُبل کے ۱۰ انگ معنی ۱۱ دنت معنی دانت ''دانتوں پسینہ آنا'' محاورہ ہے ۱۲ ہیہ یعنی دل ''ڈول ڈول''

(باقی صفحہ ۵۰۲ پر)

ندی کنارے جیبھ[16] نکالے باگھ[17] کھڑا للچاوے
ریت ندی کی چمکے جل[18] بن کیسے پیاس بجھاوے
آئے دن گرمی کے دھرتی پیاس پیاس چلاوے

چیل آکاش[19] میں جل بن بیاکل[20] ادھر ادھر منڈلاوے
کاگ اور گیدھ[21]، مہوک، کبوتر کوئی چین نہ پاوے
پیاسا کتا پانی کارن جیبھ نکالے آوے
ٹک ٹک دیکھے آنکھیاں پھاڑے لمبی[22] پونچھ ہلاوے
آئے دن گرمی کے دھرتی پیاس پیاس چلاوے

تری دیا بن اے جگ داتا کوئی سنتوش[23] نہ پاوے
تو چاہے تو پل کی پل میں سب کی پیاس بجھاوے
چھوڑ دیا کی دھارا جلدی ریل پیل[24] ہو جاوے
تیرا چاکر احمد پوری مل مل دینہہ[25] نہاوے
آئے دن گرمی کے دھرتی پیاس پیاس چلاوے

مقبول حسین

(بقیہ صفحہ ۵۰۱) رہ جائے" یعنی مارے گرمی کے حرکت پر حرف آئے ۱۳ پاتال یعنی زمین کا سب سے نیچے کا حصہ۔ تحت الثریٰ ۱۴ آس عام زبان کا لفظ ہے یعنی امید ۱۵ ایسا ۱۶ جیبھ یعنی زبان ۱۷ باگھ یعنی شیر یا چیتا ۱۸ جل یعنی پانی ۱۹ آکاش یعنی آسمان ۲۰ بیاکل یعنی بے چین ۲۱ گیدھ یعنی ... ۷) اور کاگ یعنی کوا۔ مہوک بھی ایک خوبصورت پرند ہوتا ہے جس کی آواز اُس کے نام یعنی "مہوک" سے ملتی ہے ۲۲ کتا چونکہ ہندوستانی ہے ولایتی نہیں ہے اس لئے لمبی دم رکھتا ہے ۲۳ سنتوش یعنی سکون ۲۴ ریل پیل یعنی کثرت ۲۵ دینہہ یعنی جسم۔

مسولینی اور فاسیت

یہ مضمون مسولینی کے تعمیری تدبر کے چھ مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔
اپنے عظیم الشان پیشرو کی طرح بیسویں صدی کا یہ سیزر بھی بیک وقت ایک فلسفی اور ایک مدبّر ہے۔
مسولینی کے فلسفۂ حکومت کی یہ تصریحات میں نے اس کی منظوری سے شائع کی ہیں۔

(۱) (جارج سلوسٹر ویرک)

"اٹلی کو سانس لینے کے لئے جگہ ملنی چاہیئے۔ ہم جنگ کے خواہاں نہیں ہیں لیکن ہم ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے"
مسولینی نے جو ایک نہایت متین آدمی ہے یہ الفاظ بڑے سکون کے ساتھ ایک فیصلہ کن انداز سے کہے۔
مسولینی کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہے لیکن اُس کی حالت وہی ہے جو نپولین کی تیس برس کی عمر میں تھی۔
نپولین خرابیٔ صحت اور اپنے غیر معمولی طرز بود و ماند کی وجہ سے قبل از وقت بوڑھا ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "اعلیٰ حضرت! ارسٹائڈ بریاں (Aristide Briand) نے مجھ سے کہا تھا کہ جنگ ختم نہیں ہوئی، بلکہ اقتصادی نقطۂ نظر سے ابھی جاری ہے۔ اُن کی رائے میں ابھی ایک ایسی کانفرنس کی ضرورت ہے جو اقتصادی امن کے قیام کی کوشش کرے۔ کیا آپ بریاں کے خیال سے متفق ہیں؟"

مسولینی نے کہا "اقتصادی امن کے لئے وہ کب تک انتظار کرنا چاہتے ہیں۔ اٹلی تو انتظار نہیں کرنا چاہتا وہ اپنے گھر کی تنظیم و ترتیب کانفرنسوں کے بغیر ہی انجام دینا چاہتا ہے۔ اپنے ہی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہونا دوسروں کا سہارا لینے سے بہتر ہے۔

"مجھے کانفرنسوں پر اعتماد نہیں۔ مجھے کام پر اعتماد ہے۔ اٹلی کام میں مصروف ہے میں سمجھتا ہوں کہ اقوام کی نجات اور اس کے ساتھ ہی افراد کی نجات بھی کام پر منحصر ہے"۔

میں نے کہا "انگلستان بھی کام کرنا چاہتا ہے لیکن وہاں کا مزدور اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔"

مسولینی نے جواب دیا "ہمارا مزدوروں کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں اگر ہم دیکھتے ہیں کہ کام کے اوقات میں ایک اور

گھنٹے کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے تو ہم احکام صادر کردیتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کرلیتے ہیں وہ اس لئے تسلیم کرلیتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم سرمائے اور محنت کا کھیل نہیں کھیل رہے ہیں۔ بلکہ ہمیں صرف اپنے ملک کا خیال ہوتا ہے انگلستان نے مقاطعوں کے سلسلے میں کروڑوں روپے نقد ضائع کئے ہیں اور کروڑوں کی تجارت کھوئی ہے۔ ہمارے ہاں سالہاسال سے کوئی مقاطعہ نہیں ہوا۔ فاسیت اس لئے کامیاب ہے کہ یہ سرمائے اور محنت دونوں میں سے کسی کا بھی حربہ نہیں ہے۔ ہم سرمائے اور محنت کو ایک نئی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ ہم اُن کے مشترک مفاد کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے مفاد کو غصب کرکے کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ اس کی کسی ایک کو اجازت دی جاسکتی ہے۔

"ہم مزدوروں کی انجمنوں کی اچھی طرح نگرانی کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ہم سرمایہ داروں کی کارروائیوں پر بھی کچھ کم نکتہ چینی نہیں کرتے۔ اشتراکیوں اور فاسیوں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اشتراکی جماعتوں کی کشمکش کے قائل ہیں اور ہم جماعتوں کے اتحادِ باہمی کے قائل ہیں"۔

میں نے جرأت کرکے ذرا بے باکانہ انداز میں کہا "ہنری باربوس جن سے میری ملاقات پیرس میں ہوئی کہتے تھے کہ فاسیت سرمایہ داری ہی کی ایک جدید اور تبدیل شدہ شکل ہے"۔

سولینی نے اس خیال کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ ہنری باربوس کا نام بھی اُس نے کچھ اس انداز سے لیا کہ اُس سے حقارت ٹپک رہی تھی۔

اُس نے کہا "فاسیت سرمایہ داروں کے سامنے اپنا سر خم نہیں کرتی۔ ہمارے ہاں سرمائے کی طاقت کے خلاف بردست نفرت کے ساتھ بہترین دانش اور بلند ترین حوصلہ بھی شامل ہے۔ کیونکہ وہ شخص جو سرمائے کی طاقت کی تحقیر کرتا ہے اُسے اس شخص سے کہیں بہتر طریق پر استعمال کرسکتا ہے جو سرمائے کی طاقت سے مرعوب ہوجاتا ہے۔ سرمایہ اور محنت دونوں فاسیت کے خادم ہیں آقا نہیں۔ فاسیت خود بھی ملک کی خادم ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے:۔ ملک کو طاقتور ہونا چاہیئے"

میں نے کہا "ہمارا خیال ہے کہ حکومت کا انحصار محکوموں کی رضامندی پر ہے۔ کیا فاسیت کی حکومت کی بنیاد زیادہ تر طاقت پر نہیں ہے؟"

سولینی کے زرد چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں سے شعلے اڑتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ "طاقت! لوگ کہتے ہیں کہ میں طاقت سے حکومت کرتا ہوں لیکن کونسی حکومت ہے جو طاقت کا استعمال نہ کرتی ہو؟

"عدالت کے احکام کی تعمیل اسی لئے کی جاتی ہے کہ جس شخص کے لئے وہ صادر ہوئے وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے تعمیل نہ کی تو اس کو کچل ڈالنے کے لئے جمہور کی طاقت استعمال کی جائے گی۔

"لیکن طاقت کا استعمال عدل کے ساتھ ہونا چاہیئے' اور اس سے ساری قوم کا فائدہ مدِنظر ہونا چاہیئے ضروری ہے کہ اس کا مقصد جمہور کے لئے انصاف ہو خواہ چند افراد سے بے انصافی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

"بر سرِ حکومت شخص کے لئے ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو حقیقی اور یقینی طور پر خوفناک ہوتی ہیں۔ مجھ پر ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں جب میں ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہوں، اُس وقت مجھے یوں معلوم ہوتا ہے گویا میرے کندھوں پر ایک پہاڑ رکھ دیا گیا ہے۔

"میں ان ذمہ داریوں کو نہ اٹھا سکتا اگر میں یہ نہ جانتا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں تمام قوم کے لئے کر رہا ہوں میں اٹلی کا حاکم کسی ایک جماعت کی نوازش سے نہیں بنا بلکہ ساری قوم کی مرضی سے بنا کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ فاسیت اٹلی کو ایک بہترین حکومت پیش کر رہی ہے؟"

پھر گویا اپنے سوال کا آپ ہی جواب دیتے ہوئے اس نے کہا" اٹلی کو بُری حکومت قبول کرنے کی مقدرت ہی نہیں، وہ بہت غریب ہے۔

" وہ ملک جن کے پاس لوہا، تانبا، سونا، تیل اور خام اشیا کثرت سے ہیں اگر اسراف اور بدنظمی کی عیاشی کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، لیکن ایسے ملکوں کو جنہیں کوئلے اور دھاتوں وغیرہ جیسے قدرتی وسائل حاصل نہ ہوں، جن کی اراضی فرسودہ ہو چکی ہوں اور جن کا ملک زلزلوں کے نرغے میں ہو جزرسی اپنا شعار بنانا چاہیئے اور سیاسیات میں ناک کی سیدھ پر چلنا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ ملک بھی آدمیوں کی طرح ہیں۔ اگر وہ امیر ہوں تو اُن کو بہت سی باتیں معاف کر دی جاتی ہیں، لیکن اگر غریب ہوں تو انہیں اپنی لغزشوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

"ایک اطالوی کے لئے صرف تین راہیں ہیں جن سے وہ ابدی عظمت اور جاودانی شہرت حاصل کر سکتا ہے۔ یا تو وہ ایک ایسی نظم لکھے جو ڈینٹے کے شاہکار سے بھی زیادہ بلند پایہ ہو' یا ایک اور براعظم دریافت کرے اور یا اپنے ہم قوموں کو کوئی ایسا طریقہ بتائے جس سے وہ سکسن انگریزوں کے قرضے سے نجات پاسکیں۔

"جب تک ہمیں کوئی ایسا جوہرِ قابل ہاتھ نہیں آتا ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ ہم خالی خولی پارلیمانی بک جھک میں اپنا وقت برباد نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی قومی طاقت کو بیہودہ جھگڑوں میں ضائع کرنے کا مقدور نہیں رکھتے ہمیں اپنی ناکافی پیداوار سے اپنی بڑھتی ہوئی دولت (قوم) کی بقا کا سامان بہم پہنچانا پڑتا ہے۔ باوجود انتہائی

کوششوں کے اٹلی اپنی تمام قوم کو نہیں پال سکتا - اس لئے ہمیں اپنے ذرائع پیداوار وسیع کرنے پڑیں گے ۔

" میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے کسی ہمسائے پر چھاپا ماریں گے ۔نشوونما ایک ارتقائی معاملہ ہے ۔ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے ۔ انگلستان کی طرح صدیوں کے صبر سے ۔میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ ایک مملکت کی توسیع کے لئے جلد بازی کام نہیں دے سکتی ۔انگلستان کو جبرالٹر یوٹرشٹ (Utrecht) کی صلح پر ملا تھا ، مالٹا اُسے واٹرلو کے بعد ملا اور سائپرس ۱۸۷۸ء میں ۔ دو صدیاں ہوئیں جب انگلستان کو اپنی موجودہ مملکت کے وہ مقامات حاصل ہوئے جنہوں نے اُسے اپنے مقبوضات کے ضبط و نظم کا مالک و مختار بنا دیا "۔

" میں نے کہا " بویریا کے ولیعہد روپرٹ نے اپنا خیال مجھ سے یوں ظاہر کیا تھا کہ ایک عظیم تر اٹلی آپ سے آپ معرضِ وجود میں آجائیگا "۔

" مسولینی نے جواب دیا " ضرور ، بشرطیکہ ہمارے پیش نظر یہ انگریزی ضرب المثل رہی کہ خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں ۔" تاریخی منطق " کے مطابق اٹلی بتدریج اور آہستہ آہستہ ترقی کرے گا ۔لیکن ہمیں کبھی اُس کی ضروریات سے قطع نظر نہیں کرنا چاہیئے ۔ہمیں ، جہاں کہیں بھی ممکن ہو سکے نشوونما کی قابلیتوں کو تقویت دینی چاہیئے ایسی نشوونما جو مجھے امید ہے کہ پُر امن ہوگی "۔

میں نے کہا " اکثر جرمنوں کی طرح روپرٹ کو بھی اٹلی اور جرمنی کے مابین جدید غلط فہمیاں پیدا ہونے پر افسوس ہے ۔اُس کا خیال ہے کہ اطالوی جدید جرمنی کو قدیم جرمنی یا آسٹریا ہنگری کے ساتھ خلط ملط کرنے میں غلطی پر ہیں ، اپنے پیشروؤں کی طرح موجودہ جرمنی کو اٹلی کے مرغزاروں کی کوئی خواہش نہیں ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ اٹلی جرمنی کے متعلق غلط اندازہ لگاتا ہے "۔

مسولینی نے ذرا طعن آمیز انداز میں کہا " ممکن ہے کہ اٹلی جرمنی کے متعلق غلط اندازہ لگاتا ہو ، لیکن کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ جرمنی اٹلی کے متعلق غلط اندازہ لگاتا ہو "؟

میں نے کہا " اٹلی اور جرمنی کا واحد اور اہم اختلاف جنوبی ٹائرول میں جرمن اقلیتوں کا سلوک ہے "۔

مسولینی نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا " جرمنی اور اٹلی ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں ۔ برلن اور روم متفق ہو سکتے ہیں ۔لیکن اِنسبرک ؟ انسبرک اٹلی سے نفرت کرتا ہے ۔

اِنسبرک کے لئے مسولینی کی ناپسندیدگی کی وجہ غالباً ٹائرول کے آسٹرویوں کی کوئی بدسلوکی ہے جس سے اُسے اپنے زمانۂ جوانی میں دوچار ہونا پڑا ۔ انسبرک ٹائرول کا دارالحکومت ہے ۔

اس علم کے ساتھ کہ میں ایک دکھتے ہوئے زخم پر انگلی رکھ رہا ہوں میں نے کہا "میں بھی انسبرک گیا ہوں۔ انسبرک کو قدرتی طور پر اپنے قبیلہ داروں سے ہمدردی ہے جو اٹلی کے محکوم ہیں۔ بہت سی مثالیں ایسی ہیں کہ بھائی بھائی سے جدا ہوگیا ہے۔ والدین اور بچے جبراً الگ کر دیئے گئے۔ وہ ایک دوسرے کے پاس آ جا بھی نہیں سکتے، کیونکہ پروانہ ہائے راہداری عملی طور پر ناقابلِ حصول ہیں جنوبی ٹائیرول کی آبادی اپنی مادری زبان سے بھی محروم کر دی گئی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جنوبی ٹائیرول کو ایک عظیم تر اٹلی اور ایک عظیم تر جرمنی کے مابین وجہِ نزاع بنانے کی بجائے رشتۂ اتحاد بنایا جائے؟"

"کیوں کر؟" یہ سوال سولینی نے اس طرح کیا جیسے بندوق سے گولی چلے۔

"اس طرح کہ سرکاری مدرسوں میں جرمن اور اطالوی دونوں زبانوں کو لازمی قرار دیا جائے، اور ٹائیرول کے باشندوں کو جرمن زبان سے محروم کئے بغیر اطالوی زبان کی تعلیم دی جائے"۔

سولینی نے گھور کر میری طرف دیکھا۔

پھر اُس نے آہستہ سے اور سوچتے ہوئے جواب دیا "ٹائیرول کے باشندے اطالوی رعایا ہیں۔ اُن کا پہلا فرض اطالوی زبان جاننا ہے۔ جرمن زبان وہ پرائیویٹ سکولوں میں پڑھ سکتے ہیں شاید کچھ عرصے کے بعد سرکاری مدرسوں میں بھی جرمن زبان کو دوبارہ رائج کر دیا جائے لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جب موجودہ بے چینی اور بغاوت فرو ہو جائے"۔

میں نے کہا "اگر جرمنی ایک عظیم تر اٹلی کو تسلیم کرے تو کیا آپ بھی ایک عظیم تر جرمنی کو بشمولیتِ آسٹریا تسلیم کر لیں گے؟ جرمن چانسلر جس سے مجھے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے اِس امر کو ناگزیر خیال کرتا ہے۔ آپ ہی کے الفاظ میں یہ تاریخ کی منطق ہے۔ عجیب بات ہے کہ آسٹریا کو جرمنی سے ملانے کا خیال جرمنی میں عام نہیں ہے۔ لیکن آسٹریا میں، غالباً نوے فیصدی آبادی اس کے متعلق متفق الرائے ہے"۔

دونوں باتوں نے سولینی کو حیران سا کر دیا۔

اُس نے ذرا بھڑک کر کہا "جرمن وفاق میں آسٹریا کی شمولیت ایک ایسا مسئلہ ہے جو اٹلی سے زیادہ جرمنی کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ایسا ہو سکتا ہے، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ملک کی توسیع آہستہ آہستہ ہوا کرتی ہے"۔

میں نے پوچھا "کیا آپ کا خیال ہے کہ آسٹریا تنہا بھی زندہ رہ سکتا ہے؟"

مسولینی نے کہا" اسٹریا کے حالات برابر ترقی کرتے رہے ہیں۔ تاہم بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی رائے ہے کہ ایک صدی کے اندر اندر اکثر چھوٹی ریاستیں مٹ جائیں گی۔ بین الاقوامی سیاسیات میں' اور بین الاقوامی صنعت میں چھٹ بھیّوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ بوجھ بہت بھاری ہے، خطرہ بہت بڑا ہے"۔

"کیا آپ کا خیال ہے کہ دوسری متحدہ طاقتیں ایک عظیم تر اٹلی اور ایک عظیم تر جرمنی کو وجود میں آنے کی اجازت دیں گی؟"

"معاہدۂ ورسیلز کے اعلان کے بعد متحدہ اور حلیف طاقتوں کی پالیسی متبدل، متناقض اور بے ربط رہی ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اس سے بھی بڑھ کر متبدل، متناقض اور بے ربط ہو جائے۔

"میں دوسروں کے متعلق کوئی پیشینگوئی نہیں کر سکتا لیکن اٹلی کو اپنا حق مل کر رہے گا۔ کیونکہ نہ اُسے اپنے کام پر زیادہ غرور رہے نہ جنگ پر قلم طاقتور ہے لیکن ٹائپ رائٹروں کے اس عہد میں، میرا خیال ہے کہ بعض گرہوں کو کاٹنے کے لئے تلوار سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ البتہ جو شخص لڑنا جانتا ہے کبھی نہیں جھگڑتا۔ اٹلی نشوونما چاہتا ہے لیکن وہ امن کا بھی خواہشمند ہے"۔

میں نے پوچھا" کیا فاسیت ہی فاسیت کا منتہا ہے؟"

مسولینی نے کہا" نہیں۔ ایک چیز فاسیت سے بھی عظیم تر ہے۔ وہ روم ہے!"

روم۔ یہ لفظ ہی میرے جسم میں ترم کی آواز کی طرح پھرتا چلا جاتا ہے۔ فاسیت کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس کے پیرو کے معنی ہی اطالوی ہوتے ہیں کسی اچھی حکومت کا ایک ہی صدر مقام ہو سکتا ہے' اور جب وہ صدر مقام روم ہو تو ہم فاسیوں کو اس کی فرمانروائی پر ناز کرنے کا حق ہے۔

"میں نے اکثر روم کے اسرار پر غور کیا ہے۔ اُس کی قدامت کے اسرار پر"

کمرہ اُس پُر اسرار روشنی سے جگمگا اُٹھا جو مسولینی کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔

اس نے کہا" مامسین (Mommsen) وہ بڑا تاریخ دان جرمن جسے تاریخ رومہ میں کوئی بات تعریف کے قابل نظر نہ آسکی کہا کرتا تھا کہ اطالوی رومن تاریخ کے طفیلی ہیں۔

"اس کے باوجود اگر نسل اور خون کی آمیزش کا تجزیہ نہ کیا جائے تو یہ امر یقینی ہے کہ اقوام عالم میں اطالوی قوم ہی وہ قوم ہے جو بجا طور پر رومیوں کی وراثت کی دعوےدار ہو سکتی ہے"۔

یہ ایک جائز بنائے فخر ہے، لیکن ہمیں ہر وقت اسی فخر کا دھیان نہیں رہنا چاہیئے۔ ضروری یہ ہے کہ

ہم اپنے آباؤ اجداد سے منسوب ہونے کے قابل نہیں۔ حسب ونسب ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ نہ ہمیں ہمیشہ اپنے ماضی پر نظر رکھنی چاہیئے۔

"ہم اپنے آپ کو یہ خیال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے کہ چونکہ ایک زمانے میں ہم شاندار تھے اس لئے اب بھی ہم شاندار ہیں۔ نہیں، نہیں۔ ہم شاندار تبھی ہو سکتے ہیں جب ہمارا ماضی ہمارے لئے ایک شاندار تر مستقبل کا زینہ بن جائے۔ ہم اطالوی کہلانے کے مستحق اُسی وقت ہو سکتے ہیں جب ہمارا ماضی بجائے ایک مردہ یاد ہونے کے ایک نئی اور ایک عظیم الشان زندگی کے لئے جوش اور ہیجان کا موجب ثابت ہو۔ تو یہ نئی اور عظیم الشان زندگی ان تمام مسائل کے حل کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً مسئلۂ سکونت، مسئلۂ محنت مسئلۂ نسواں، مسئلۂ اطفال؟

"یہ کہنا بے معنی ہے کہ قدیم ادارات فاسیت کے پیرو نہیں ہو سکتے۔ نہ صرف یہ کہ وہ ہو سکتے ہیں بلکہ انہیں ہونا چاہیئے۔

"فاسیت کے ذریعہ سے روما قیاصرہ کا احیا ہو رہا ہے۔ اس خیال سے میرے سارے جسم میں ایک تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے کہ میں اپنے متعلق سینٹ پال کے یہ الفاظ استعمال کرنے کا حق رکھتا ہوں:۔ "میں ایک رومن شہری ہوں" مسولینی کی سیاہ آنکھیں ایک پُر خیال انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں وہ اپنے دل کے آئینے میں روم کی سات پہاڑیوں کا عکس دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا "روم کی سات پہاڑیاں میرے نزدیک گو نگو تھا کی بلندیوں کو چھوڑ کر دنیا کی تمام بلندیوں سے زیادہ محترم ہیں۔"

---

(۲)

میں نے مسولینی سے پوچھا "کیا آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ دنیا کی تاریکی چھٹ رہی ہے اور جنگِ عظیم جس میں ایک کروڑ آدمی کام آئے بالکل رائگاں نہیں گئی؟"

مسولینی کے ہونٹوں میں ایک خم پیدا ہو گیا۔ اُس کا باقی چہرہ اس طرح بالکل ساکت اور بے حس رہا، گویا وہ سنگِ مرمر کے کسی مجسمے کا چہرہ ہے۔

اس نے کہا "مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے لوگوں کی قسمت میں ایک نہایت پُر آشوب زندگی لکھی ہے، اُن کی عمریں رنج والم میں کٹیں گی۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ اس حقیقت کو مردوں کی طرح قبول کریں"

میں نے کہا "اعلیٰ حضرت یاس کو اپنے دل میں جگہ دے رہے ہیں۔ بریاں ـــ"
مسولینی نے جواب دیا "ہوشمندانہ یاس غیر ہوشمندانہ امید سے بدرجہا بہتر ہے۔"
"پھر اس نے کافی تیز ہو کر کہا "کیا آپ حقیقت میں یہ سمجھتے ہیں کہ جس جنگ نے ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک کے ہولناک زمانے میں اگر ساری دنیا کو نہیں تو کم از کم یورپ کو تباہ و برباد کر ڈالا آخری جنگ ہو گی جس کا ذکر تاریخ میں آئے گا؟ میں آپ کو خوشخبری دیتا ہوں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یہ نفیس اور شاندار لیکن خطرناک عقیدہ نہیں رکھتے کہ دنیا کو آئندہ ہمیشہ اچھے واقعات ہی پیش آئیں گے۔
"جنگ ایک آندھی کی طرح ہے۔ یہ ہم پر یکایک بھی نمودار ہو سکتی ہے۔ میرے قول میں جدت مفقود ہو گی لیکن یہ بے محل نہیں۔"
میں نے کہا "بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے ضرورت سے زیادہ اسلحہ خود ایک وجہ جنگ ہیں۔ اعلیٰ حضرت کو بھی بعض وقت الزام دیا جاتا ہے کہ آپ نے برّی اور ہوائی دونوں حیثیتوں سے اٹلی کی جنگی طاقت کو بڑھایا ہے"
مسولینی نے جواب دیا "جنگی طاقت کے بڑھانے میں کوئی برائی نہیں۔ اس کے برعکس صلح جوئی کے بعض پہلو ایسے ہیں کہ بعض اوقات ان میں سخت برائی نکلتی ہے۔ ایک طرح سے ایک قوم یا ایک فرد کی طرف سے زندہ رہنے کی خواہش کا ہر اظہار جنگ کی تیاری ہے۔
"برقی ریل کا چلانا جنگ کی تیاری ہے کسی ملک کے ذرائع رسل و رسائل کی توسیع جنگ کی تیاری ہے۔ ہر جہاز جو سمندر میں ڈالا جاتا ہے کسی قوم کے سامانِ جنگ میں ایک اضافہ ہے۔ مدارس میں کسی قوم کی تاریخ کا پڑھایا جانا بھی جنگ کی تیاری ہے۔"
"لیکن یہ تمام جنگی تیاریاں ناکافی ہیں اگر کوئی قوم امن کی عیاشی میں پڑ جائے ـــ ایسا امن جو آرام طلبی خود غرضی اور خود پرستی سکھائے، جو قوم کے جسم کو نازک اور دل کو کمزور کر دے اور جو اس کو جسمانی اور دماغی، کسی قسم کی مشقت کے قابل نہ چھوڑے۔ جنگ کی تیاری میں بہت سے اقتصادی، تمدنی اور معاشرتی مفہوم شامل ہیں جنہیں امن پسند، جو جنگ کے متعلق یوں گفتگو کرتے ہیں گویا وہ اس کے بڑے ماہر ہیں اور اس سے بچنے کے سب طریقے جانتے ہیں قابلِ مذمت قرار دیتے ہیں۔ جنگ سے پرہیز کرنا، جب بھی ممکن ہو سکے ایک فرض ہے لیکن اس کے لئے زبردست قابلیت اور زبردست سیرت کی ضرورت ہے۔
"پھر اس قوم کو جو زندہ رہنے کے قابل ہے اپنے وجود کی حفاظت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اس معاملے میں

جوش اور ولولے کی اہمیت اسلحہ سے زیادہ ہے آپ کسی قوم کو اُس وقت تک بے دست وپا نہیں کرسکتے جب تک اس کی مردانگی کو نہ مٹا دیں۔ جنگ نے بعض لوگوں کو اس مغالطے میں ڈال دیا تھا کہ آدمیوں سے زیادہ اہمیت مشینوں کی
"معاشرہ، حکومت اور نظامِ معاشرت وغیرہ کا مقصد مادّی اشیا پیدا کرنا نہیں بلکہ ان کا مقصد اعلیٰ درجے کے مرد اور عورتیں پیدا کرنا ہے۔
"مشینوں میں معیاریت پیدا کی جاسکتی ہے اور پھر ایک ایک نمونے کی بیسیوں مشینیں تیار ہوسکتی ہیں لیکن انسان اس طریق پر تیار نہیں ہوسکتے۔ بعض اوقات کوشش کی جاتی ہے، لیکن ناکام رہتی ہے۔ پھر اس کے لئے وقت بھی درکار ہوتا ہے۔
"ایک مشین سال بھر میں بنائی جاسکتی ہے۔ فریڈرک اعظم نے اندازہ کیا تھا کہ اُسے ایک آدمی کو اپنی فوج کے ادنیٰ درجے کے قابل بنانے میں اٹھارہ سال لگ گئے تھے۔ لیکن ایک صحیح قسم کا آدمی تیار کرنے میں اٹھارہ سال سے بھی زیادہ مدت صرف ہو جاتی ہے۔ اُس دنیا کے حال پر افسوس ہے جو انسان پیدا کرنے کو نکلی لیکن مشینیں پیدا کرکے مطمئن ہوگئی۔"
میں نے پوچھا "لیکن کیا فاسیت زندگی میں ایک مشین کی سی یکسانی پیدا نہیں کرتی؟ کیا یہ انسان سے مشین کی سی فرمانبرداری نہیں کراتی؟"
مسولینی نے مسکرا کر تحمل سے جواب دیا "فاسیت انفرادیت کی مخالف نہیں، وہ صرف حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کی مخالف ہے۔ اس کے برعکس ہم جدت، تنوع اور ذاتی تفاوت کے قائل ہیں۔
"ہم سمجھتے ہیں کہ فرد اُس وقت تک اپنی زندگی اپنے طریق پر گزارنے کا حق رکھتا ہے جب تک اس کا مفاد ملک کے مفاد کے منافی نہ ہو۔"
میں نے پوچھا "کیا کوئی ایسا مسلک تجویز کیا جاسکتا ہے جس میں فاسیت اور شخصی آزادی کا آپس میں ملاپ ہو جائے؟"
"آزادی کے تصور میں مطلقیت نہیں، کیونکہ کسی تصور میں بھی مطلقیت نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے تہذیب اپنی صورت بدلتی ہے آزادی بھی اپنی شکل تبدیل کرتی جاتی ہے۔ امن کے زمانے کی آزادی جنگ کے زمانے میں آزادی نہیں کہلا سکتی ہے لیکن کٹھن وقتوں کی آزادی یہ نہیں ہے"۔
"آزادی بعض اوقات فرد اور مملکت کے درمیان ایک جنگ ہوتی ہے جس میں مملکت چاہتی ہے کہ مرکزیت پیدا کرے اور فرد چاہتا ہے کہ اقتدار کی زنجیر سے آزاد رہے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں دنیا نے عمومیت کا تجربہ کیا۔ بیسویں صدی میں عمومیت اپنی تکمیل کو پہنچ جائیگی۔ اسے معلوم ہو جائیگا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اٹلی نے عمومیت کو فاسیت میں پالیا ہے۔ بیسویں صدی فاسیت کی صدی ہوگی۔
میں نے سوال کیا "مستقبل قریب میں دنیا کے لئے جس عہدِ تاریک کی آپ پیشینگوئی کرتے ہیں کیا فاسیت اُس کو کچھ روشن کر سکے گی؟ کیا یہ عام انسان کے سر سے سختی کو کچھ ٹال سکے گی؟"
مولینی نے جواب دیا "ہاں۔ اور اس کے علاوہ وقت کی سختی کے صرف یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہماری ضروریات کا معیار بلند ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ دنیا کی خوش حالی اتنی ترقی کر جائے کہ اس کی نظیر ساری تاریخ میں بھی نہ ملے لیکن ساتھ ہی معیارِ زیست بھی اتنا ہی بلند ہو جائے کہ اس خوش حالی کو باطل کر کے رکھ دے۔
"معیارِ زیست اس دَور کے آشوب کا نادیدہ باعث قرار دیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ بیسویں صدی میں متاہل زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہو جائے کہ خاوند اور بیوی دونوں محنت کریں۔ شوہر کو کارخانے جانے کے لئے صبح ہی صبح گھر سے نکلنا پڑے اور بیوی کو بھی اسی طرح علی الصباح دفتر جانے کے لئے تیار ہونا پڑے۔
"بعض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ یہ صورتِ حالات زندگی کو بے لطف بنا رہی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اس میں ایک نئی قسم کا لطف ہے۔ ہر زمانے میں لطف کا مفہوم الگ رہا ہے۔ زمانۂ وسطیٰ میں شادی کا لطف گھر پر رہنے میں تھا۔ زمانۂ جدید میں یہ لطف کوئی اور میدان ڈھونڈ رہا ہے۔
"بیسویں صدی میں زندگی ممکن ہے کہ مشکل ہو لیکن یہ رومان سے خالی نہ ہوگی۔"

(باقی)

منصور احمد

اُردو میں۔ جو سب شریک ہونے کے نہیں
اس مُلک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرء القیس بنیں
پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

اللہ رے میں

جن ہے، یا بھوت، یا کوئی دیوتا ہے؟ اکسیر ہے، کیمیا ہے، یا عنقا ہے؟
اک عمر سے سُن رہا ہوں "میں" کی آواز معلوم نہیں ہوا کہ یہ "میں" کیا ہے؟

مست مئے "میں" ہمیشہ رہتا ہوں میں میں، میں، میں ہمیشہ کہتا ہوں میں
کس شان سے "میں" کہتا ہوں، اللہ رے میں سمجھا نہیں "میں" کو آج تک واہ رے میں

میں کون ہوں اور کیا ہے ہستی میری آباد ہے تیرے دم سے بستی میری
تیری ہی صدا ہے مجھ میں "میں" کی آواز میرے ہر سانس میں ہے تو ہی دمساز
اس "میں" کی تمام حول و قوت تو ہے حق یہ ہے کہ اس "میں" کی حقیقت تو ہے

بجتا ہو ستار، اور مضراب نہ ہو؟ پھیلی ہوئی چاندنی ہو، مہتاب نہ ہو؟

ممکن ہی نہیں حباب ہو، آب نہ ہو
ہَیں، ہیں نہیں ہو سکتا نہ ہو تُو جب تک

دی فضل سے اپنے مجھ کو صورت اپنی
کر دی منسوب مجھ سے قوت اپنی
ہیں پیکرِ خاک ہوں، مرا دل تو ہے
میں صورتِ ظِل ہوں، اور ذی ظل تو ہے
تو ہی دل میں ہے، اور دل بھی تو ہے
ایجاں مری! میری آب و گل بھی تو ہے
اللہ اللہ تیرا مظہر ہوں میں
ہر آن ضمیرِ ھُو میں مُضمر ہوں میں

جانِ حرکت ہوں، گرچہ ساکت ہوں میں
ہوں مصدرِ نطق، پھر بھی صامت ہوں میں
واجب کے وجود سے ہوا ہوں موجود
یہ ثابت ہے، کہ عین ثابت ہوں میں

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، ناوان سہی،
سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

سید احمد حسین امجد

کاش! تم اس کو میری آنکھوں سے دیکھ سکتے۔

نازلی کچھ غیر معمولی حسین تو نہیں مگر خوبصورت ضرور کہی جا سکتی ہے۔ اس کے نازک چہرے پر بھولا پن برستا ہے۔ بڑی بڑی جادو بھری سیاہ آنکھیں۔ چھوٹا سا خوبصورت دہانہ جس سے ہر وقت شیریں نغموں کی بارش ہوتی رہتی ہے ...... یہ ہے میری نازلی۔ چھوٹی سی پیاری نازلی۔ خوبصورت سڈول جسم۔ سرخی مائل لمبے لمبے بال، جواب سفید ہو چلے ہیں۔ چہرے پر جھریاں بھی پڑ گئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھوں پر نیلی رگیں اُبھر آئی ہیں۔

لیکن میری نازلی کو میری آنکھوں سے دیکھو!

ایک کامیاب زندگی سے کیا مراد ہے؟ دولت جمع کرنا؟ اگر کامیاب زندگی کے یہی معنی ہیں تو ہماری زندگی کسی طرح بھی کامیاب زندگی نہیں کہی جا سکتی۔ ہم متمول نہیں۔ البتہ آرام و آسائش سے بسر کرتے ہیں لیکن اگر کامیاب زندگی سے مقصد عزت کے ساتھ بسر کرنا اور تین پیارے پیارے چھوٹے بچوں کو ذمہ دار زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دینا ہے تو بیشک ہماری زندگی نہایت کامیاب اور قابلِ فخر زندگی ہے۔

یہ ایک جنگِ عظیم تھی جس کے لئے میں نے خدا کے حضور میں رو رو کر دعائیں مانگیں لیکن نازلی کے کیا جذبات تھے، میں نے کبھی اس سے دریافت نہیں کیا۔ البتہ کبھی اس کے دلیرانہ اور مسرت افزا جذبات میں کوئی تبدیلی بھی نہیں دیکھی۔ حالانکہ ایک زمانہ اس پر بہت سخت گزرا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے وہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی...... دل پر ایک اثر ضرور تھا..... ایک روحانی صدمہ.... لیکن محبت اور خدمت میں اسے ہمیشہ ایک حقیقی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

ہماری شادی نو عمری میں ہو گئی تھی میں اس وقت بائیس سال کا تھا اور نازلی انیس برس کی ہوگی۔ اسی سال نازلی ایک اسکول میں معلمہ مقرر ہوئی تھی۔ ہم دونوں میں گو بے انتہا محبت تھی لیکن وہ شادی کے خلاف تھی۔ اس کی بیوہ ماں نے سخت محنت اور مزدوری کر کے نازلی کو اس جگہ تک پہنچایا تھا۔ چنانچہ اب وہ اس کی خدمت کو اپنی

زندگی کا فرضِ اولین خیال کرتی تھی۔

لیکن محبت اندھی ہوتی ہے گو مجھے اس وقت کے مقابلہ میں اب نازلی سے بہت زیادہ محبت ہے مگر اس وقت ایک دوسرے سے جدا رہنا قیامت تھا۔ جوانی میں ایک جوش ہوتا ہے اور ایک دیوانی امنگ، جوانی کے جذبات کبھی قابو میں آتے ہیں؟ میں نے اسے شادی کرنے پر بہت مجبور کیا۔ ہم دونوں میں بیحد محبت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں آج تک کسی نے ایسی محبت نہ کی ہوگی۔ غرض تعلیمی سال ختم ہونے پر ہماری شادی ہوگئی۔

دار الامن ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ میں نے اس کے قریب کچھ زمین لگان پر لے لی اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا کہ رفتہ رفتہ اس کی قیمت ادا کر کے اپنے نام بیعنامہ کرا لوں گا۔ نازلی کی والدہ بھی میرے کہنے پر ہمارے ساتھ ہی رہنے لگیں۔

محبت میرے لئے بہت بیش بہا چیز تھی۔ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ نازلی اپنے تمام حسن و رعنائی کے ساتھ میری ہے اور ہمیشہ میری رہیگی۔ اس کے نرم نرم بازوؤں کی حرارت میری روح کو گرما دیتی تھی۔ میرے دماغ میں بلند خیالات اس طرح پرواز کرنے لگتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو۔ میں اس کے لئے محنت کروں گا۔ اس سے محبت کروں گا۔ اس کی عزت کروں گا۔ میری دنیائے خیال میں عالیشان محلات جگمگاتے نظر آتے تھے جن میں نازلی ایک تختِ زرنگار پر بیٹھی مجھے محبت بھری آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔

موسمِ گرما محبت اور مسرت کے غیر مرئی بازوؤں پر پرواز کر گیا۔ اب ہماری تمام امیدیں اس چھوٹے سے قطعۂ زمین سے وابستہ تھیں۔ ہمارا کھیت ایک خوشنما پھول کی طرح مسکرائے دیتا تھا۔ اس سے قبل کبھی غلے کا دانہ اتنا بڑا بڑا دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اور نہ ایسی سرسبز و شاداب گھاس دیکھی تھی۔ اس گزرے ہوئے موسمِ گرما کی شیریں یاد اب تک نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہے۔

ستمبر کی ایک سنہری شام کو ہم دونوں اپنے کھیت کے کنارے ایک اونچی منڈیر پر کھڑے تھے۔ شاہ بلوط کا بلند اور شاندار درخت ہمارے سروں پر ایک رنگین شامیانے کی طرح کھڑا تھا۔ قریب ہی خشک میوے کا ڈھیر لگا ہوا تھا جس پر ایک ٹوکری پڑی تھی۔ لہلہاتے ہوئے کھیت سے سنسناہٹ کی آواز آرہی تھی۔ فصل بالکل تیار تھی۔ ہر چیز پر ایک عجیب خمار سا طاری تھا۔

نازلی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "خالد! کیسا سہانا معلوم ہوتا ہے کیا تمہیں اس سے دلچسپی نہیں؟

خالد؟ اس نے ایک ہاتھ سے کھیت کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کی نازک کمر میں حمائل کر دیا۔" نازلی! تم جانتی ہو مجھے اس سے کس قدر تعلق ہے . . . اور تمہیں ؟"

کیسا مسحور کن وقت تھا۔ اس کارواں رواں وقفِ تبسم نظر آتا تھا۔ کچھ دیر کے خوشگوار سکوت کے بعد اس نے کہا ــــ" یہ ایک عجیب جگہ ہے ــــ دلکش ــــ بچوں ــــ کی ــــ پرورش کے لئے"

میرے بازوؤں کو ایک غیرارادی جنبش ہوئی۔ دماغ میں ایک فوری خیال پیدا ہوا۔ اور میں اس کو محبت آمیز لیکن متعجب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

نازلی کی نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک شرگمیں ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے نظریں اٹھائیں اور پھر نیچے کو دیکھنے لگی۔ حیرت و استعجاب کے ساتھ میں اس کے ارغوانی چہرے کو تک رہا تھا۔ وہ گلابی چارخانے کا سایہ پہنے ہوئے تھی جس پر سپید کالر لگا ہوا تھا۔ لمبے لمبے بال شانوں پر بل کھا رہے تھے۔ بوٹا سا قد اور خوبصورت چھریرا جسم۔ اس وقت وہ ایک غیر فانی ہستی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ میرے دل و دماغ میں سرور و انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی" نازلی ــــ کیا ــــ واقعی ــــ!"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں اس کی ان محبت بھری مخمور نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ میرا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ میری نگاہوں میں وہ اس وقت ایک بالاترین ہستی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی انگلیاں آہستہ سے اس کے شانوں پر رکھیں . . . . . نازلی ایک دم میری آغوش میں گر پڑی۔" خالد! خالد! مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہو؟ کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟ اس کی آواز کانپنے لگی۔

میں نے محبت سے اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ میں کس قدر متعجب تھا۔ اس چھوٹے سے نازک جسم میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے، ہمارے خوابِ محبت کی تعبیر، ایک نئی زندگی، ایک مجسمۂ حیات، جو حرکت کریگا، سانس لیگا، ہماری طرح سوچ سکے گا، باتیں کرے گا، ہماری خوشی اور رنج کا ساتھی ہوگا ــــ نازلی اب بھی میرے آغوش میں تھی" کیا تم بھی یہی چاہتے ہو؟ ہاں ۔ضرور ــــ مجھے یقین ہے تم بھی میری طرح ایک بچے کے آرزومند ہو۔

میں نے آہستہ سے کہا" ہاں نازلی میں تمہارا خیال کر رہا تھا"

اس نے ہمت اور استقلال کے ساتھ اپنے سر کو جنبش دی" خالد! ہمارا لڑکا ــــ" اس کی آنکھیں روشن ہوگئیں" تمہاری طرح اس کے بھی گھونگھر والے سنہری بال ہونگے "۔ اس کی نازک انگلیاں میرے بالوں سے کھیل رہی تھیں" جب وہ بڑا ہو جائیگا ہم اس کو کالج بھیجیں گے وہ ایک بڑا بیرسٹر یا ڈاکٹر بنے گا"

شادی کے تین سال بعد نازلی کی والدہ کو نمونیا ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ اس وقت منصور دو سال کا تھا۔ اور ایک دوسری چھوٹی سی سحر کن ہستی عالم وجود کی طرف اپنا راستہ طے کر رہی تھی۔ کچھ ماہ کے بعد ننھی سی جان صبیحہ پیدا ہوئی جو بالکل اپنی ماں کی ہم شکل تھی۔ اب نازلی بچوں میں گھر گئی۔ اس کا تمام وقت انہیں کے لئے وقف ہوگیا۔ صبیحہ تقریباً آٹھ سال کی ہوگی جو خالدہ پیدا ہوئی۔ یہ بھی اپنی ماں کے اوپر گئی۔ ہنس مُکھ۔ کالی کالی بھونرا سی آنکھیں۔ چھوٹا سا خوبصورت دہن۔ ہر وقت اپنے جھولے میں چپکی بیٹی مسکراتی رہتی۔ منصور اس وقت دس سال کا تھا۔ مجھے اس سے بڑی مدد ملتی تھی۔ صبیحہ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

ہم زمین کی آدھی سے زیادہ قیمت ادا کر چکے تھے اور ہمیں آئندہ زمانہ ایک خوبصورت گلاب کی طرح رنگین اور خوشنما نظر آرہا تھا کہ اچانک ہماری اس خوشگوار اور پرسکون زندگی میں آفتوں کا ایک طوفان بپا ہوگیا۔

جولائی کا تپتا ہوا دن تھا۔ آسمان پر طوفان کے آثار نمایاں تھے۔ ہم بدحواس ہوکر کام کر رہے تھے تاکہ تمام غلہ اور گھاس وغیرہ گودام میں بھرلیں۔ منصور گھاس کاٹنے کی مشین چلا رہا تھا۔ اور میں دوسری مشین سے وہ گھاس اکٹھی کرتا جاتا تھا جو سب خشک ہو چکی تھی اور ذرا سی بارش سے بھیگ کر خراب ہوجاتی۔

تانبے کی طرح سرخ پر شور بادل آسمان پر چھاگئے۔ کھیتوں پر ایک وحشت اور پریشانی سی برسنے لگی۔ عجیب وحشت انگیز اور خوفناک سکوت طاری تھا جیسا کہ طوفان سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ ایک دم بجلی چمکی اور ہمارے احاطے کے قریب ایک چھوٹے سے درخت پر جو اس وقت میرے اور منصور کے بالکل بیچ میں تھا گری۔ ہم دونوں گھبرا گئے۔ منصور کی مشین کے گھوڑے خاموشی سے کام کرتے رہے لیکن میرے گھوڑے خوف سے چراغ پا ہوگئے۔ میں گرا۔ مشین میں میرا پاؤں پھنس گیا اور میں گھسٹنے لگا۔ اس کے بعد مجھے خبر نہیں کہ کیا ہوا . . . . مجھے یہ بتایا گیا کہ منصور فوراً کود کر میرے پیچھے بھاگا۔ اس نے گھوڑوں کو روکا اور امداد کے لئے گھر کی طرف دوڑا۔ اس حادثہ کے ایک ہفتے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے سونے کے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ نازلی اور صبیحہ میرے پاس بیٹھی تھیں۔ کچھ منٹ تک میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کے بعد کچھ خیال آیا اور میں نے گھبرا کر سوال کرنے شروع کئے ... "نازلی میں یہاں کتنی دیر سے پڑا ہوں؟"

"پیارے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ بہت جلد اچھے ہوجاؤ گے"۔ نازلی میرے اوپر جھک گئی۔ اس کا چہرہ پریشان نظر آتا تھا۔ رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ میری طبیعت پر بھی کچھ عجیب بے چینی سی تھی۔ نیم غشی کا سا عالم تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ سر میں چمک سی محسوس ہوئی۔ اور میں ایک آہ کے ساتھ پیچھے کو گر گیا۔

"نہیں۔ پیارے"۔ نازلی میرے قریب دوزانو ہوگئی۔ اور اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں "خاموش لیٹے رہو"

تمہارے تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔ اُٹھنے کی کوشش مت کرو"۔ اب مجھے کچھ تشویش ہوئی "میرے کتنی چوٹ آئی ہے"
"ذرا صبر کرو۔ ڈاکٹر ابھی آتا ہوگا"

نازلی میرے پاس سے نہ ہٹی۔ دوسرے کمرے سے بچّی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ اس کو وہیں لے آئی۔ اور میرے قریب جھولے میں لٹا کر جھلاتی رہی۔ مجھے یہ سب یاد ہے۔ مگر خوابِ پریشان کی طرح۔

نازلی ایک عجیب کشمکش کی حالت میں تھی۔ صبیحہ پر کچھ خوف سا چھایا ہوا تھا۔ اور چھوٹی بچی بھوک سے پریشان تھی منصور ایک مرتبہ اندر آیا۔ میرا ہاتھ دبا کر بچوں کی طرح اطمینان اور دلاسا دینے لگا۔ کچھ کام کے متعلق اپنی ماں سے مختصر سی گفتگو کی اور باہر چلا گیا۔

تین ہفتے کے بعد ڈاکٹر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میرا نیچے کا دھڑ بیکار ہو گیا ہے۔ نیز دماغ کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور کھوپری کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے اس نے صحت کے متعلق کوئی اطمینان ظاہر نہ کیا۔ بلکہ مایوس کن الفاظ میں یہ کہا کہ ممکن ہے وقت اور فطرت کچھ اپنا کام کر سکے۔

نازلی نے بڑے صبر و دلیری سے اس مصیبت کا مقابلہ کیا۔ اس نے ایک غیر معمولی ہمت اور جرأت سے کام لیا۔ میں عجیب پریشانی میں مبتلا تھا۔ خاموش لیٹا ہوا اس آفت ناگہانی پر غم کے آنسو بہایا کرتا تھا۔ نازلی گھر کا سارا کام کرتی۔ اور پھر کھیتی کیاری کو بھی دیکھتی منصور بھی حتی المقدور اس کی مدد کرتا۔ دونوں نے بہت حُسن و خوبی کے ساتھ فصل کی نگہداشت کی اور ٹھیک وقت پر تمام کھیت کاٹ کر غلّہ بھر لیا۔

باورچی خانے کی کھڑکی میں سے میں پلنگ پر بیٹھا بیٹھا سب دیکھا کرتا تھا۔ صبیحہ اپنی چھوٹی بہن خالدہ کو کھلایا کرتی تھی منصور ہمیشہ باہر کے کام میں مصروف رہتا اور نازلی بالکل ایک مرد کی طرح گھاس اور غلے وغیرہ کا کل انتظام کرتی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ سخت ہو گئے تھے۔ تمام دن کام کرتے کرتے اس کا بدن تکان سے چور چور ہو جاتا تھا رات کو بچوں کو کھانا خود کھلاتی اور پھر مکان وغیرہ کی صفائی میں لگ جاتی تھی۔

نازلی اور منصور کی محنت اور نگہداشت سے فصل اس مرتبہ بھی بہت اچھی ہوئی۔ زمین کی اس سال کی قسط بھی ادا کر دی گئی اور یہی ایک بڑی چیز تھی۔ بچوں کے لئے گھر۔ اس کی بڑی ضرورت تھی۔ گھر ہونا چاہیئے تھا۔

اس وقت جبکہ ہم آئندہ زمانے کی فلاح و بہبود کے خوابِ شیریں کے نشے میں خوشی اور اطمینان سے بسر کر رہے تھے قسمت کے ظالم اور بے رحم ہاتھوں یہ ایک ناقابلِ بیان مصیبت تھی جو ہم پر ٹوٹ پڑی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایک رشتۂ محبت سے وابستہ تین ننھی ننھی جانوں کی پرورش کر رہے تھے۔ تم شاید ہی میرے جذبات کو سمجھ سکو۔ ہمیشہ

چُست وچالاک اور کام میں مصروف۔ تم کیا سمجھ سکو گے کہ اپاہجوں کی طرح پلنگ پر پڑ جانا میرے لئے کیا معنی رکھتا تھا اور میرے دل پر کیا گزرتی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ میری بیوی اور میرا لڑکا اپنی قوت سے زیادہ بار اٹھا رہے ہیں صبیحہ تک کو اپنے آرام وتکلیف کی کچھ پروا نہیں ہر وقت اپنی چھوٹی بہن کو گود میں کھلایا کرتی تھی۔ کھانا بھی پکاتی ۔گھر کے اور سینکڑوں کام بھی کرتی لیکن میں کسی کی کوئی مدد نہ کرسکتا تھا۔ بلکہ اور ان پر ایک بار تھا۔ کسی لکڑی کے سہارے سے بھی نہ چل سکتا تھا۔ حالانکہ بالکل اچھا تھا۔ مگر ٹانگیں کمبخت جواب دے چکی تھیں۔ بس نا امیدی کے عالم میں پلنگ پر پڑا رہتا تھا۔ ٹانگوں میں جان نہ تھی بالکل مردہ تھیں۔

منصور اور صبیحہ اپنی گھوڑا گاڑی میں قصبہ کے اس اسکول میں جہاں نازلی کبھی معلمہ رہ چکی تھی پڑھنے جایا کرتے تھے۔ خالدہ اب ایک سال کی تھی۔ سارے گھر میں پھدکتی پھرا کرتی تھی۔ اگر اس سے بڑی یا چھوٹی ہوتی تو اس کی اتنی دیکھ بھال کی ضرورت نہ ہوتی۔

کچھ دن کے بعد میرے لئے ایک پہیوں والی کرسی خریدی گئی۔ میں اس کو لڑھکاتا ہوا مکان میں پھرنے لگا۔ جہانتک مجھ سے ممکن ہوتا میں کام کاج میں مدد دیتا۔ میری طرح جو کبھی اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہو وہی میرے جذبات کا اچھی طرح اندازہ کرسکے گا۔

میں نے خدا سے دعائیں مانگیں صحت اور موت۔ دونوں میں سے جو بھی قبول ہوجائے۔ مجھے صرف ایک خیال تھا۔ میں ان لوگوں پر جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں بار ہوکر زندگی گزار رہا ہوں۔ اس سے مرجانا کہیں بہتر ہوگا۔

تمہیں کیا معلوم کہ صحت کے لئے میں نے کتنی کوششیں کیں ہمارا باورچی خانہ پرانے انداز کا ایک لمبا کمرہ تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ میں نے اس کمرے کی چھت میں ایک چرخی لگوائی اور اس میں رسی ڈال کر اپنے لئے ایک جھولا سا تیار کرلیا۔ پہلے اپنی پہیوں کی کرسی پر چل کر میں چرخی کے نیچے آتا اور دونوں ہاتھوں سے رسی پکڑ کر بدن کو اوپر کو سہارا دے کر سیدھا لٹک جاتا۔ اس کے بعد دوسری رسی کی مدد سے سامنے کو آہستہ آہستہ جھونکا لینے کی کوشش کرتا۔ ایک دوسری رسی سے نازلی میری لٹکتی ہوئی بے جان ٹانگوں کو جھٹکے دے کر سیدھا کرتی رہتی۔ مجھے کچھ یقین سا تھا کہ مسلسل ورزش کرنے سے ایک نہ ایک دن میری بے حس ٹانگوں میں خون دوڑنے لگے گا۔

بہار کا خوشگوار موسم تھا۔ ایک دن میں یہ عمل بہت دیر تک جاری رکھنے کے بعد تھک کر اپنی کرسی پر گر گیا۔ اور میرے چہرے پر کچھ نا امیدی سی چھا گئی۔ نازلی آج بھی میری مدد کررہی تھی۔ بچے ابھی اسکول سے واپس نہیں آئے تھے۔ نا امیدی کے آثار شاید میرے چہرے سے عیاں ہوگئے۔ کیونکہ نازلی سسکیاں لیتی ہوئی دیوانہ وار آئی اور دو زانو ہوکر

اس نے اپنا چہرہ میری مردہ ٹانگوں میں چھپا لیا۔ بیچاری زار وقطار رونے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے دل پر قابو نہ رہا میں نے اس کی تسلی وتشفی کی بہت کوشش کی۔ اس کے شانوں کو تھپکا۔ اس کے خوبصورت لمبے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرا سمجھایا لیکن وہ مجبور تھی۔ سسکیوں سے اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا وہ سڈول جسم۔ وہ انتہائی غم میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "خالد! ان بے جان ٹانگوں کو آرام لینے دو۔ مجھ سے یہ دیکھا نہیں جاتا خالد! میں خود سب کام کرلوں گی۔ تمہاری یہ تکلیف نہیں دیکھ سکتی۔ اس ورزش کو چھوڑ دو۔ تم مجھے دیوانہ بنا دوگے"۔ اس نے میری گردن میں باہیں ڈال دیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا تمام بدن کانپ رہا تھا میں اس کو تسکین دینے کی کوشش تو کر رہا تھا مگر میرا دل خود بیٹھا سا جاتا تھا۔ اس کے استقلال اور اس کی ہمت وجرأت کی یہ شکست دیکھی نہ جاتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے جذبات کا طوفان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے کہا۔ "نازلی پیاری۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس سے تمہارے دل کو اتنی تکلیف پہنچتی ہے میں اب اسے چھوڑ دونگا۔ ضرور چھوڑ دونگا ممکن ہے اس سے بہتر کوئی صورت نکل آئے۔ میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔ سارے کام کا بار تمہارے کاندھوں پر دیکھا نہیں جاتا"۔

"آہ۔ کچھ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں کچھ اور سوچ لو۔ خالد! مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا تمہیں اس حال میں دیکھنے سے میرے دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ میں تم سے کوئی مدد نہیں چاہتی۔ خالد! یقین مانو تمہارا آرام سے لیٹے رہنا ہی میرے لئے کافی مدد کا باعث ہے۔ مجھے اور خود کو صدمہ نہ پہنچاؤ تم آرام سے خاموش لیٹے رہو۔ ہم یونہی گزار دیں گے میری صحت اچھی ہے میں کام کرسکتی ہوں منصور بھی اب بڑا ہو گیا ہے تم ورزش چھوڑ دو۔

مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ میری بے جان ٹانگوں کا لڑکھڑانا اس کے نازک دل کو اتنا صدمہ پہنچائے گا۔ مجھے صرف اپنا خیال تھا۔ قسمت نے مجھ پر ظلم کیا کہ مجھے اپاہج کر دیا۔ میں قسمت سے لڑنا چاہتا تھا۔

دو تین ہفتے کے بعد میں نے ایک روز منصور سے تنہائی میں گفتگو کی۔ اب منصور گیارہ سال کا تندرست اور قوی بچہ تھا۔ خوبصورت اور بلند قامت۔ ذہین مگر متین آنکھیں۔ "ابا آپ کو معلوم ہے میں ایک دن بڑا ڈاکٹر بنوں گا۔ میرا دل کہتا ہے آپ تندرست ہو سکتے ہیں۔ آپ بالکل اچھے ہیں۔ سوچتے ہیں، سمجھتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں۔ صرف ٹانگیں کام نہیں دیتیں۔ میں اس کا سبب دریافت کرکے رہونگا"۔ میں نے موقع غنیمت پاکر اس سے کہا "کیا اپنی ماں سے

پوشیدہ تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟

اس نے اپنی چمکدار آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر کہا "میں ضرور آپ کی مدد کروں گا میرے خیال میں آپ اس باورچی خانے والی چرخی پر میری مدد چاہتے ہیں۔ اباجان! اماں کچھ بھی سہی آخر عورت ہیں۔ عورتیں یہ باتیں کہاں برداشت کر سکتی ہیں۔ جب وہ مکان پر نہ ہوں تب ورزش کیا کیجئے۔ اگر کافی عرصے تک یہ جاری رکھی گئی تو میرے خیال میں ضرور فائدہ ہوگا۔

اس کے کچھ دن بعد اسکول کی چھٹیاں ہوگئیں۔ میں اور منصور روزانہ نازلی کو کسی نہ کسی بہانے سے باہر بھیج کر ورزش کرنے لگے۔ منصور کمرے کے دوسرے سرے پر کھڑا ہو جاتا۔ اور جب میں جھونکا لینے کی کوشش کرتا تو وہ میری ٹانگوں کو رسی کی مدد سے سیدھا رکھتا تھا۔ اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا۔ اور کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ لیکن ہم نے ورزش کو برابر جاری رکھا۔

فصل کٹنے کا زمانہ آگیا۔ نازلی نے اپنی قوت سے زیادہ کام کیا۔ اس کو اس قدر تھکا ماندہ اور کمزور دیکھ کر میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ صبح سے شام تک وہ تھک کر چور ہو جاتی لیکن سونے سے پہلے ہمیشہ مجھ سے مسکرا مسکرا کر امید افزا اور دل خوش کن باتیں کیا کرتی تھی۔

منصور کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے روزانہ کھیت سے تھوڑی دیر کے لئے گھر بھاگ آتا تھا اور مجھے ورزش کرا کر پھر واپس چلا جاتا۔ صبیحہ کتنی پیاری اور بھولی تھی۔ جب میں تنہائی میں باورچی خانے کے لمبے کمرے میں آگے پیچھے گھسٹنے کی کوشش کرتا تو صبیحہ میری مردہ ٹانگوں کو سنبھالے رہتی۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ محسوس نہ ہوا۔ میری ٹانگیں مردہ ہو چکی تھیں۔ میں ان میں جان نہ ڈال سکا۔

اسی طرح تین سال اور گزر گئے اور میں نے اپنی نازلی کو کام کے بار سے جھکتے ہوئے دیکھا بچوں کو ان کی بساط سے زیادہ بوجھ اٹھاتے دیکھا۔ سب کچھ دیکھتا تھا۔ مگر کچھ نہ کر سکتا تھا۔ دل و دماغ میں پریشان خیالات آتے تھے۔ میری روح گھبرا گئی تھی۔ میں نے اپنی موت کی دعائیں مانگیں لیکن قبول نہ ہوتی تھیں۔ میں ہر طرح سے اچھا تھا۔ صرف ٹانگیں بیکار تھیں۔ میں نے صحت کی دعا مانگی کہ کسی طرح کسی وقت اور کسی قیمت پر نصیب ہو۔ مجھ سے یہ نہ دیکھا جاتا تھا کہ میں خاموش لیٹا رہوں اور میرے عزیز کام کے بار سے دبتے چلے جائیں۔

نازلی نے اس خوبی سے سب کام سنبھالا کہ زمین کی اقساط برابر ادا ہوتی رہیں۔ غم کے تاریک اور خوفناک بادل میری زندگی پر چھائے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایک ناقابل بیان وحشت مجھ پر قابو پا چکی تھی۔ لیکن نازلی عالی ہمت تھی۔ منصور کے بھولے بھالے چہرے پر ایک نورانی چمک تھی۔ صبیحہ مدد کا فرشتہ بن گئی تھی۔ ایک میں ہی تھا جو بالکل بیکار تھا

غالباً اُس روز سے زیادہ میں کبھی زندگی سے عاجز نہیں آیا میں نے سوچا میرے بعد نازلی آرام سے بسر کر سکے گی۔ قانون کی رو سے اس کے لئے وظیفہ مقرر ہو جائے گا لیکن جب تک میں زندہ ہوں وہ اس سے بھی محروم ہے۔ ہاں اگر میں مرگیا . . . .

میں انہیں خیالات میں الجھا ہوا تھا لیکن امید کی کوئی جھلک نظر نہ آتی تھی صحت کی اب کوئی توقع نہ تھی۔ اگر میں خاموشی سے جان دے دوں تو کیا ہوگا؟ یہ ہم دونوں کے لئے بہتر ہوگا۔ قریب ہی کارنس پر زہر کی ایک چھوٹی شیشی رکھی تھی۔ . . . کچھ بھی دیر نہ لگے گی۔ . . . . ایسی زندگی سے مرجانا ہی بہتر ہے۔ دماغ میں یہی پریشان خیالات ہجوم کئے ہوئے تھے۔ ایک دم نازلی آگئی۔ اس کے چہرہ پر آج سرخی جھلک رہی تھی۔ اس نے جھک کر خالدہ کو اٹھالیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سخت ہاتھ بچی کو جوشِ محبت میں سینے سے لپٹا رہے تھے۔ نازلی کی غزالیں آنکھیں ایک عجیب مسرت آمیز انداز میں میری آنکھوں سے دوچار ہوئیں "خالد ہمارا کام ختم ہو چکا" اس نے ترنم ریز آواز میں کہا۔ تمام گھاس گودام میں بھر دی گئی۔ گیہوں اور جَو دونوں کی بیریں پڑی ہیں۔ خالد! یہ ہماری آخری قسط ہوگی۔ اب یہ جگہ ہماری ہو جائے گی میرا دل خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ فرطِ مسرت سے اس نے ایک رقص آمیز گشت کیا اور گلوریا نے خوشی سے ایک چیخ ماری۔ "میری صبیحہ۔ کیا کھانا تیار ہے؟"

صبیحہ بہت تھک گئی تھی لیکن اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا، اور ایک لمحہ کے بعد نازلی اسے آغوشِ مادری میں لئے پیار کر رہی تھی۔ میں پہیوں والی کرسی پر پڑا تھا۔ نازلی نے گھوم کر میری کمر میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اس کے بازوؤں نے محبت اور مسرت کے جوش میں مجھے پوری قوت سے دبایا۔ سینے میں میرا دل تڑپ اُٹھا۔ ایسی محبت، سچی اور بے لوث محبت! میں نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ میری روح اس پر قربان ہو رہی تھی۔ کیا ایسے وفاشعار دل کو صدمہ پہنچاؤں؟ آخر یہ خیال میرے دل میں پیدا ہی کیوں ہُوا۔ میں زندہ رہوں گا۔ خواہ زندگی کتنی ہی تلخ ہو مجھے اپنے بزدلانہ خیالات پر سخت افسوس ہُوا۔ چنانچہ اپنی حالت پر صابر و شاکر ہو گیا۔ اور یہ تہیہ کر لیا کہ اپنے آخری سانس تک اس سے نجات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ ناکامی سے گھبرا کر کبھی ایسے خیالات کو دل میں نہ آنے دوں گا۔ اب کبھی ہمت نہ ہاروں گا۔ اس نئے جذبہ نے میرے دل سے ایک بار سا کم کر دیا۔ دماغ میں ایک عجیب سکون سا محسوس ہونے لگا۔

بجلی گرنے کے بعد آج پہلی مرتبہ میں نے خدا کے حضور میں صدقِ دل سے رجوع کیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس سے امداد کا طالب ہُوا۔ اس سے قبل بھی میں نے دعائیں مانگی تھیں لیکن دل میں ایک تلخی سی رہتی تھی اور دعائیں ایک

ناشکری اور شکایت کا پہلو ایسی دعائیں ہمیشہ لاحاصل ہوتی ہیں لیکن اب میں نے رو رو کر گڑگڑا گڑگڑا کر حضورِ قلب سے دعا مانگی "اے مشکل کشا میری مشکل کو حل کر دے مجھے ہمت اور توت عطا کر کہ میں تسلیم و رضا کے ساتھ زندگی بسر کروں۔ مجھے اس قابل بنا دے کہ اپنے سچے خیر خواہوں کی کچھ تو مدد کر سکوں ۔

جو مانگنے کا طریقہ ہے اس طرح مانگو ۔۔۔ درِ کریم سے بندے کو کیا نہیں ملتا

شاید اس کی رحمت بھی اسی کی منتظر تھی۔ کہ میں عاجزی اور انکسار کے ساتھ اس کے در پہ حاضر ہوں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو میرا یہی ایمان ہے کہ میں سکونِ قلب سے اس وقت تک کے لئے محروم کیا گیا تھا جب تک کہ میں راضی برضا ہو کر اظہارِ تشکر نہ کروں۔ کیونکہ اس دعا کے بعد جو سکونِ قلبی اور مسرتِ روحانی مجھے نصیب ہوئی اس سے پہلے کبھی تمام عمر نہ ہوئی تھی۔ اب میرے دل کو سکونِ کلی حاصل تھا۔

منصور وقت بیوقت برابر میرے ساتھ چرخی پر کام کرتا رہا۔ اب صبیحہ بھی میری کافی مدد کرنے لگی تھی۔ نازلی کو اس کا علم بھی نہ تھا۔ کہ میں روزانہ گھنٹوں ورزش کرتا رہتا ہوں ایک روز مجھے اپنی ٹانگوں میں ہلکی سی سنساہٹ محسوس ہوئی۔ مگر اس سے دل میں کوئی قوی امید پیدا نہ ہو سکی میں نے کہا "منصور! مجھے اپنی ٹانگوں میں ہلکی سی سنساہٹ محسوس ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف خیال ہو لیکن مجھے ان میں کچھ جان سی محسوس ہوتی ہے" منصور کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس نے جوش سے کہا "واقعی میں اس کے متعلق برابر مطالعہ کر رہا ہوں کتب خانے میں بہت سی کتابیں دیکھ چکا ہوں۔ مگر یہی معلوم ہوا کہ صرف ورزش ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے جان پڑنے کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔ شاید ہم کافی ورزش نہ کرتے ہو نگے"

میں نے محبت بھری نظروں سے اس کے پُر جوش چہرے کی طرف دیکھا۔ منصور اب چودہ سال کا بلند قامت توی نوجوان لڑکا تھا اس کی چمکدار آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی اس نے میری کمر تھپکی اور پُر جوش لہجے میں بولا "ابا جان! اگر آپ کچھ بھی چلنے کے قابل ہو گئے تو اماں کو کس قدر خوشی ہوگی۔ اب تو وہ کچھ بھی کہیں ہم ورزش برابر جاری رکھیں گے۔ میں نے ایک اور ترکیب سوچی ہے۔ آپ کو کل بتاؤں گا" دوسرے دن صبح کو منصور نے ایک حیرت انگیز ترکیب بتائی۔ نازلی نے اس کی سخت مخالفت کی لیکن میں نے بہت پر جوش انداز میں منصور کی تائید کی۔ حتیٰ کہ خود نازلی کے دل میں امید کی ایک کرن نمودار ہوئی اور آخر وہ بھی رضامند ہو گئی۔ صبیحہ پہلے ہی سے ہماری ہم خیال تھی چھوٹی خالدہ کمرے میں اپنی گڑیا اچھالتی پھر رہی تھی۔

اس آفتِ ناگہانی کے آنے سے کچھ عرصہ قبل میں نے بچوں کے لئے ایک چھوٹا سا گھوڑا اور اس کی موزونیت سے ایک گاڑی خرید لی تھی۔ گاڑی کے نیچے کے تختوں میں منصور نے دو بڑے سوراخ کئے۔ گاڑی اتنی اونچی تھی کہ اگر

ان سوراخوں میں دونوں ٹانگیں ڈال کر آدمی کھڑا ہو جاتے تو اس کے پاؤں زمین کو چھو سکتے تھے۔ اور وہ آسانی سے چل سکتا تھا منصور نے کہا "ہم آپ کو اٹھا کر ان سوراخوں میں آپ کی دونوں ٹانگیں لٹکا دیں گے۔ اور اس طرح آپ کھڑے ہو کر جب تک چاہیں گھوڑے کو ہانکتے رہیئے۔ ہم دو ہفتے تک اسکول نہیں جائیں گے۔ اس سے یقیناً بہت فائدہ ہوگا۔"
میں نے منصور کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا۔ نازلی اور منصور نے مجھے اٹھا کر سوراخوں میں کھڑا کر دیا۔ اور میں مکان کے اطراف میں گاڑی ہانکتا رہا۔ میری مردہ ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں۔ جھٹکے کھاتیں۔ اور آپس میں ٹکراتیں۔ . . . . مجھے ان میں سنسناہٹ محسوس ہوتی تھی۔

دو ہفتے کے بعد جب بچوں کا مدرسہ کھل گیا تو میں اسکول کے اوقات کے علاوہ ورزش کر لیتا تھا منصور اپنی ماں کے ساتھ کام کرتا رہتا صبیحہ اور خالدہ میری گاڑی کے ساتھ ساتھ چلا کرتیں۔

جاڑوں بھر یہ عمل جاری رہا۔ برف باری ہو یا مطلع صاف ہو۔ موسم بہار ہو یا خزاں۔ آسمان نیلا اور صاف ہو یا کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوں۔ صبح کا دھندلا نور ہو یا شام کی سنہری کرنیں میرے معمول میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ کیونکہ اب خود مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میری مردہ ٹانگوں میں جان واپس آ رہی ہے۔ جب گاڑی چلتی تھی تو میں ان کو کچھ ہلکی سی جنبش دے سکتا تھا میں اپنی مرضی سے ان کو آگے پیچھے ہلا سکتا تھا۔ گویا گاڑی کے ساتھ قدم اٹھا رہا ہوں۔

منصور بیحد خوش تھا۔ نازلی اور صبیحہ بھی خوش ہو ہو کر پرجوش الفاظ میں ہمت افزائی کرتیں کیونکہ اب خود یہ لوگ بھی فائدہ محسوس کرنے لگے تھے میں خود اپنی حالت بہتر پاتا تھا۔ میری حالت واقعی بہتر تھی۔

موسم گرما کا اخیر تھا میں نے اپنے لئے بیساکھیاں بنوائیں۔ نازلی اور منصور کام کرتے۔ گھاس جمع کرتے غلہ بھرتے۔ غرض ہر چیز کی ایسی دیکھ بھال کرتے جیسی میں خود کر سکتا تھا۔ صبیحہ اور خالدہ میرے ساتھ ساتھ رہتیں۔ پھر گھوڑے کو گھاس دانہ ڈالتیں۔ صبیحہ اب تیرہ سال کی تھی اور خالدہ پانچ برس کی لیکن دونوں اپنے ننھے ننھے نازک ہاتھوں سے بلا کا کام کرتیں۔ خداوند کریم کا میں کس طرح شکریہ ادا کروں۔ اس نے مجھے کیسے نیک، باہمت، اور محبت کرنے والے بیوی بچے دیئے۔

اب میری ٹانگیں مقابلتہً بہتر تھیں۔ گو بہت کمزور تھیں اور بدن کا وزن نہ سہار سکتی تھیں۔ شروع میں بیساکھیاں استعمال کرنے میں بڑی ناامیدی ہوئی۔ جب میں اپنے بدن کو آگے کو جھوک دیتا تو میری ٹانگیں لڑکھڑا جاتیں۔ اور میں نیچے آ رہتا۔ لیکن منصور اور نازلی برابر مجھے سہارا دیتے بالآخر موسم گرما کے آخر تک میری ٹانگوں میں اس قدر قوت آگئی کہ میں بیساکھیوں پر اچھی طرح چلنے لگا۔ میں خوشی سے دیوانہ سا ہو رہا تھا۔ تمام جاڑوں

گھر میں ایک عجیب مسرت رہی۔ ہم سب خوش تھے۔ ہنسنے اور بولنے میں ایک لطف آتا تھا طبیعتوں پر سے وہ گرانی جاتی رہی تھی۔ اور ہمارے چھوٹنے سے گھر میں پھر وہی زندہ دلی اور وہی اگلی سی چہل پہل رہنے لگی جس کو ہم برسوں سے ترس رہے تھے بیں اور میرے ساتھ سب خوش تھے ہم سب میں ایک عجیب یگانگی اور محبت کا ربط تھا عجیب اتحاد اور ہمدردی تھی۔ رفتہ رفتہ ٹانگوں کی قوت بڑھتی گئی۔ موسم بہار آیا اور اب میں صرف ایک بیساکھی کے سہارے دوسرے ہاتھ میں لکڑی لے کر چل سکتا تھا۔ اس فصل کا کام بھی نازلی نے خود ہی کیا۔ اس کے بھورے بھورے لمبے بالوں میں اب سپیدی جھلکنے لگی۔ . . . . خداوند تعالےٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے ایسے وفادار اور محبت کرنے والے متعلقین عطا فرمائے۔ اس کو میرا کتنا خیال تھا ورنہ کیوں ایسی باہمت ایسی صابر اور ایسی دلیر جانیں دیتا۔

ایک سال کے بعد میں صرف لکڑی کی مدد سے چلنے لگا لیکن گاڑی پر برابر ورزش کرتا رہا کیونکہ بمقابلہ پیدل چلنے کے گاڑی میں ٹانگوں کو زیادہ تیز جنبش ہوتی تھی جس سے دورانِ خون بڑھتا تھا۔ اب میں نے رفتہ رفتہ کچھ کام بھی کرنا شروع کر دیا۔ فراموش شدہ منصوبے پھر تازہ ہو گئے۔ اب پھر ہم وہی خوشی اور کامیابی کے خواب دیکھنے لگے۔ مردہ امیدیں موسمِ بہار کے خوشنما پھولوں کی طرح کھل گئیں۔

جوشِ مسرت میں نازلی اکثر مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر خوشی کے آنسو بہاتی "خالد! خالد! اس قادرِ مطلق کو ہر بات پر قدرت حاصل ہے۔ کیا یہ کبھی وہم و گمان میں آسکتا تھا؟ پیارے! میرے پیارے! مجھے تم سے کس قدر محبت ہے"

خدا کے فضل سے اب میں توانا و تندرست ہوں۔ میری ٹانگیں اب ایسی ہی مضبوط ہیں جیسی پہلے تھیں۔ مجھے لکڑی چھوڑے بھی کئی سال گزر گئے ہیں۔ اب میں بالکل اچھا ہوں۔ زراعت اور گھر بار کا کام پھر اسی جوش و خروش سے انجام دیتا ہوں میرے کھیت اس خطہ میں بہترین مانے جاتے ہیں۔

قسمت سے اس جنگ کے اختتام پر جو سکونِ قلبی اور مسرتِ روحانی مجھے حاصل ہوئی اس کا اثر کبھی میرے دل سے فراموش نہیں ہو سکتا۔ خدا نے مجھ پر کتنا فضل کیا۔ کیسے بیوی بچے دیئے۔ جن کی محبت نے مجھے دوزخ کی آگ سے بچایا اور میری زندگی میں پھر ایک دلچسپی پیدا کر دی۔ ایسی رفیقِ زندگی کی پرستش کیا گناہ ہے؟

(ماخوذ از انگریزی) ناظم میرٹھی

عذرِ نگاہ

نگہ نے ہو کے تجھے بے قرار دیکھا ہے تڑپ کے دل نے بصد اضطرار دیکھا ہے

جمالِ عارضِ گلگوں پہ خواب کا وہ اثر نگہ نے بن کے دلِ بے قرار دیکھا ہے

فسونِ حسن پہ کیفِ شباب کا وہ اثر کہ دل نے ہو کے سراپا شرار دیکھا ہے

وہ خوابِ ناز تجھے یاد ہے کہ میری طرح قمر نے ہو کے تجھے دلِ فگار دیکھا ہے

قصور کیا ہے بتا پھر مری نگاہوں کا
جو بے خودی میں تجھے بار بار دیکھا ہے

مری نظر میں ابھی تک ہے رشکِ فردوس وہ باغ جس میں تجھے ایک بار دیکھا ہے

فضا بہار کی رنگینیوں میں ڈوب گئی تجھے جو اے گلِ شیریں عذار دیکھا ہے

گلِ شگفتہ نے تجھ کو نگاہِ حسرت سے بجوئی دل و چشمِ ہزار دیکھا ہے

ترے جمال کو خود تیرے عکس نے لبِ آب لرز کے کیف سے دیوانہ وار دیکھا ہے

قصور کیا ہے بتا پھر مری نگاہوں کا
جو بے خودی میں تجھے بار بار دیکھا ہے

تری نمود میں شاعر کی چشمِ روشن نے شرابِ حسن کا کیف و خمار دیکھا ہے

خطوط و رنگ کی معراج کو مصور نے ترے جمال کا آئینہ دار دیکھا ہے

کوئی مجسمہ مرمریں سمجھ کے تجھے صنم تراش نے بے اختیار دیکھا ہے

جمالِ شاہدِ فطرت نے ہو کے خود مفتوں تیرے جمال کو آئینہ دار دیکھا ہے

قصور کیا ہے بتا پھر مری نگاہوں کا
جو بے خودی میں تجھے بار بار دیکھا ہے

عزیز احمد

اصلاحِ ادب

(۶)

بہ سلسلۂ اشاعتِ مارچ ۱۹۳۳ء

اس مضمون کی دو اقساط ابھی اور چھپیں گی۔ اس کی اشاعت کے دوران میں وقتاً فوقتاً بعض الفاظ کے متعلق ہمیں اختلافی تحریریں موصول ہوتی رہی ہیں لیکن مناسب یہ ہے کہ یہ سلسلہ ختم ہونے کے بعد کوئی صاحب اس پر ایک غیر جانبدارانہ محاکمہ لکھ دیں۔ یہ مضمون مفید ہے لیکن اس میں کہیں کہیں ایسی باتیں ضرور ہیں جن سے جائز اختلاف ہوسکتا ہے اس کے علاوہ زبان کی بعض کہنہ و فرسودہ قیود کی گرفت اگر کسی قدر ڈھیلی ہوجائے تو بہتر ہے "ہمایوں"

نثر

فقرہ ہمارے دفتر میں کلرک کی کوئی آسامی خالی نہیں

اصلاح۔ ہمارے دفتر میں کلرک کی کوئی اسامی خالی نہیں

وجہ۔ "آسامی" ناواقف عوام کا تراشا ہوا لفظ ہے اس کے بجائے "اسامی" لکھنا چاہیئے۔

فقرہ۔ برائے مہربانی کل شام کا کھانا غریب خانے پر تناول فرمایئے۔

اصلاح۔ براہِ مہربانی کل شام کا کھانا غریب خانے پر تناول فرمایئے۔

وجہ۔ "برائے مہربانی" کی ترکیب بے معنی ہے۔

فقرہ۔ بارات میں تیس کے قریب آدمی ہوں گے۔

اصلاح۔ برات میں کوئی تیس آدمی ہوں گے

وجہ (۱) بارات غلط ہے (۲) "تیس کے قریب" سے "کوئی تیس" افصح ہے۔

فقرہ۔ اس معاملے کے متعلق آپ اس سے بالمشافہ گفتگو کریں۔

اصلاح۔ اس معاملے کے متعلق آپ ان سے بالمشافہہ گفتگو کریں۔

وجہ۔ "مشافہ" غلط اور "مشافہہ" بروزن مفاعلہ صحیح ہے

فقرہ۔ جب انسان برسرِ اقتدار آجائے۔ تو اسے مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔

اصلاح۔ جب انسان برسرِ اقتدار ہو جائے۔ تو اُسے مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔

وجہ۔ "برسرِ اقتدار" کے ساتھ "آنا" غلط اور "ہونا" صحیح ہے

فقرہ۔ سلیم کے تیچے کو بخار ہوگیا۔

---

[1] اس سلسلۂ مضامین کے حقوق محفوظ ہیں۔ ناشر

اصلاح :- سلیم کے چچا کو بخار ہو گیا۔

وجہ :- "دادا" "چچا" اور "ابا" وغیرہ کا الف حرفِ ربط آ جانے کی صورت میں "ی" سے نہیں بدلتا۔

فقرہ :- سمندر لہریں مار رہا ہے۔

اصلاح :- سمندر موجیں (یا ٹھاٹھیں) مار رہا ہے۔

وجہ :- "موجیں مارنا" اور "لہریں لینا" محاورہ ہے۔

فقرہ :- مشاعرے میں ہندوستان کے متعدد مسلم الثبوت اساتذ بڑے بڑے روسا، بیرسٹر اور پروفیسر وغیرہ وغیرہ شریک ہوئے۔

اصلاح :- مشاعرے میں ہندوستان کے متعدد مسلم الثبوت اساتذہ، بڑے بڑے روسا، بیرسٹر اور پروفیسر وغیرہ شریک ہوئے۔

وجہ :- ایک "وغیرہ" میں تو تمام کائنات آ جاتی ہے۔ پھر دوسرے "وغیرہ" کی کیا ضرورت ہے۔

نظم

شعر :- وہ اپنے جاں نثاروں پر عنایت ہی نہیں کرتے
یہ بہتر تھا کہ ہم اُن سے محبت ہی نہیں کرتے

غلطی :- دوسرے مصرع میں "نہیں" کا محلِ استعمال غلط ہے۔ یہ "نہ" کا موقع ہے۔

شعر :- تم ہی تھے وہ یا زیبِ شوق یہ کس کو خبر
ہم نے تو آنکھوں کو قربانِ نظارا کر دیا

غلطی :- (۱) اس غزل میں "رسوا" اور "تمنا" وغیرہ قافیے ہیں اور "کر دیا" ردیف۔ "قربانِ نظارہ" (حالت اضافت) میں "نظارہ" کی "ہ" "الف" سے نہیں بدلی جا سکتی۔ اس لئے قافیہ غلط ہے (۲) "تم ہی" کے بجائے "تمہیں" فصیح ہے۔

شعر :- لگے ہونے اب ہاٹ بازار بند
زمانے کے سب کار اور بار بند

غلطی :- "کاروبار" کی جگہ "کار اور بار" لکھنا صحیح نہیں

مصرع :- پکوان پھیکا ہوتا ہے اونچی دکان کا

غلطی :- "اونچی دکان پھیکا پکوان" محاورہ ہے۔ اور محاورے میں تصرف ناجائز ہے۔

شعر :- پاؤں پہ گر کے کرتے سفارش عدو سے ہم
پر کیا کریں کہ اس میں مروت کی خو نہیں

خامی (۱) "پاؤں" بر وزن نعلین آج کل بالاتفاق متروک و غیر فصیح اور بر وزن ناع رائج و صحیح ہے۔ (۲) "پر" "لیکن" کے معنی میں اکثر فصحا کے نزدیک متروک ہے

شعر :- کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
داتا رکھے آباداں ساقی تری محفل کو

خامی :- (۱) "آباداں رکھے" نہیں بلکہ "آباد رکھے" اردو کا محاورہ ہے۔ (۲) رکھے بہ تشدید باندھنا چاہیے۔

شعر :- اک نہ اک روز رکھ کے کچھ چھدّا
تم سے لے گی عوض ضرور اپنا

خامی :- "چھدّا" کا لفظ سخت مکروہ ہے۔ ہر لفظ شعر میں باندھنے کے لائق نہیں ہوتا۔ الفاظ کے انتخاب میں ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے۔

نشتر جالندھری

گناہگارِ ضمیر

فرید نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کرلیا۔ وہ بہت دیر سے سیڑھیوں پر ہوٹل کے ملازم کے پاؤں کی چاپ سُن رہا تھا۔ جب اس آواز کا آنا بند ہوگیا، اور اُسے اپنی تنہائی اور ہوٹل میں عام سکون کا یقین ہوگیا، تو اس نے دروازے کو قفل لگا دیا، لیکن اُس کا مضطرب دل اُسے مطمئن نہ ہونے دیتا تھا اب بھی وہ انتہائی خوف دہراس کے ساتھ اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، اگرچہ اُس کا یہ کمرہ ہوٹل کی سب سے بالائی منزل میں سمندر کے کنارے واقع تھا اور کھڑکیوں سے ہوا بھی فرحناک آرہی تھی، تاہم اس کے دل میں ایک اُلجھن اور دماغ میں ایک توحش پیدا تھا، وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

وہ تھکا ہوا تھا لیکن آرام نہ کرسکتا تھا، وہ بھوکا تھا، لیکن کچھ کھا نہ سکتا تھا، اس کا دماغ پریشان تھا، اور پریشان خیالات بُری طرح اس پر چھا رہے تھے۔ وہ اس زہرہ گداز منظر سے جو اس کی نظروں کے سامنے آآکر اُسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ رہائی پانے کی بہت کچھ کوشش کرتا رہا، لیکن کامیاب نہ ہوا۔

رات کی بڑھتی ہوئی خاموشی اور کمرے کا گہرا سکوت اُسے اور متوحش کر رہا تھا، وہ بار بار اپنے خیالات کی اُلجھنوں میں چونک پڑتا اور پھر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے خاموش بیٹھ جاتا تھا، کہ یکایک کمرے میں کسی چیز کے گرنے کی آواز سے وہ ڈر کر کھڑا ہوگیا اور باوجود سردی کے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے، اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہنا شروع کیا، "میرے لئے اب ڈرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی میں نے جس شخص کو پہاڑ کی اونچی چوٹی سے وادی کی انتہائی گہرائی میں گرا دیا ہے وہ اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوچکا ہوگا۔"

اس نے اپنے دشمن کی اُن دل آزاریوں پر ایک نظر ڈالی، جس نے اُس کی تمام گزشتہ خوشیوں کو تلخ کر دیا تھا، زندگی کی تمام کامیابیوں میں، صرف اُسی کی ذات سدِراہ تھی۔ اُس نے جب اس پر غور کیا کہ اُس نے کس طرح اس کی محبوبہ کو طرح طرح کے فریبوں کے ساتھ اس سے چھین لیا تھا تو وہ مقتول کے اس عبرتناک

انجام پر خوشی محسوس کرنے لگا،

حقیقت میں فرید کا یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اس کی جان ہی لے لے، لیکن پہاڑ کی اونچی چوٹی پر اُسے تنہا دیکھ کر دفعتہً اس کے جذبات ارتکاب قتل کی طرف مائل ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت سوائے سمندر، وادی اور ویران پہاڑ کے کوئی اس کے اس وحشت ناک فعل کی شہادت دینے والا موجود نہیں۔

وہ ہر قسم کی دار و گیر سے محفوظ تھا۔ پھر بھی اس کے خیالات پریشان تھے۔ اس کے دل میں اضطراب کا ایک طوفان برپا تھا۔ وہ مقتول کی اُس آواز کو بھول جانا چاہتا تھا جو غار میں گرنے سے پہلے آخری بار اس کے گلے سے نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس منظر کو محو کر دینا چاہتی تھیں جب اس کی سخت گرفت میں مقتول کی بے بس نگاہیں اس سے رحم کی التجا کر رہی تھیں۔

اُس نے خاموش کمرے میں اطمینان کا سانس لیتے ہوئے چاروں طرف دیکھا، صبح ہو چکی تھی سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، کاروباری شور و غل سے فضا گونج رہی تھی۔ فرید نے اپنے خیالات بدلنے کے لئے کھڑکی کھول دی اور باہر دیکھنے لگا، اُس نے دیکھا کہ "ایک شخص راستہ چلتے چلتے دفعتہً" رُک کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا اور آگے بڑھا۔ بڑھا اور پھر مُڑ کر دیکھنے لگا۔ فرید کا دل اس کی اس حرکت پر زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر کھڑکی پر ٹنگے ہوئے پردے کے پیچھے سے پھر اسی شخص کو دیکھنے لگا، اس مرتبہ وہ تنہا نہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک عورت بھی کھڑی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرید کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ آپس میں کچھ باتیں بھی کر رہے ہیں۔ ابھی وہ انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اخبار بیچنے والے لڑکوں کی آوازیں آنے لگیں، اُسے بالکل یقین ہو گیا کہ یہ سب میرے ہی جرم کی سرخیوں کے ساتھ اخبار بیچ رہے ہیں اور اِن کھڑکی کی طرف دیکھنے والوں کو اس کا علم ہو گیا ہے کہ قاتل اسی کمرے میں پناہ گزیں ہے۔ بس اب پولیس والے دو ہی چار منٹ میں آکر مجھے گرفتار کر لیں گے؛ اس خیال کے آتے ہی وہ سیڑھیوں پر گرفتار کرنے والوں کے پاؤں کی چاپ سننے لگا، جب اُسے کسی قسم کی آہٹ نہ معلوم ہوئی تو اُسے یقین ہو گیا کہ شاید میرے کان بہرے ہو گئے ہیں اس خیال کے آتے ہی اُس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا، اور لوگوں کی سرگرمیاں دیکھنے کے لئے باہر نکل آیا لیکن ہوٹل میں سوائے قہقہوں کی آواز کے اور کچھ نہ تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ سب اُسی پر ہنس رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ خوف و وحشت کا وہی عالم تھا، اس وقت پھر رات ہو چکی تھی، اس نے کمرے کے تمام دروازے بند کر کے بجلی روشن کر دی۔ اب اُسے اس تنہائی سے کسی قدر سکون ہوا تو وہ اپنے اس بے معنی خوف پر ہنسنے لگا، اس

سوچا کہ یہ مرد اور عورت جو میری کھڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے، ممکن ہے کہ بادل، چڑیا یا اور کسی چیز کو دیکھتے ہوں لیکن میرا گناہگار ضمیر خواہ مخواہ ڈرنے لگتا ہے، اگر میرا یہ راز ہر شخص پر منکشف ہو چکا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اب تک میں گرفتار نہ ہو چکا ہوتا۔

اس خیال سے اُسے تھوڑی دیر کے لئے اطمینان سا ہو گیا، لیکن بجلی کے دفعتہً بجھ جانے سے اُس کی گھبراہٹ اور پریشانی پھر بڑھ گئی، وہ خوف کے ایک عمیق سمندر میں غرق ہُوا جاتا تھا۔ اس نے بمشکل اُٹھنے کی کوشش کی، بجلی کے بٹن تک لڑکھڑاتا ہوا گیا اور اُسے جلد جلد دو تین مرتبہ نیچے اوپر کیا، مگر بجلی کی رَو اپنے خاص مخزن سے روک دی گئی تھی وہ سیدھی تک واپس آ کر اپنے بستر پر گر پڑا اور اُس پر ایک خوفناک غنودگی طاری ہو گئی۔

اگرچہ اس کی زندگی کی تمام حیات افروز مسرتیں ختم ہو چکی تھیں تاہم ابھی وہ مرنا نہ چاہتا تھا، موت کے خیال سے اس کی روح کو شدید اذیت ہوتی تھی، وہ جانتا تھا کہ مرنے کے بعد بھی قبر کے عذاب سے اُسے کسی طرح نجات نہیں مل سکتی، وہ کمرے کی تاریکی میں دو زانو ہو کر خدا سے دعا کرنے لگا۔ کہ الٰہی مجھے پھانسی کے تختے سے بچا لے، ابھی وہ اس دعا میں مصروف ہی تھا کہ کسی نے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا، وہ چونک پڑا اور اُسے پورا یقین ہو گیا کہ میری گرفتاری کا وقت آ گیا ہے، آنکھیں ملتے ہوئے اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور غور سے آنے والی آواز کو سننے لگا، اُس کی گھبراہٹ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ چلا کر بولا "کون ہے" آواز آئی جناب آپ کا ناشتہ اور گرم پانی موجود ہے" گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے چونکہ اُسے بھوک کا احساس نہ تھا، اس لئے اُس نے اندر ہی سے کھانا واپس کر دیا، بستر پر لیٹتے وقت اُسے خیال آیا کہ اگر کھڑکی کی طرف کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو پھر مجھے سمجھ لینا چاہیئے کہ اب میرے لئے کوئی خطرہ باقی نہ رہا، یہ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس آیا، اس مرتبہ جیسے ہی اُس نے کھڑکی سے نیچے دیکھا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اب بجائے دو آدمیوں کے تین آدمی اس کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہے ہیں کوئی شک نہیں کہ یہ سب میری ہی گرفتاری کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، غالباً پولیس ابھی وارنٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ گرفتاری میں اتنی تاخیر ہوئی لیکن یہ تو یقینی امر ہے کہ میرا راز اب راز نہیں رہا سڑک کا ہر گزرنے والا میرے ارتکاب جرم سے واقف ہو چکا ہے۔

اُس نے پردے کی آڑ سے پھر کھڑکی کے نیچے دیکھا "خدا کی پناہ اب تو تین کے بجائے بارہ تیرہ آدمی اوپر کی طرف دیکھ رہے ہیں! ان میں کچھ لوگ پولیس کی وردیاں بھی پہنے ہوئے ہیں، بھلا اب میری گرفتاری میں کیا شبہ ہے؟" زبیدہ کا خوف ایک عجیب قسم کا خوف تھا، کبھی اُسے محفوظ ہونے کا خیال مطمئن کر دیتا تھا اور کبھی وہ گرفتاری

کے ڈر سے اس قدر خوفزدہ ہو جاتا تھا کہ اُسے جلد سے جلد گرفتار ہو جانے ہی میں سکون و اطمینان کی صورت نظر آتی تھی۔

دس سے گیارہ تک اُسے یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں، ہوش آنے کے بعد اُس نے پھر نیچے دیکھا، لوگ اب بھی اُسی طرح اُس کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ دو پولیس انسپکٹر کاغذات کا پلندا لیئے ہوئے ہوٹل میں آئے اور اُس کے دروازے کے باہر ہوٹل کے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

فرید کا شک یقین سے بدل چکا تھا، اس نے سمجھ لیا کہ پولیس وارنٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی، اب بہتر یہی ہے کہ میں خود کمرہ کھول کر باہر نکل جاؤں اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں، ورنہ اگر پولیس خود کمرہ کھلوا کر اندر آ گئی تو میری ذلت کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ وہ ان تخیلات میں یہاں تک بدحواس ہوا کہ فوراً کمرہ کھول کر باہر نکل آیا، اور پولیس والوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا "میں تمہارے سامنے کھڑا ہوا ہوں مجھے جس طرح چاہو گرفتار کر لو۔ گرفتاری کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچنے سے کیا فائدہ"۔ یہ کہ کر اُس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا، پولیس والے اُس کی بدحواسی اور اقرارِ جرم پر دنگ رہ گئے، جب ذرا اُن کی حیرت کم ہوئی تو انہوں نے واقعہ کی نوعیت پر غور کرنا شروع کیا اور بالآخر فرید کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

جب پولیس والے اُسے گرفتار کئے ہوئے لئے جا رہے تھے تو فرید نے راستے میں دیکھا کہ وہ مجمع جو اس کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا حقیقت میں اس کی کھڑکی کو نہ دیکھ رہا تھا، بلکہ اس کے پاس لگی ہوئی بڑی گھڑی کو دیکھ رہا تھا، جس کی مرمت ہو رہی تھی۔

(ترجمہ) **سید ابو محمد ثاقب کانپوری**

گاہک (پرانی گاڑیوں کی دکان میں داخل ہو کر) یہ ٹو۔ٹو۔ ٹوٹی ہوئی گاڑی کتنے میں دو گے؟

دکاندار نے کچھ دیر گاڑی کا معائنہ کیا اور پوچھا آپ کیا دیتے ہیں؟

ہکلا گاہک گاڑی کو دیکھ بھال کر بولا "میں با۔ با۔ با . . . . .

دکاندار (بے صبری سے) ہاں مجھے منظور ہیں بارہ روپے۔

گاہک۔ با۔ با۔ با بہت اچھا! میں با۔ با۔ بائیس روپے کہنے کی کو۔ کو۔ کوشش کر رہا تھا۔
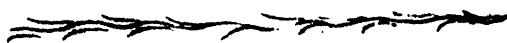
محفلِ ادب

او دیس سے آنے والے ——— بتا

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
آوارۂ غربت کو بھی سُنا کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن؟
وہ باغِ وطن - فردوسِ وطن - وہ سروِ وطن - ریحانِ وطن؟

او دیس سے آنے والے ——— بتا

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برساتیں ویسی ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟

او دیس سے آنے والے ——— بتا

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی سہانی راتوں کو آکاش پہ تارے ہوتے ہیں؟
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے ——— بتا

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی مستانہ فضائیں بھول گئیں؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں، ساون کی گھٹائیں بھول گئیں؟
دریا کے کنارے بھول گئے، جنگل کی ہوائیں بھول گئیں؟

او دیس سے آنے والے ——— بتا؟

"ندیم"

آرٹ اور اخلاق

آرٹسٹ کو عموماً گمراہ اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ کسی خاص مذہبی یا اخلاقی تعلیم کا پابند نہیں ہو سکتا' اور وہ دوسروں کو بھی ترغیب دلاتا ہے کہ مذہب اور اخلاق کی جائے پناہ سے نکل کر دنیائے جذبات کی سیر کریں۔ اور اس کے خطروں کا مقابلہ کریں۔ آرٹسٹ کے مشرب میں کسی قطعی فیصلہ کی گنجائش نہیں سچ اور جھوٹ' اچھے اور بُرے کا جو معیار مذہب اور اخلاق مقرر کرتے ہیں' اُسے وہ تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ معیار مقرر کرنے کے لئے نظر کو محدود کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ اُسے کسی طرح منظور نہیں' اپنے اصول کی صحت وہ ہمارے سامنے ایسے محل اور موقعے پیش کر کے ثابت کرتا ہے۔ جب ہم اپنے عقیدوں کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ بھی نہیں قبول کر سکتے کہ ہم نے غلط کیا یا بُرا کیا۔ عالمِ جذبات میں انسان کے لئے مذہب وہی کام کرتا ہے جو زمین پر اُس کا گھر۔ دونوں کے بغیر اُس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی۔ ہم میں سے ہر ایک کو ایسے مرحلے نہیں طے کرنے ہوتے جہاں ایمان کی پختگی اور عقیدوں کی سچائی کا امتحان ہو لیکن آرٹسٹ میں یہ قوت ہوتی ہے کہ ہمیں اپنا امتحان لینے پر مجبور کرے اور اکثر ہمیں اقرار بھی کرنا ہوتا ہے کہ جن عقیدوں میں ہم نے پناہ لی ہے اور اس عالمِ بے پایاں میں اپنا گھر بنایا ہے اُس کے در و دیوار کمزور ہیں اور ہماری حفاظت نہیں کر سکتے۔

"نیرنگ خیال"

مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے ؟

"کیا تم سمجھتے ہو مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے ؟

"بھاگ سکو گے ؟

"میں تمہارے گلے میں باہیں ڈال دوں گی۔

"میں تمہاری کمر میں ہاتھ کا پھندا کس دوں گی۔

"میں تمہارا پاؤں پکڑ کر روک لوں گی"۔

"اور اس پر اپنا سر رکھ دوں گی"۔

"کیا تم سمجھتے ہو مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے ؟

"چھوڑ سکو گے ؟

"میں تمہارے ہونٹوں پر اپنے گال چپکا دوں گی

"اس ساغر میں جو شراب ہے۔

"اسے پی کر تم مست ہو جاؤ گے۔
"اور میرے قدموں پر سر رکھ دو گے۔
"کیا تم سمجھتے ہو مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے"۔

"ادبی دنیا"

سنیما اور زندگی

(ہالی وڈ کی فلم سٹار جینٹ گینر کا پیغام اپنے قدردانوں کے نام)

"ایک روز مجھ سے ایک نوجوان شخص کہنے لگا' کچھ تمہیں اس کی بھی خبر ہے کہ تمہاری محبت ہر روز کتنے لوگوں کو اپنے دام میں پھنساتی ہے' اگرچہ ذرا انکسار سے دور تھا پھر بھی مجھے جواب دینا پڑا ہاں مجھے بخوبی معلوم ہے کیونکہ محبت یا مرمٹنے کے جذبات دل میں بھڑکانا میرا روز کا کام ہے جس کا مجھے کافی محنتانہ ملتا ہے۔ میری ڈاک کے بیشتر حصے میں مردوں کے خطوط ہوتے ہیں جن میں باوجود اس کے کہ میں بیاہی ہوئی ہوں مجھے شادی کے پیام دیئے جاتے ہیں۔ یہ خط بڑے محبت بھرے ہوتے ہیں لیکن ایک ہی ٹیپ کا بند لئے ہوئے کہ میری سادہ اور محبت میں بسی ہوئی زندگی کی شریک ہو جاؤ' بعض بہت ہی دلچسپ خطوط کا میں خود جواب دیتی ہوں ورنہ اکثر کے جواب میرے ایک سیکرٹری کے قلم سے لکھے جاتے ہیں جس کا ۲۴ گھنٹے بس یہی کام ہے۔

میری ڈاک کے جملے تو مخصوص ہیں' ۔ مجھے تم سے ڈیڈی لانگ لگز میں محبت ہوئی کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا میں تم جیسی بھی کوئی لڑکی ہو تم میرا مقصد حیات ہو' ۔ بے شک مجھے مسرت ہوتی ہے کہ لوگ میری نسبت ایسے خیال رکھتے ہیں لیکن مجھے بے انتہا تعجب ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ میری فلمی زندگی ایک فریب ہے جو ڈائرکٹروں کی جدتوں اور رنگارنگ کی روشنیوں کا نتیجہ ہے اور یہ جو پردہ پر تم بے دم کر دینے والے ارمانوں کا مشاہدہ کرتے ہو اس کی حقیقت آٹھ گھنٹے روزانہ کا۔ بیزار کر دینے والا کام ہے جو افسانے کے پلاٹ' ایکٹروں کی تزئین' مناظر کا رکھ رکھاؤ اور عدسوں جیسی کم ظرف چیزوں کی مدد سے تکمیل پاتا ہے۔ محبت کے مظاہرے امید و یاس کے مناظر رونا دھونا غرض کہ ہر چیز فلم بننے سے پہلے بار بار دہرائی جاتی ہے یہاں تک کہ نئی حقیقت اس میں تاثیر کا شائبہ تک نہیں رہتا۔

شاید میں یہ تمام باتیں نہ کہتی لیکن ان باتوں سے ایک اور سوال کے جواب میں جو اسی نوجوان نے مجھ سے کیا تھا مدد ملے گی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ تمہاری فلم کبھی اصلیت کا جامہ پہن سکے؟ اور کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اصل زندگی میں بھی

کوئی لڑکی تم سی قابلِ پرستش مل جائے؟" یہاں میرا سر شکر گزاری کے بوجھ سے جھک گیا۔

"کیا اصل زندگی میں بھی ایسے ارمان ہو سکتے ہیں جیسے تمہارے ہیں اور کیا وہ ایسے تعجب خیز ہو سکتے ہیں۔ جیسے پردہ پر نظر آتے ہیں؟"

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ فلم کی سحر کاری سرے سے بناوٹ ہی بناوٹ ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے؟ سحر کاری سے میری مراد ایک خاص فضا سے ہے جو ایک خاص قسم کی فلم میں تم محسوس کرتے ہو یعنی ایک خواب کی سی دنیا جس میں آسمانی موسیقی روح کو لوریاں دے رہی ہو۔ اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو زندگی میں ایسی سحر کاری نہیں ہے۔ سحر کاری تو ہالی وڈ میں بڑی بڑی لاگت سے تیار کی جاتی ہے یا کسی عالیشان ہوٹل میں روپے سے کرایہ پر لی جاتی ہے۔

لیکن میں یہ نہیں کہتی کہ میری فلم کے افسانے کسی طرح بھی سچ نہیں ہو سکتے۔ ضرور ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ آخر وہ عشق و محبت کے افسانے ہیں اور یہ بھید تمہیں اچھی طرح سمجھنا چاہیئے کہ اصل زندگی کی محبت میں بھی انسان اپنی ایک نئی دنیا بناتا ہے۔ یہ دنیا فلم کی ہر چیز سے بے انتہا زیادہ دلکش ہوتی ہے اس دنیا میں وہ ایک دوسرے کے حسن کے ایسے جلوے دیکھتا ہے جو سحر کاری بنانے والے فوٹو گرافر کو کامل شکست دے سکتے ہیں۔ اس وقت اپنے گرد و پیش کامیابی اور خوشی کی کامل وسعتیں تمہیں نظر آئیں گی جب تم زندگی میں اپنے ڈھب کی ہستی کو پالو گے۔ تم اسی طرح رہو سہو گے، جیسے پہلے رہ چکے ہو آسمان پر جگمگانے ستارے، دل کے عالیشان محل میں دانا کی ہزاروں موسیقیاں اور جب چلنے کا قصد کر دلو ہری ہری گھاس پر پھولوں کی بارش ہی بارش اور برائے خدا مجھ سے یہ نہ کہو کہ یہ دائمی نہیں۔ بیشک میں کوئی بڑی جہاندیدہ اور تجربہ کار نہیں لیکن پھر بھی یہ کہونگی کہ یہ دائمی ہے اور لافانی چنانچہ خود میری زندگی کی سحر کاری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ختم ہی نہ ہوگی لیکن یہ میرا ایک راز ہے۔ اُسے میں کیوں ظاہر کروں ہاں تو میرا مقصد یہ ہے کہ میں اپنی فلم کی ہستی کے متعلق کبھی یہ خیال نہیں کرتی کہ وہ عوام کو دھوکا دیتی ہے یا ان کے لئے باعثِ خطرہ ہے یہ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ سینما کے پردہ کی جنبٹ کو زندہ حاصل کرنے کی جستجو میں ہوں لیکن کوئی ہرج نہیں خواہ وہ انہیں ملے یا نہ ملے جب انہیں ان کے مقسوم کی لڑکی مل جائیگی تو وہ مجھے بھول کے بھی یاد نہ کریں گے پھر ان کے پاس ایک ایسا خزانہ ہوگا جس کے آگے دنیا کی کوئی جنبٹ گینز ٹک نہ سکے گی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ازدواجی زندگی محبت کا گلا گھونٹ دیتی ہے ممکن ہے یہ ان کا تجربہ ہو۔ میں یہ تو نہیں کہ سکتی کہ وہ جھوٹ کہتے ہیں لیکن کم از کم میرے لئے تو یہ کھلا جھوٹ اور یقینی افترا ہے محبت وہ کیا جس میں محبت کے سوا اور کچھ نہ ہو محبت تو وہ ہے جہاں ساتھ ساتھ نفرت کے امکانات بھی لگے ہوں آزمائشوں کی تپش میں یہ سونا اور کندن بن جاتی ہے۔ اور ناموافق حالات کے جھونکے نسیم بہاری کا حکم رکھتے ہیں اگر یہ نہ ہو سکا تو کم از کم میری خاطر محبت کے نام کو بدنام نہ کیجئے جسے آپ محبت کہتے تھے کچھ اور تھا محبت نہ تھی"۔

(ترجمہ از انگریزی) "مجلہ مکتبہ"

مطبوعات

ومپائر۔ یہ ملک کے مشہور مزاحیہ نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا ایک مختصر سا ناول ہے جو چھوٹی تقطیع کے تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مرزا صاحب کی افسانہ نگارانہ قابلیت مسلم ہو چکی ہے اور ملک سے ان کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ موجودہ ناول ایک مظلوم لڑکی کی درد بھری داستان ہے جو گردشِ تقدیر اور سوئے اتفاق سے ایک بدمعاش کے ہاتھوں میں پڑ گئی، پلاٹ بلا شبہ دردناک ہے لیکن کراہت انگیز اُس سے بھی زیادہ ہے۔ مرزا صاحب کے اکثر افسانوں کی ہیروئنیں اور ہیرو کسی نہ کسی مصیبت میں پھنستے ہیں اور اس مصیبت سے سنسنی پیدا کر کے مرزا صاحب ناظرین کے اعصاب کا جتنا بھی سخت امتحان ممکن ہو لینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس ناول میں تو مرزا صاحب نے غریب ناظرین کے دل و جگر کو بالکل پیس ہی ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہے "انگوٹھی کی مصیبت" کی مصیبت پاکیزہ تھی اور پُر لطف لیکن یہ مصیبت مکروہ گھناؤنی اور عذاب انگیز ہے اسی طرح "الشذری" کے معالجہ کی مصیبت پُر لطف تھی لیکن موجودہ ناول میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے قارئین سے کسی قسم کا انتقام لینے کی ٹھان رکھی ہے۔ پلاٹ کی کراہت کو ناول کے آخر میں دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن کراہت پھر بھی باقی رہتی ہے ناول دلچسپ ضرور ہے اور ہم اسے شروع کرنے کے بعد ختم کر کے اُٹھے لیکن کاش یہ دلچسپی کسی اور نوع کی ہوتی اس قسم کی سنسنی پیدا کرنے والی [illegible] خیز دلچسپی نہ ہوتی۔ فطرت نے مرزا صاحب کو زبان اور اندازِ بیان بہت دلکش اور بیساختہ عطا فرمایا ہے لیکن وہ خود اپنی تصانیف میں زبان کی طرف خاص توجہ نہیں مبذول فرماتے۔ علاوہ املا اور کتابت کی بعض غلطیوں کے اس کتاب میں زبان اور محاورات کی متعدد غلطیاں نظر سے گزرتی ہیں۔ اس قسم کے فاضل اور مسلم الثبوت مصنفین کو جیسے کہ مرزا صاحب ہیں زبان کے باب میں بھی بہت محتاط ہونا چاہیئے۔ ناول کی کتابت طباعت کاغذ اور جلد نہایت نفیس ہے۔ حضرتِ مصنف کی تصویر کے علاوہ متعدد دوسری تصاویر شامل ہیں جو ناول کے پلاٹ ہی کی طرح خوفناک ہیں لیکن بہت قابلیت سے انتخاب کی گئی ہیں۔ قیمت فی جلد دو روپے۔ پتا:- دفتر کتابت عظیم بیگ صاحب چغتائی جودھ پور۔

سعید اللغات۔ یہ مفید کتاب مطبعِ سعیدی کانپور نے عام کتابی سائز کے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر شائع کی ہے اور اس میں چوبیس ہزار پانسو الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں عربی فارسی ترکی عبرانی یونانی سنسکرت ہندی وغیرہ زبانوں کے جو الفاظ اردو میں مستعمل ہیں ان کے مختصر معانی درج کئے گئے ہیں ہر قسم کی علمی ادبی معاشرتی اصطلاحات اور اردو زبان کے محاورات وغیرہ مفصل طور پر دیئے گئے ہیں چھوٹا سائز ہونے کی وجہ سے استعمال میں بہت آسانی رہتی ہے ہم نے جستہ جستہ اس کتاب پر نظر ڈالی ہے اچھی مختصر لغت معلوم ہوتی ہے کاغذ کتابت اور طباعت اچھی ہے اور اس کی قیمت چار روپے بالکل مناسب ہے۔ مطبعِ مذکور سے منگوا لیجئے +

گاندھی نامہ:- یہ ہمارے نوجوان اور ہونہار دوست میاں محمد رفیق خاور ایم اے کی تصنیف ہے گاندھی نامہ مہاتما گاندھی کی منظوم سوانح عمری ہے نظم کرنے میں کوئی قابلِ ذکر ادبی یا فنی خوبی پیدا نہیں کی گئی اور اس لحاظ سے اگر نثر ہی میں سوانح عمری لکھ دی جاتی تو بہتر ہوتا اور مصنف کو بھی ناحق تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔

نظم میں شاعر نے مہاتما گاندھی سے بے انتہا عقیدت ظاہر کی ہے لیکن دیباچہ میں عجیب ستم ظریفی سے کام لے کر لکھ دیا ہے کہ اس نظم میں ہم حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گئے ہیں اور ہم نے بہت مبالغہ سے کام لیا ہے فی الحقیقت ہم صرف جائز حد تک گاندھی کی عظمت کے قائل ہیں۔ پھر اس "جائز حد" کی کوئی تشریح نہیں کی اور ناظرین کو اپنے صحیح جذبات سے ناواقف رکھا ہے کتاب کا ایک مقصد اقوامِ ہند میں آشتی پیدا کرنا ہے لیکن جب نظم کی روح ہی سے خود شاعر نے بے تعلقی ظاہر کر دی تو یہ مقصد حاصل ہونا معلوم! پھر طرفہ ماجرا یہ ہے کہ کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "یہ نظم صرف ہمارے جذبات کی آئینہ دار ہے عام مسلمانوں کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتی" اس قول کے پہلے حصہ کی تردید شاعر کے ابتدائی بیان سے ہو جاتی ہے اور اس لحاظ سے "عام مسلمانوں" کی طرح یہ نظم مصنف کے جذبات کی بھی آئینہ دار نہیں سمجھ میں نہیں آتا پھر یہ کس کے جذبات کی آئینہ دار ہے اور ان حالات میں اس سے کون سا مقصد حاصل ہوگا ہماری رائے میں اس نظم کے ساتھ یہ دیباچہ اور یہ آخری نوٹ دے کر مہاتما گاندھی کا منہ چڑایا گیا ہے اور خود مصنف نے اپنے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ گاندھی نامے میں کہیں کہیں زورِ بیان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے امید ہے کہ میاں صاحب جو ابھی بالکل نوجوان ہیں کسی وقت اچھے خاصے شعر کہنے لگیں گے۔ فی الحال اس کتاب میں تلفظ، محاورات، قواعد و عروض وغیرہ کی بیشمار غلطیاں ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ فاضل مصنف نے دیباچہ میں تنقیدِ زبان سے بہت نفرت کا اظہار کیا ہے اور زبان قواعد اور عروض کی تنقید سے نہایت استغنا اور تنفر کے ساتھ پناہ مانگی ہے۔

گاندھی نامہ بانگِ درا کے سائز پر چھپا ہے۔ حجم دو سو صفحات سے کچھ کم ہے کاغذ، کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے قیمت کتاب پر درج نہیں۔ انجمن ترقی ادب لاہور سے منگوائیے +

علیگڑھ میگزین کا سالنامہ علیگڑھ میگزین ملک کے ان چند رسالوں میں سے ہے جن کی ترتیب میں حسنِ ذوق سے کام لیا جاتا ہے سید وحید صاحب اکبر آبادی کی ادارت میں میگزین کا سالنامہ دو سو تیس صفحات پر شائع ہوا ہے جس میں ظاہری اہتمام کے ساتھ معنوی محاسن پیدا کرنے کی بھی کامیاب کوشش کی گئی ہے اردو شاعری کا زریں عہد' قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کے کارنامے' شعریاتِ ارسطو' حضرت عمر کی داخلی و خارجی حکمتِ عملی' آرٹ کیا ہے' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر عنوانات معلوم ہوتے ہیں۔ نظموں اور افسانوں کے انتخاب میں بھی حتی الامکان حسنِ ذوق سے کام لیا گیا ہے قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مینیجر علی گڑھ میگزین علی گڑھ سے منگوائیے +

فہرستِ مضامین

جلد ۲۴

نمبر ۲

ہمایوں بابت ماہ اگست ۱۹۳۳ء

تصاویر:- (۱) ستّی اور بیدلی (۲) فرہاد کا خط،

قیمت فی پرچہ ۸؍ — چندہ سالانہ ۵ روپیہ

طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) مدیرِ ہمایوں کی تازہ تصنیف

کے متعلق اہلِ ملک کی رائیں

خان بہادر میاں عبد العزیز صاحب کمشنر انبالہ

کتابو! کتابوں میں اگر عشق ہوتا تو میری الماری کی تمام کتابیں اس کتاب کی پیاری صورت پر جان دے دیتیں

مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ) دہلوی

کتاب ظاہری و معنوی خوبیوں کا بےنظیر مجموعہ ہے اور ہر لحاظ سے اردو ادبیات کے لئے باعثِ افتخار ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

آنریبل کپتان سر سکندر حیات خان ریونیو ممبر پنجاب گورنمنٹ

میری ناچیز رائے میں آپ کی یہ تصنیف ہر پہلو سے قابلِ ستائش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ مقبولِ عام ہوگی۔ اپنے قابلِ قدر مضامین کو یکجا کر کے آپ نے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ موزوں اور دلچسپ تصاویر اور اعلیٰ طباعت اور کتابت نے کتاب کی شان کو دوبالا کر دیا ہے

سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون۔ ایم۔ ایل۔ اے کراچی

کتاب ابھی سرسری طور سے جو دیکھنے کو اٹھائی تو ایک گھنٹہ تک دیکھتا رہا۔ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک نایاب کتاب ہے۔ عبارت نہایت صاف و خوشخط ہے۔ کاغذ بھی بہت عمدہ اور جلد بھی بیحد خوبصورت ہے۔ مضمون نہایت ہی لطیف و پاکیزہ ہیں جن سے آپکے اعلیٰ جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ دراصل جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

میاں احمد یار خان دولتانہ۔ ایم۔ ایل۔ سی۔ رئیسِ لڈن

طلسمِ زندگی کا بیحد شکریہ۔ کل شام کو میں نے رات کے دو بجے تک اُسے پڑھا۔ اس میں حسن ہی حسن ہے۔ ممکن ہے میری تعریف تحسین ناشناس ہو لیکن مجھے دعویٰ ہے کہ سخن شناس بھی اسے ادبِ اردو میں ایک بہترین اضافہ اور پچھلے سالوں کی چند بہترین کتابوں میں ایک سمجھے گا ـــــ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

قیمت صرف پانچ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

سید عبد اللطیف۔ دفتر رسالہ "ہمایوں" ۲۳ لارنس روڈ لاہور

جہاں نما

ہندوستان کا زندۂ جاوید تہذیب و تمدن

قومیت کی روح کی استواری کے لئے غیر ملکی حکومت سے نفرت کرنا ضروری نہیں بلکہ قوم میں اپنے تہذیب و تمدن کے متعلق صحیح احساس پیدا کرنا اور اس تہذیب و تمدن کے احیا اور شیرازہ بندی کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

ہندوستان کی تہذیب مصر کی تہذیب سے بھی قدیم ہے۔ موہنجو دارو کی کھدائی کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ تہذیب مسیح سے تین ہزار سال قبل بھی بہت ترقی کر چکی تھی۔ گزشتہ صدیوں میں اس تہذیب پر کئی بیرونی حملے ہوئے۔ غالباً سب سے پہلے حملہ آور آرین تھے۔ اس کے بعد سیتھین اور ہن وغیرہ تباہ کاری کے لئے آئے لیکن بالآخر ہندوستان میں مدغم ہو گئے۔ یہ ادغام بجائے خود حیرت انگیز نہیں۔ اس کی اور مثالیں بھی ہیں مثلاً روم بھی بارہا اپنے غیر مہذب فاتحوں پر اسی قسم کی فتح حاصل کرتا رہا لیکن ہندوستان کی تہذیب کو اس سے سخت تر امتحان بھی دینا پڑا یعنی اس ملک کی تہذیب سے دوسری ترقی یافتہ تہذیبوں کا تصادم بھی ہوا لیکن اس کے باوجود یہ محفوظ رہی۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اس تہذیب میں زندگی کی ایسی روح ہے جسے ہزارہا سال کے مخالف اثرات بھی نہیں دبا سکے۔ یہ دوسری تہذیبوں سے متاثر ضرور ہوئی اور متاثر ہونا چاہئے بھی تھا کیونکہ ماحول سے بالکل غیر متاثر رہنا ایسا جمود پیدا کر دیتا ہے جو بالآخر موت پر منتج ہوتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی عمارت وہی ہے البتہ وقت اور زمانے کے اقتضا کے ساتھ ساتھ اس میں بعض ترمیمات ہوتی رہی ہیں۔ مفید ترمیمات کو قبول کرنا اور غیر مفید کو رد کر دینا ہمارا کام ہے۔ اپنے تہذیب و تمدن کی عظمت کا صحیح احساس اور اس کے تحفظ کا جذبہ قومیت کی اصل روح ہے، ہندوستان کی قدیم تہذیب پر ہندوستان کی موجودہ ملتیں بہت کچھ اثر انداز ہوئی ہیں اور یہ تہذیب ان مختلف ملتوں کا مشترک سرمایہ ہے یہی ہمارے ماضی و حال اور مستقبل کا آئینہ ہے جس کی حفاظت ہندوستانی قوم کی انفرادیت کے قیام کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اگر ہمیں آج اپنے اس متحدہ مفاد کے متعلق صحیح احساس عطا ہو جائے تو بہت سے لاینحل عقدے حل ہو جاتے ہیں۔

ضبط و پرہیز کے مزے

ایک مشہور مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ضبط و پرہیز میں بجائے خود ایک لطف ہے اور جو لوگ اس سے واقف نہیں وہ زندگی کے آدھے لطف سے محروم رہ جاتے ہیں مجھے ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو مذہبی نقطۂ نظر سے روزے رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چند ہفتوں کے لئے زندگی کی "اچھی چیزوں" کی تعدی سے نجات پالینا کس قدر خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بند کمرے میں محبوس شخص کو صبح کی ٹھنڈی ہوا حاصل ہو جائے۔ زندگی کی اچھی چیزیں اچھی تو ہیں لیکن ان کی غلامی اچھی نہیں۔ اسی لئے مذہبی پیشواؤں نے ہمیں ان سے احتراز کا خیال دلایا کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ ہم ان چیزوں پر ٹوٹ جائینگے ان کے غلام ہو جائیں گے کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بڑے بڑے عقلمند انسان صبح کی چائے جیسی حقیر چیز کے غلام ہوں۔ ہم میں سے اکثر لوگ اگر کسی دن چائے سے محروم رہ جائیں تو اسے اتنی بڑی آفت سمجھتے ہیں گویا ہم نے کسی بحر اعظم کے سمندر میں غرق ہو جانے کی خبر پڑھی ہے۔

تمباکو، گوشت، چائے، کافی اور اس قسم کی دوسری چیزوں نے ہمیں اپنا حلقہ بگوش بنا لیا ہے۔ ان کے استعمال سے خوشی ضرور ہوتی ہے لیکن ہمیں ابھی یہ آزمانا ہے کہ انکے ترک کرنے سے کس قدر خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔

کسی چیز کے بغیر زندہ رہنے کے قابل ثابت ہونے سے فتح کا جو احساس ہوتا ہے اس میں ایک سچی مسرت پنہاں ہے۔ تمباکو، شراب، چائے اور دوسری اس قسم کی چیزیں معدوم بھی ہو جائیں تو دنیا قائم رہے گی :

زار کے پوشیدہ خزانوں کا سراغ

یورال کے پہاڑوں کے قریب ایک قصبہ ہے جس کے نواح میں زار روس اور اس کے خاندان کے افراد قتل کئے گئے تھے۔ یہاں تین انگریز ماہرین نے بیس لاکھ پاؤنڈ کے خزانے کا سراغ لگایا ہے۔ اس خزانے کا کچھ حصہ زار روس کی ملکیت تھا اور باقی کے مالک روس کے امرا تھے۔

۱۹۱۷ء میں یعنی انقلاب برپا ہونے سے ذرا پہلے یہ خزانہ مذکورہ قصبے کے ایک مکان میں مدفون کیا گیا تھا۔

خزانے کے بعض مالکوں نے لنڈن کے ایک ساہوکار کو بطور ایجنٹ کے مقرر کیا تھا اسی نے روسی حکومت کے ساتھ شرائط طے کیں اور بالآخر یہ قرار پایا کہ خزانے کے ۳/۴ حصہ کی مالک حکومت روس ہوگی اور ۱/۴ حصہ مالکوں کو ملیگا۔ لنڈن سے جو شخص مکان کا سراغ لگانے کے لئے روس آئے تھے۔ ان میں سے ایک وہ شخص تھا جس نے یہ خزانہ دفن کیا تھا۔ دفینہ کے مقام کو پوشیدہ رکھنے کی بہت کوشش کی گئی چنانچہ یہ لوگ تمام قصبہ کا چکر لگاتے رہے اور اسی سلسلے میں اس مکان کے قریب سے بھی گزر گئے جس میں آج سے سولہ سال قبل یہ گراں قدر خزانہ دفن کیا گیا تھا۔ مکان بالکل محفوظ ثابت ہوا اور اب خزانے کا حصول بالکل یقینی ہے۔ خزانہ بہت گہرا دفن نہیں کیا گیا تھا اس لئے اس کے حاصل کرنے میں بہت کم وقت صرف ہوگا۔ یہ خزانہ بیش بہا جواہرات پر مشتمل ہے :

ہوابازی کی مختصر تاریخ

کیرولینا کے ریگزاروں میں تاریک راتوں کو روشنی کا ایک مینار نظر آتا ہے جو طیاروں اور ہوابازوں کی رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ اس مینار کو تاریخی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ اس مقام پر نصب کیا گیا ہے جہاں آج سے تیتیس سال پہلے اورول رائٹ نے ایک طیارے میں دنیا کی اولیں پرواز کی تھی۔

عظیم الشان موجد نہایت خاموش مزاج، متین اور شہرت پسند آدمی ہے۔ وہ کبھی کوئی پیش گوئی نہیں کرتا۔ اپنے آئندہ کارناموں کے متعلق ہوائی قلعے تیار کرتا ہے۔ باتوں سے زیادہ وقت وہ کام میں صرف کرنا چاہتا ہے۔ ایک شخص نے اس سے ملاقات کی اور ہوابازی کی ترقی کے امکانات کے متعلق اس سے سوال کیا۔ اورول رائٹ کے بھائی ولبر رائٹ نے جو ان کارناموں میں اپنے بھائی کا دست راست ہے جواب دیا کہ پرندوں میں فقط طوطا بولتا ہے لیکن یہی پرندہ زیادہ بلند نہیں اڑ سکتا۔

اس باب میں ایک خاص واقعے کا بیان شاید دلچسپ ہو۔ ۲۹ سال قبل جب اورول رائٹ پرواز کا پہلا تجربہ کرنے والا تھا نیویارک کے ایک اخبار نے اس تجربے کے مشاہدہ کے لئے اپنا ایک خاص نمائندہ بھیجا جس نے نہایت ہوشیاری سے پرواز کے تماشے کا موقع حاصل کر لیا چنانچہ نمائندۂ اخبار نے دیکھا کہ طیارہ کسی قدر بلند ہوا اور ایک کھیت کا چکر لگا کر نہایت آرام سے نیچے اتر آیا۔ یہ دیکھ کر نمائندہ قریب ترین تارگھر کی طرف بھاگا اور اپنے مشاہدے کے متعلق ایڈیٹر کو تار دیا۔

ایڈیٹر کے وہم و گمان میں بھی ان دنوں یہ بات نہ آ سکتی تھی چنانچہ اس نے یہ اطلاع سراسر نامہ نگار کی فسانہ طرازی پر محمول کی اور تار ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی غریب نامہ نگار کو بیہودہ اطلاعات دینے کے جرم میں چھ ہفتے کے لئے معطل کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اورول کی پرواز کے کئی دن بعد تک اس کا ذکر اخباروں میں نہ آیا اور بالآخر ذکر آیا بھی تو یونہی سرسری سا۔ ان اطلاعوں میں طیارے کے بجائے "ہوا کا جہاز" لکھا گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ یہ غبارے کی کوئی قسم ہے۔

یہ تیتیس سال کا واقعہ ہے۔ آج کل دو لاکھ میل کا ہوائی راستہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور ہوائی سفر اتنا محفوظ ہو گیا ہے کہ ڈاک کے محکمے نے ڈاک کی ترسیل وغیرہ کا کام بھی طیاروں سے لینا شروع کر دیا ہے۔ ابتدا میں طیارے بہت خطرناک سمجھے جاتے تھے۔ مگر دوسری ایجادات کا حال بھی ابتدا میں یہی ہوتا رہا۔ چنانچہ جارج سٹیفن نے جب انجن بنایا تو انجینیروں نے کہا کہ اس کا بوائلر پھٹ جائیگا اور مسافروں کے پرخچے اڑ جائینگے۔ گاٹلب ڈیملر نے جب موٹر کا انجن بنایا تو اس سے کہا گیا کہ اگر تم نے اس کی رفتار بڑھانے کی کوشش کی تو انجن جل جائیگا اور تم خاک سیاہ ہو جاؤگے۔ ہوائی جہاز کے متعلق تمام وسوسے بھی اسی نوعیت کے تھے۔

فن پرواز کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ تیتیس سال قبل رائٹ کی پہلی ہوائی مشین زمین سے ڈیڑھ اور چند فٹ کی بلندی پر بارہ سکینڈ تک اڑی۔ یہ صرف ایک آدمی کا بوجھ اٹھانے کے قابل تھی۔ پانچ سال بعد بلیریٹ نے اپنے ۲۵ گھوڑے کی طاقت کے طیارے میں انگلش چینل کو عبور کیا۔ اس میں ۳۷ منٹ صرف ہوئے۔ اس طیارے میں صرف بلیریٹ سوار تھا۔

دس سال بعد ایک طیارہ انگلستان سے فرانس پہنچا جس میں ہوا باز کے علاوہ دو اور مسافر بھی تھے۔ اس طرح گویا ہوائی سفر کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اس تیس سال سے کم عرصے میں ہوابازی نے بے انتہا ترقی کی ہے اور ہوائی سفر بہت محفوظ اور آسان ہو گیا ہے۔ اب نہایت مضبوط اور ہزاروں گھوڑوں کی طاقت کے ہوائی جہاز بن گئے ہیں جو بہت بوجھ اٹھا سکتے ہیں اور مسافروں اور ڈاک کے پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔

ہوابازی کی تازہ فتح دنیا کے بلند ترین پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر طیارے کی پرواز ہے۔ اس کا سہرا انیلوز اور اس کی جماعت کے سر ہے جنہوں نے ۳۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اپنا طیارہ اڑا کر ہوابازی کی تاریخ میں اپنا نام غیرفانی کر لیا۔

دلِ ناکام

روئے، روئے ذرا دلِ ناکام
تو نے پایا نہ جیتے جی آرام

روئے، روئے کہ جی ہو کچھ ہلکا
تو ہے خوددار لوگ ہیں خودکام

ایک آفت ہے مدّ و جزرِ حیات
اک قیامت ہے گردشِ ایام

آفریں اس غم آفرینی پر
واہ کیا تو نے کر دکھایا کام

اپنی باتوں میں محو ہے دنیا
کس قدر ہے وہ قابلِ الزام

غم پسندی یہ حق پسندی ہے
شکلِ غمگیں ہے مرجعِ الہام

عمر تیری کٹی یونہی ہیہات
ایک تو اور سینکڑوں آلام

رٹے جا یونہی، یونہی کھوئے جا
جوہرِ زیست صبح سے تا شام

وقفِ غم ہو کے یونہی بھولے جا
حق کا پیغام اہلِ دل کے نام

دلِ رنجور احیف ہی تجھ پر
کیا یہ انسانیت کا ہی پیغام

بشیر احمد

اردو کی موجودہ ضروریات

کہتے ہیں ضروریات اردو پر تم | لکھ لاؤ مقالہ اور سناؤ جھٹ پٹ
دیکھو تو ظریفانہ ستم یاروں کا | موضوع تو یہ اور فقط تیس منٹ

حال ہی میں "اردو سبھا" کے نام سے لاہور میں ایک علمی و ادبی انجمن قائم ہوئی ہے۔ اس کے پہلے اجلاس میں جناب پنڈت برج موہن صاحب دتاتریا کیفی دہلوی نے یہ فاضلانہ مقالہ پڑھا تھا۔ اوپر کے دو اشعار میں "تیس منٹ" کی تلمیح انجمن کے ایک خاص قاعدے کی طرف ہے جو اردو سبھا کے نائب صدر جناب پروفیسر اے۔ ایس۔ بخاری صاحب کی تحریک پر منظور ہوا تھا اور جس کا مفاد یہ تھا کہ اس انجمن میں جو مقالات پڑھے جائیں اُن میں تفصیلات سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے اور کوئی مقالہ نگار آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہ لے مقالہ کے خاتمے پر باقی وقت میں اس موضوع کے متعلق مقالہ نگار سے سوالات کئے جائیں اور اس سلسلے میں ضروری تنقید کی جائے جس سے معلومات میں اضافہ ہو۔ (حامد علی خاں)

چونکہ تھوڑے وقت میں بہت کچھ کہنا ہے اس لئے اردو سے متعلق کئی اہم امور کو مسلمہ مان کر چھوڑ دیا جائے گا۔ ان پر استدلال و توجیہہ سے کام نہیں لیا جائے گا، کیا ان بدیہی صداقتوں سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ اردو زندہ زبان ہے۔ اردو بہ حیثیت ایک زبان کے اعلیٰ ترین ترقی کے امکانات رکھتی ہے۔ اردو توسیع پذیر ہے۔ اس کی اشاعت روز افزوں ہے۔ اس کی زبان اور ادب میں ہمیشہ ترمیم و اصلاح ہوتی رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک تو آپ مجھ سے متفق ہوں گے۔ اب یہ کہنا ہے۔ چونکہ ہم سب اردو کے حامی ہیں اور دل سے اس کی ترقی چاہتے ہیں اس لئے یہ دیکھ بھال ہمارا فرض ہے کہ زبان کے کس شعبہ یا شق میں اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے اور سوانح جو ترقی کے مزاحم ہوں انہیں دور کرنا۔ اولیات یا مبادیات سے دستبردار ہو کر براہِ راست موضوع سے رجوع لاتا ہوں۔

نہایت محتاط تحلیل سے کام لے کر ہم ان دو حقیقتوں پر پہنچتے ہیں یعنی یہ دریافت کرتے ہیں کہ زبان کی ترقی کے لئے دو چیزیں لابدہیں (۱) الفاظ یا کلمات کا دافی ذخیرہ اور (۲) ان کی تنظیم یعنی انشا۔ کینے جملوں کا ایسا اسلوب جو منشی یا متکلم کے مافی الضمیر کو بوجہِ احسن ظاہر کر سکے اور کار آمد و متداول علوم و فنون سے متعلق اظہار بیان کی

قدرت رکھتا ہو۔

ابتدا ہی میں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں امور جن کا ابھی ذکر ہؤا زبان کی ساخت اور ترکیب سے ہر نوبت پر متاثر ہوتے ہیں۔ اردو کے اجزائے ترکیبی ہندی زبانیں اور فارسی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں میں نے ہندی زبانیں کہا ہے۔ اس سے میری مراد ہے ہندوستان کی دیسی زبانیں۔ اردو کا لسانیاتی موازنہ آپ پر واضح کرے گا کہ اردو — ہماری آج کل کی اردو — میں ہندوستان کی بہت سی زبانوں سے استفادہ ہوا ہے۔ جن میں برج بھاشا۔ ماگھدی غرضکہ شورسینی کی کئی شاخیں یعنی اپ بھرنش بولیاں اور گجراتی وغیرہ شریک ہیں۔ حیرانی ہوگی کہ عربی اور سنسکرت کا نام کیوں نہیں لیا گیا۔ سنئے۔ عربی اور سنسکرت سے تصرف کے ساتھ یا بلا تصرف ہم نے صرف مفرد کلمات اور چند مرکبات لئے ہیں ہمارے بیان کا طرز ان کے بیان سے متاثر نہیں ہؤا۔ پھر بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ سنسکرت کے مقابلے میں عربی کلمات کی شرکت اردو میں زیادہ ہوئی لیکن لسانیاتی تاثر کا جہاں تک تعلق ہے اور صرفی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہماری زبان عربی سے زیادہ سنسکرت سے براہِ راست یا بالواسطہ مستفید ہوئی ہے

اب سنئے اردو پہلے پہل مقامی اور وقتی ضروریات سے ایک فعلِ طبیعی کی طرح پیدا ہوگئی۔ اسی طرح مدتوں چلتی رہی۔ پھر اس کی طرف اہلِ علم کی توجہ ہوئی۔ انہوں نے اس کے قواعد مرتب کئے۔ اصول قائم کئے۔ آئین اور دستور باندھے۔ یہاں سے اردو کی تنسیق و تنظیم شروع ہوئی جو انیسویں صدی عیسوی کے شروعات تک برابر جاری رہی۔

اتنا کہہ کر اب میں تنقیح نمبرا کو لیتا ہوں۔ عہدِ گزشتہ کی ضروریات کو زیرِ نظر رکھ کر بے تامّل کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں کلمات کا ذخیرہ کافی و وافی ہے۔ متقدمین نے اپنی ضروریات کے مطابق یہ ذخیرہ اچھا پیدا اور فراہم کر لیا تھا متوسطین نے اس کی تنسیق میں کارِ نمایاں کیا۔ متاخرین نے اگر کیا تو یہ کہ نہ صرف اسلاف کے مساعیٔ مشکور پر پانی پھیر دیا بلکہ اردو کو اشتقاقی قوت اور اختراعی قابلیت سے نادانستہ محروم کرنے میں کسر نہ رکھی — کیا تو یہ کہ لفظی صناعی اور تخئیلی صناعی سے کلام کی فطری خوبی اور سادگی کا خون کر دیا۔ بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ کم و بیش پچھلی نصف صدی میں اصطلاحی ضروریات سے قطعِ نظر اردو میں ایک مفرد کلمہ۔ ایک مرکب بھی ایزاد نہیں ہؤا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر کام کے الفاظ قلیل الاستعمال ہو کر نکمے اور متروک بن گئے۔ ان بزرگواروں نے کیا تو یہ کیا کہ سیدھی سادی اردو ترکیبیں اور کلمے چھوڑ کر فارسی اور عربی لغات کی بھرمار کر دی۔ دیکھنا کو نظر انداز کیا اور نظر کرنا۔ تماشا کرنا اس کی جگہ استعمال کیا — کہاں وہ اسلاف جنہوں نے بخشنا۔ بدلنا۔ آزمانا۔ لرزنا

گرمانا۔ خریدنا۔ شرمانا۔ فرمانا وغیرہ مصدر اردو کو بخشے اور کہاں یہ حضرات ٹھیٹھ اردو میں اُن کی جدّت اور اشتقاقی وجاہت دیکھئے۔ کھاؤ۔ نکھٹو۔ گلچھرّے۔ ہنس مکھ۔ منہ پھٹ۔ ہتھ چھٹ۔ سمجھدار۔ دیوانہ پن وغیرہ سیکڑوں مرکب بنا ڈالے جو معنی کی بیش بہا دولت کے مالک ہیں۔ متاخرین کے کارنامے صرف یہ ہیں کہ انہوں نے اردو کو بافاعدہ سیکھنے سکھانے کا تو کبھی خیال تک نہ کیا مگر ضرورت پر یا بے ضرورت کلام کو بُرہان اور قاموس کا ملحق بنا دیا۔ وہ بھی ہیں جو قدم قدم پر امرکوش اور شبد کلپدرم کے دروازے پر الکھ جگاتے رہتے ہیں لیکن آپ ہی دیکھئے کہ ادبی دنیا میں ان مہا پرشوں کو کہاں جگہ دی جاتی ہے۔ یہ لوگ نہ اردو کے اہل ہیں اور نہ ہندی کے۔ لسانی حریّت۔ حریّتِ فکر کی ماں ہے۔ آپ اپنی زبان میں دوسری زبانوں کے دست نگر اور قرضدار رہیں گے تو حریّت فکر و تخیل آپ سے دور ہو جائے گی۔

اردو کوئی صرفی زبان تو ہے نہیں کہ مادّوں سے کلمے بناتے جائیے۔ یہ اپنے اجزائے ترکیبی کی زبان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ ۶ زہر خرمنے خوشۂ یافتم۔ یہ خوشہ چینی اب بھی ناگزیر ہے اور اس کا تموّل بڑھ سکتا ہے بہ شرطیکہ ہم اعتدال اور سلیقہ سے کام لیں۔ اس بارے میں سلیقہ کی تعریف تشریح طلب ہوگی۔ یہ کام ڈیڑھ صدی کے قریب زمانہ گزرا سید انشا کر گئے۔ فرمایا ہے :-

> "واضح رہے کہ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا عربی ہو یا فارسی۔ ترکی ہو یا سُریانی پنجابی ہو یا پُوربی۔ از روئے اصل غلط ہو یا صحیح۔ وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے مطابق ہو تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت اور غلطی اردو میں اس کے استعمال پر منحصر ہے۔ کیونکہ جو اردو کے خلاف ہے غلط ہے خواہ وہ اصل زبان میں صحیح ہو۔ اور جو اردو کے موافق ہے صحیح ہے خواہ وہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔" (دریائے لطافت صفحہ ۲۴۱)

متاخرین نے طلسم لسان کے اس اسم اعظم کو بھلا کر اردو کو غیر زبانوں کا کنو ڈا کر دیا۔ فرماتے ہیں عرصہ عربی میں مُدت کے معنی میں نہیں آتا اس لئے اس معنی میں لانا غلط۔ ارشاد ہوتا ہے فارسی میں از خود رفتہ تھا۔ آپ کا خود رفتہ بولنا صحیح نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ماخذ پرستی ہی نہیں بلکہ وہ جبر و استبداد ہے جس کے مرتکب ادبی "سخت جان" لسانیات اور ادبیات میں ہر کہیں اور ہمیشہ ہُوا کرتے ہیں۔

عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور فرنگی کلمے اردو میں ہیں اور رہیں گے۔ اور آئیں گے۔ مگر اُسی نوع سے جیسا کہ سید انشا نے فرمایا۔ بحث ضرورت۔ تلفظ اور معنی ہی سے تو ہے۔ ہم نے دھرم کو دھرم اور کرم کو کرم اور

موسم کو سوسم بنا دیا۔ ہم آتما یا روح کو نفس یعنی مرکزِ احساسات وجذبات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم حور (صیغۂ جمع) کو واحد قرار دے کر اس کی جمع حوروں اور حوریں لاتے ہیں۔ سنسکرت کے بیاکل کو ہم نے بیکل بنا دیا۔ ارواح روح کی جمع ہے ہم نے کہا اس کی ارواح خوش ہوئی۔ ارواح شرمانا۔ آپ میں سے بعض احباب اپنے دل میں ضرور کہ رہے ہوں گے۔ کہ "یہ کہاں کا کھڑاگ لے بیٹھے کوئی غزل سنائیں"۔ گو بر گنیش اور صلواتیں سنا نا صاف کہ رہے ہیں کہ مقدس کلمے بھی اردو کے تصرّف سے نہ بچ سکے۔

زبان صرفی ہو یا غیر صرفی دوسری زبانوں کے کلموں کے شمول سے نہیں بچ سکتی۔ اس کا تو ذکر ہی کیا کہ بھگوت گیتا میں کئی کلمے پراکرت کے بتائے گئے۔ کلام مجید میں ایک سو کے قریب کلمے غیر عربی زبانوں کے موجود ہیں۔ آج کل کی عربی زبان میں جس کا لغات (لغاتِ جدید) سید سلیمان ندوی نے مرتب کیا غیر زبانوں کے سیکڑوں لفظ شامل ہیں اسی طرح غیر زبانوں یعنی عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ ہندی اور انگریزی وغیرہ زبانوں سے لغت ہم بھی لیتے ہیں اور لیں گے لیکن اصولِ تارید کے تحت یعنی اپنے ڈھنگ پر اور تصرف کی صلاحیت کے ساتھ دیکھئے صندوق ہم نے غیر زبان سے لیا لیکن اس کی جمع بنائی تو صندوقوں بنائی۔ صنادیق کو ہاتھ نہ لگایا۔ یہی تو ہے تصرف شمس ہم عرب سے اُٹھا تو لائے لیکن تصرّف کے افسوں نے اسے عورت سے مرد بنا دیا۔ ٹکٹ کو ہم ٹکٹ کہتے ہیں اور فیس کو کلمۂ مفرد استعمال کرتے ہیں۔

کلمات کے اختراع۔ مشتق کرنے یا باہر سے لینے کی ضرورت اس عہد میں ہر کبھی سے زیادہ اور بہت زیادہ ہے اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر علم اور فن اپنے ساتھ نئے لغات لاتا ہے۔ ہمیں نہ صرف اصطلاحات ہی وضع کرنی ہیں بلکہ معمولی ادبی زبان بھی اپنے لغات میں توسیع چاہتی ہے۔

پہلے میں وضعِ اصطلاحات کو لوں گا۔ وہ کہیں سے لائی گئی ہوں ــــ تمام ادبی شعبوں فلسفہ منطق جغرافیہ اور ریاضی وغیرہ علموں کے متعدد شعبوں کی اصطلاحیں ہمارے ہاں موجود تھیں جس وقت کہ مغرب کے نئے سائنس اور کلچر سے ہمارا سابقہ ہوا، یہ بھی ہوا کہ اہلِ فرنگ کے ساتھ ہم کو بھی اپنی اصطلاحوں میں ترمیم کرنی پڑی۔ انگریزی میں پہلے پولیٹیکل اکانومی ایک علم کا نام تھا۔ ہم اسے سیاستِ مُدن کہتے تھے۔ اب یورپ میں اس علم کی وضع قطع کے ساتھ اس کا نام بھی بدل گیا اور ہم بھی اکونومکس کو معاشیات کہنے لگے حالانکہ پرانی اصطلاح ملا جلال الدین دوانی کی وضع کی ہوئی تھی۔ کبھی ہم کو اپنی اندرونی ضرورت سے دقّت پیش آئی۔ جب ولایتی مال جہازوں پر لد کر ہندوستان میں آنا شروع ہوا تو بِل آف لیڈنگ ساتھ آنا ہی تھا۔ اس کو ضروری تصرف کے ساتھ ملتی

کہا گیا۔ جب ملک میں ریل جاری ہوئی تو ریلوے کے پارسل کی رسید کو نہ جانے کیوں بلٹی کہنے لگے۔ آج بھی ریل کے پارسل یا مال گدام کی رسید کو بلٹی کہتے ہیں جنھوں نے اس رسید کو بلٹی کہا وہ اردو بولنے والے تھے۔ جنھوں نے بل آف لیڈنگ کو بلٹی کہا وہ گجراتی بولنے والے تھے۔ دونوں قسموں کا مال لانے والے فرنگی تھے۔ بلٹی کا لفظ مال کی آمدورفت کے سلسلے میں کانوں میں پڑا ہوا تھا۔ اِدھر بھی سہل انگاری سے اس کا استعمال دوسرے معنی میں شروع ہوگیا۔ اب جو معاشیات کی اصطلاحیں نئے سر سے وضع ہونے لگیں تو بل آف لیڈنگ کے لئے کوئی لفظ نہ تھا۔ کیونکہ تمام شمالی ہند میں بلٹی کا لفظ ریل کے پارسل کے متعلق مستعمل اور معروف ہوچکا تھا۔ آخر اس کی جگہ لداؤ پرچہ قرار دینا پڑا جو بل آف لیڈنگ کا لفظی ترجمہ ہے۔ برقیات کی ذیل میں الکٹری فائی کی جگہ جو برقانا وضع کیا گیا ہر لحاظ سے قابل داد ہے۔ پونڈ کے روپے۔ اور روپوں کے پونڈ بنائے جائیں تو تبادلہ کا فرق جو ہوتا ہے اسے بھڑوت کہا گیا یعنی ڈفرنس آف اکسچیج۔ لفظی ترجمہ کہیں بدعنوانی بھی پیدا کر دیتا ہے ہونا چاہیئے کہ اصطلاح کی ضرورت پر پہلے اپنے ہاں جائزہ لیا جائے۔ یعنی دیکھا جائے کہ ملکی زبان کا کوئی ہم معنی لفظ پہلے سے کہیں موجود اور مستعمل ہے کہ نہیں۔ نہ ملے تو لفظی ترجمہ کیا جائے یا آکسیجن کی طرح اصل لفظ ہی کو رہنے دیا جائے۔ فرہنگِ اصطلاحات علمیہ میں زرد فارسٹ کا ترجمہ کیا گیا محفوظ جنگلات جو افسوسناک ہے۔ کیونکہ ٹینک یا آکسیجن کی طرح زرد فارسٹ ہمارے لئے نئی چیز نہیں۔ یہ پہلے سے ہے اور نہ صرف عرفِ عام بلکہ دفتری اصطلاح میں بھی اسے رکھ سکتے ہیں۔

اب تک جو کچھ کہا گیا اسم اور فعل پر حاوی ہے۔ ادبی زبان کا جہاں تک تعلق ہے نہ تو نفسیاتی اعتبار سے ہمارے ہاں اسموں کی کمی ہے اور نہ صفاتی پہلو سے۔ حروفِ جاریہ و معنوی بھی کافی ہیں فعل کا کوئی صیغہ ہمیں وضع کرنا نہیں ہے۔ ہمارا صرفِ کبیر ارادے اور وقوعے کے ہر پہلو اور زمانے کے ہر دقیقے کا صحیح ترجمان ہے۔ غرضکہ مفردات میں ہم کسی سے ہیٹے نہیں ہاں اس میں ترقی کی گنجائش ہر وقت ہے۔ دقت اور اختلاف جو آ کر پڑتے ہیں تو اسموں کی تذکیر و تانیث اور نتیجۃً افعال کی تذکیر و تانیث میں۔ اس بارے میں اگر ہم وہ کلیے اور صرف چند ضمنی قاعدے قرار دے دیں تو تمام خرابیاں اور اختلاف رفع ہوسکتے ہیں۔ وہ کُلیے یہ ہیں:۔ (۱) جس غیر ذی روح شے کے نام میں جمالی شان پائی جائے اسے مونث اور جس میں جلالی یعنی ہیبت ایذا دہی اور رعب کی کیفیت پائی جائے اسے مذکر قرار دیں (۲) جذبات احساسات یا افراد موجودات کے ناموں کے متعلق یہ ہونا چاہیئے کہ اُن کے مترادف یا قریب المعنی جو لفظ پہلے سے ہندوستانی یا ہندی وغیرہ میں ہیں ان کی جنسیت کا اتباع لازم سمجھا جائے بشرطیکہ عام رواج یا عورتوں کے استعمال کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا اور یہ بھی ہے کہ جو لفظ ہمارے نظریہ کے خلاف پہلے سے بالاتفاق ایک جنس میں رکھ دیا گیا ہے اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ شارٹ یا سکرٹ

جس جامہ میں ہو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ بعض الفاظ محض اپنی بناوٹ اور صوت کی شان کے تحت صنفیت قبول کر لیتے ہیں سنسکرت کے اکثر الفاظ اس صوتی جبر کے معمول ہیں۔ جیسے پتی سنسکرت میں مالک یا صاحب کو کہتے ہیں اس کا مونث ہے پتنی۔ مگر ہندوؤں میں لڑکیوں کے نام چندر پتی اور اندر پتی وغیرہ رکھے جاتے ہیں یہ یوں کہ ان کا صوتیاتی بہنا پا سرسوتی۔ لکشمی اور پاربتی وغیرہ سے ہے۔ اسی طرح گنگا۔ جمنا۔ مالا۔ چھالیا وغیرہ مذکر ہونے چاہیئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ——— متروکات کی لمبی فہرست بھی نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔ جس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔

انشا کے بارے میں بھی کچھ کہنا ہے اس لئے کلمات کا دفتر جو بے پایاں ہے بند کر دینا پڑتا ہے۔ اس سے پہلے مرکبات اور مشتقات کی نسبت ایک مختصر گزارش کرنی ہے۔ میں نے چند لفظ گھڑے ہیں یا یہ کہیئے کہ اخذ و تصرف سے ان کے ساتھ سلوک ہوا ہوں ان میں سے کچھ یہ ہیں :- دوابہ گنجم یعنی وہ ملک جو گنگا اور جمنا کے درمیان واقع ہے آپ جانتے ہیں یہ قطعہ نہایت اہم ہے۔ ہندکی اور ہندکی زبانوں کی تاریخ کے سلسلے میں اس کا نام باربار آتا ہے لیکن اس کے لئے ایک لفظ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ قم یعنی قبل مسیح اور بم یعنی بعدِ مسیح۔ میں پولی ٹیشین کو سیاس اور نفسیات یعنی سائیکولوجی کے ماہر کو نفاس کہتا ہوں۔ کلام میں بے ضرورت مغلق اور غریب الفاظ کی بھرمار کو قاموسیات اور شارٹ سٹوری کو افسانچہ کہتا ہوں۔ اسی طرح نیم گرم ارادہ۔ گلابی اصول۔ احولی نقطۂ نظر۔ عمر کا ڈھلوان حصہ۔ کایا بدل۔ استفساریہ۔ متوازیہ۔ اُمّ الوطن۔ لسان یعنی لنگوِاسٹ۔ خود بینی آملیت۔ وغیرہ ترکیبیں ہیں۔ تارید یعنی غیر زبان کے لفظ کو ضروری تصرّف سے اردو بنا لینا اور موزودہ لفظ جو اس طریق پر اردو بنایا گیا ہو۔ پھر ایسی ترکیبیں ہیں جیسے ادبی ناداری۔ ادبی تموّل۔ ادبی استبداد۔ ادبی سخت جان۔ ادھورا حافظہ اور ہر کبھی وغیرہ وغیرہ اب میں ایک بات کہ کر اس شق سے رخصت ہوتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی زبان ضرورتِ صحیحہ کے بغیر دوسری زبانوں کے کلمات اور مرکبات مستعار لینے کی عادی ہو جاتی ہے تو اس کی صرفی استعداد۔ اشتقاقی قوت اور اختراعی صلاحیت فنا ہو جاتی ہے اور وہ ادبی ناداری اور دریوزہ گری کی دُرگت کو پہنچ جاتی ہے۔

کلام

علم معانی کی کتابوں میں آیا ہے "الفصاحت یوصف بہا المفرد و الکلام و المتکلم" یعنی فصاحت کا تعلق کلمہ۔ کلام اور متکلم سے ہے یہاں ہمارا مطمحِ نظر صرف کلام ہے یعنی انشا کے لئے جملہ۔ اس سے پہلے کہ جملہ کی ساخت یا ترتیب کی نسبت کچھ کہا جائے۔ ضروری ہے کہ فصاحت کی جامع و مانع تعریف پیش کر دی جائے۔ جسے غالباً آپ سائنٹفک

حیثیت عطا فرمائیں گے۔ اور وہ یہ ہے۔

"فصاحت کلام کا وہ وصف ہے جو سامع یا قاری کے ذہن کو منشی یا متکلم کے ذہن کے قریب ترین پہنچا دیتا ہے"۔

بولتے یا لکھتے وقت ہماری انتہائی کوشش اس امر میں ہونی چاہیئے کہ پڑھنے یا سننے والے کو ہمارا ما فی الضمیر سمجھ لینے میں دقت اور پریشانی نہ ہو۔ آج کل اس کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے جملوں میں اس قدر بے ربطی ہوتی ہے اس طرح صلہ در صلہ وارد ہوتا ہے کہ ادھر تو اس کا مطلب سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اور اُدھر وہ جملہ اردو کا سا نہیں جنچتا۔ اوپرا اوپرا معلوم ہوتا ہے۔ ہماری انشا میں یہ ایک بہت بڑی بدعت آ کے پڑ گئی ہے ارشاد ہوتا ہے :۔

۲۰ ماہ حال کو ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جو بہ سرپرستیٔ انجمن فلاں زیر صدارت جناب الف ہوا تھا ادبی ضروریات کی نسبت جناب ب نے فرمایا کہ ......

آپ دیکھتے ہیں اس جملہ کی نوعیت خبریہ ہے۔ اور خبر میں سب سے اہم تقریر کرنے والے کا نام ہے اور پھر موضوع جس پر تقریر ہوئی۔ مقرر کا نام اور موضوع دریافت کرنے کے لئے سامع یا قاری کو دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ اس عرصہ میں اُس کا ذہن جانے کہاں کہاں ٹکریں مارتا پھرا کبھی قیاس کیا تقریر کرنے والا زید ہوگا کیونکہ وہ آج کل لاہور میں وارد ہے اور کئی لکچر دے چکا ہے کبھی اس کا ذہن حضرات ہر ہی جن کی طرف منتقل ہوا کیونکہ ان دنوں یہ موضوع بہت زوروں پر ہے۔ غرضکہ یہ خبریہ نہیں بلکہ سامع یا قاری کے صبر سعیٔ تجسس اور حسن ظن کا امتحان ہے۔ یہ بدعت اول اول انگریزی سے ترجمے کی بدولت اردو میں آفت کی طرح نازل ہوئی اور اب اسلوب کی سرشت بن بیٹھی ہے۔ لمبے لمبے پیچیدہ جملے۔ مغلق فقرے صلہ موصول کی بھرمار۔ اضمار قبل الذکر متعلقات کی بہتات اور بے ڈھنگا پن یہ عیوب بالعموم آج کل کی انشا کو پاگل کر رہے ہیں۔ جو بات کئی چھوٹے چھوٹے جملوں اور قریب الفہم فقروں میں کہی جا سکتی تھی اُسے ایک شیطان کی آنت جملہ میں لا کر گڈ مڈ کر دینا عہد حاضر کی انشا کا بڑا عیب ہے۔ اب دیکھئے وہی بات نہایت خوش اسلوبی سے یوں کہی جا سکتی ہے :۔

"جناب ب نے ایک جلسہ میں ادبی ضروریات پر تقریر کی جو انجمن فلاں کی سرپرستی میں ۲۰ ماہ حال کو جناب الف کی صدارت میں ہوا۔ لکچرار نے دوران تقریر میں کہا"۔۔۔۔

اب سامع یا قاری قیاس اور تلاش کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔ اُس کا ذہن اِدھر اُدھر سراسیمہ نہیں پھرتا۔ ہر بات

واقعہ کا ہر جزو صحیح نفسیاتی ترتیب میں اپنے وقت پر واضح ہوتا جاتا ہے۔ مگر لوگوں کا رجحان الفاظ کے ساتھ جملوں کو بھی مغلق بنا دینے کی جانب ہے۔ اس اندھی تقلید سے اردو کو پاک رہنا چاہیئے۔ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ انگریزی کا طرزِ انشا اردو کے اسلوب پر حاوی ہو کر اس کو بگاڑ رہا ہے۔ اس کا ملزم ہمارا اخباری لٹریچر ہے۔

افسانوں اور افسانچوں میں یہ بھی رواج ہو چلا ہے کہ قائل کے قول کو توڑ پھوڑ کر راوی کے توصیفی یا اضافی الفاظ سے پیوند کیا جائے۔ مثلاً ایک کہانی یا اس کی فصل اس طرح شروع ہوتی ہے:-

"میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا" حامد نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"تم تو کیا" محمود تیزی سے بولا "تمہارا پیر بھی ایسا کرے اور ضرور کرے"۔

زبان کا یہ خون کرنا شرمناک ہی نہیں افسوسناک ہے۔

کوشش کی جاتی ہے کہ ہر شعر یا ہر جملہ ٹھوس اور ٹھکی ہوئی زبان اور اسلوب میں ہو یعنی پڑھتے یا سنتے ہی سمجھ میں نہ آ سکے۔ لاگ لپیٹ۔ کھینچ تان۔ گرہ در گرہ اور پیچ در پیچ طرزِ بیان سے کام لیا جاتا ہے۔ شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کو مرعوب کر رہے ہیں اور اپنی فضیلت کا سکہ بٹھا رہے ہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں۔ وہ زبان کو بگاڑ رہے ہیں اور بس کسی موضوع کے لئے بھی مغلق بیانی کی ضرورت نہیں۔ موضوع جتنا زیادہ وسیع ہو اتنی ہی سہل نگاری اور صراحت چاہے گا۔ یہ کیا کہ اپنی دشوار پسندی سے اسے دشوار تر بنا دیا جائے۔

بعضوں کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ عربی فارسی الفاظ اور ترکیبیں لانے سے کلام کی دل پذیری اور زور بڑھ جاتا ہے۔ مگر وہ سخت مغالطہ اور جہالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ لغت بازی یا مغلق بیانی سے کلام کبھی سرسبز نہیں ہوا۔ ہر زبان کے اعلیٰ اور الطف ادب میں وہ کلام چوٹی کا سمجھا جاتا ہے جس میں دقّت یا اغلاق لفظی یا معنوی نام کو نہ ہو۔ بعض اساتذہ کے اشعار اس ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں جو بہی نہیں کہ ستّر یا بہتر نشتروں میں تیز تر ہیں بلکہ انہیں حاصلِ دیوان کہنا شاید درست ہو:-

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو، رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

میر صاحب کے اس شعر میں فارسی عربی کا ایک لفظ بھی نہیں۔ یہی حال ذوق کے اس شعر کا ہے:-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ناسخ کا یہ شعر بھی اسی قبیل سے ہے:-

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں، ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

مومن فرماتے ہیں :-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ، ٭ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مرزا غالب کا شعر ہے :-

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ٭ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فارسی عربی کے تین لفظ جو اس شعر میں آئے ایسے ہیں جنہیں اَن پڑھ اور گنوار بھی بولتا ہے - وہ لوگ جو لفظوں کے طلسم سے اپنی شاعری یا تصنیف کا گھروندا بنا کر خوش ہوتے ہیں انہیں جلد ہی مایوس ہونا پڑے گا - جاننا چاہیئے کہ غیر زبانوں کے جو لفظ اردو میں گھُل مل گئے ہیں - یا اس میں رچنے پچنے کی اہلیت رکھتے ہیں اُن سے اردو کے تموّل اور تزئین میں ایزادی ہوتی ہے لیکن محض لغات بازی یا قاموسیات سے اول تو زبان کا ستیاناس ہوتا ہے اور دوسرے متکلم مقبولیت حاصل کرنا تو رہا ایک طرف اپنے عندیہ کو سامع کے ذہن کے قریب پہنچنے میں مانع ہوتا ہے -

اس میں کلام نہیں کہ علمی زبان تغزل کی یا عام ادبی زبان سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوا کرتی ہے اور ایسا ہونا لازمی ہے - فرانسیسی لسّان برگسیں نے کیا خوب کہا کہ علمی زبان بمنزلہ ایک پپڑی کے ہے جو پانی کی سطح پر جم گئی ہو - اس کی نوعیت پانی کی نوعیت سے جداگانہ نہیں - وہ بھی انہیں اجزا سے بنی جن سے پانی بنا - ہاں خاص اسباب نے اس کی ظاہری شکل کو پانی کی شکل سے ممیّز کر دیا ہے - یہ ایسا ہی ہے کہ دو جمع دو مساوی چار - یہ تو ہوئی ریاضی کی علمی زبان - اور دو اور دو چار ہوتے ہیں یہ ہوئی معمولی ادبی زبان -

یہ کون نہیں مانے گا کہ مابعد الطبیعیات یا جرِ اثقال پر آبِ حیات یا فسانۂ آزاد کی زبان و اسلوب میں نہیں لکھ سکتے لیکن اس کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں میں وہی نسبت قائم رہے جو پانی اور پانی کی پپڑی میں ہے -

وقت کی قلت روکتی ہے ورنہ اب سے ساٹھ ستر برس پہلے کی علمی زبان کے نمونے پیش کئے جاتے جب کہ مغربی علوم سے ہم کو پہلے پہل روشناسی ہوئی تھی -

محاوروں کی ہمارے ہاں کمی نہیں - صنایع بدایع ضرورت سے زیادہ ہیں بلکہ تحسینِ کلام کی حد سے گزر کر کلام پر چھائے ہوئے ہیں - نظم میں اصنافِ مقررہ کی قید اور تعین اب باقی نہیں - یہ خوب ہوا - عروض میں کاٹ چھانٹ کی ضرورت بہت زیادہ ہے - بحور و اوزان اور قافیہ کے قواعد جو عربی زبان کے لئے مدوّن کئے گئے

بھتے مارشل لا کی طرح ہم پر عائد کئے گئے۔ ان کا نباہ نہ ہونا تھا نہ ہوا یہی نہیں بلکہ ان سے بغاوت اس جوش و خروش کی ہوئی کہ اب بیراہ روی کی آثار نمایاں ہو رہے ہیں مختصر یہ کہ اردو کو ضرورت ہے علمی لغات میں ایزادی او وضع اصطلاحات میں آزادی کی اور تصرّف کی۔ زبان کی صرفی تاریخ یعنی اشتقاق و لغت آفرینی کے طریق کو ہم بھول بیٹھے ہیں، اس بارے میں حافظہ کو تازہ کرنا ہے۔ قدما جو قواعد فصاحت کے باندھ گئے مثلاً تنافر حروف۔ غرابت اور مخالفت قیاسِ لغوی وغیرہ وغیرہ اُن میں بھی ترمیم اور نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ فصاحت کا اصلی عنصر جوانبساط بیان سے اردو میں اڑتا جاتا ہے اُسے روکنا چاہیئے یہ سب کچھ ہو لیکن اردو کی ذاتی لطافت مفقود نہیں ہو جانی چاہیئے۔ ہمارا فرض ہے کہ حریتِ لسان و حریتِ فکر کے وکیل ہوں کیونکہ تخیل نطق کے سہارے چلتا ہے۔ الفاظ کے بغیر تخیل ناممکن ہے۔ اس لئے حریتِ لسان حُریتِ فکر کی موئید ہے۔ اب یہ کہنا ہے کہ اردو کا نستعلیق ٹائپ نہ ہونا اسے دیسی زبانوں سے ہیٹا بنا رہا ہے امید ہے کہ اس پر گفت و شنود کا کبھی موقع دیا جائے گا۔ اور اس بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کے بعد ایک لائحہ عمل قرار پائیگا۔ اسی ضمن میں املا کے مسائل بھی بحث میں آجائیں گے۔ اردو کی پبلشنگ کمپنیوں کا نہ ہونا اس کی نشر و اشاعت میں مخل ہے۔ ہماری ضروریات میں ایک ضرورت اور بھی ہے جو کسی سے کم نہیں وہ ہے ارباب اردو کے اجتماعی مساعی کی یعنی مل کر کام کرنے کی صلاحیت جس کی زندہ نظیر امید ہے یہ آپ کی اردو سبھا ثابت ہوگی۔

آخر میں نہایت خلوص سے یہ گزارش ہے کہ اردو ہماری کفالت میں ہے۔ یہی نہیں کہ ہم اچھی نظمیں کہ کریا دو چار کتابیں لکھ کر خلقت کی واہ واہ لیں اور بس۔ ہمارا مطمح نظر وسیع ہونا چاہیئے۔ قدرت نے ہم پر کچھ فرائض بھی ڈالے ہیں۔ لازم ہے کہ ہم موجودہ حالات کا صحیح مشاہدہ کریں مستقبل میں جو ضرورتیں آنے والی نسلوں کی عارض حال ہونگی ان کا ٹھیک موازنہ کریں اور اردو کو ایسا بنا کر۔ اس کی ترقی کے ایسے رستے نکال کر چھوڑ جائیں کہ جو ہمارے بعد ہماری جگہ آئیں گے ان کے لئے کوئی قابلِ دفع اور ناگوار عوارض مانعِ ارتقا نہ رہ جائیں۔ کارِ دنیا کوئی تمام کرسکا یا نہیں۔ اس کو رہنے دیجئے۔ کوشش تکمیل کی کرنے جایئے اور ذاتِ باری کے اس ارشاد کو یاد رکھیے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ

برج موہن دتاتریا کیفی

طنزِ کامیاب

قہقہوں کی گونج، نغموں کا تلاطم، کیف و نور
نزہتیں جنّت کا پرتو، شادمانی کا سرور

ہر نفس میں نکہتوں کا ایک ہلکا سا گداز
روح کی گہرائیوں میں عشرتوں کا سوز و ساز

حسن، رعنائی، حلاوت، نوعروسانہ بہار
عیش، برنائی، مسرّت، موجِ کوثر کا خمار

عشرتوں کی چھاؤں میں دھندلا سا نورِ ماہتاب
طلعتوں کے سائے میں راتوں کی شیرینی کا خواب

اک ملائم، نرم رو، دلکش صباحت کا سہاگ
خود فراموشی، نشاطِ روح، مستی، رنگ، راگ

رس بھری انگڑائیوں میں جوبناؤں کی لچک
انکھڑیوں میں چاندنی جیسے ستاروں میں چمک

آرزوؤں کی روپہلی رو، تمنّاؤں کے پھول
انبساط و کامرانی کے درخشندہ اصول

زندگی کے راستوں پر کہکشانوں کا جمال
نغمے برساتا ہوا ہر گام پر سازِ خیال

خلد کی اک دلربا تصویر لیکن بے ثبات
یعنی کچھ رنگین خوابوں کی طلسمی کائنات

آہ! گو کچھ دن کا تو مہماں ہے اے عہدِ شباب
گردشِ ایّام پر ہے ایک طنزِ کامیاب

عدم

بیوقوف

کہیں ایک بیوقوف تھا۔

مدت تک وہ نہایت امن اور اطمینان کی زندگی بسر کرتا رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ افواہیں اس کے کانوں تک پہنچنے لگیں کہ ہر شخص اسے ایک جاہلِ مطلق تصور کرتا ہے۔

بیوقوف بہت شرمندہ ہوا، اور متفکرانہ انداز میں اِن ناخوشگوار افواہوں کا خاتمہ کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ آخر اس کے چھوٹے سے دماغ میں ایک خیال پیدا ہوا . . . . اور اس نے فوراً اس پر عمل کرنا شروع کر دیا

بازار میں اُسے ایک دوست ملا جو ملتے ہی ایک مشہور مصور کی تعریف کرنے لگا۔

بیوقوف نے کہا "واہ صاحب واہ! آپ اس دقیانوس کی تعریف کر رہے ہیں۔ اسے کون پوچھتا ہے . . . . آپ کو اتنی خبر بھی نہیں ہے مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی . . . . آپ زمانے سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں"۔

دوست ڈر گیا، اور فوراً بیوقوف کی رائے سے متفق ہو گیا۔

ایک اور دوست نے اس سے کہا "میرے خیال میں یہ ایک عجیب و غریب کتاب ہے! کل میں اسے پڑھ کر حیران رہ گیا۔"

بیوقوف نے جواب دیا "اجی رہنے بھی دو! تمہیں اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے شرم نہیں آتی یہ کتاب تو کسی کام کی نہیں ہے۔ اب ایسی کتابوں کا عہد گزر گیا۔ تمہیں معلوم نہیں ؟ زمانہ تو بہت آگے نکل چکا ہے"۔

یہ دوست بھی ڈر گیا، اور اس نے بیوقوف سے کہا "میرا دوست این این بے نظیر شخص ہے! حقیقی معنوں میں شریف آدمی!"

بیوقوف نے جواب دیا "وہ حرامزادہ! اُس کی شرافت مجھ سے پوچھو! اپنے تمام رشتہ داروں کو اس نے فریب دیا۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے۔ تم تو بسم اللہ کے گنبد میں پڑے رہتے ہو، تمہیں کیا معلوم۔ بھائی جان زمانہ کہیں کا کہیں نکل گیا ہے"۔

تیسرا دوست بھی ڈر گیا۔ اس نے بیوقوف کی بات مان لی اور اپنے دوست کو چھوڑ دیا۔ غرض کہ جس شخص یا

جس چیز کی تعریف بیوقوف کے آگے کی جاتی وہ ایسا ہی جواب دیتا۔

بعض وقت وہ نہایت طعن آمیز لہجے میں کہا کرتا "اچھا آپ اب تک بڑے بڑے آدمیوں کی سند لیتے ہیں!"

بیوقوف دوست اس کی نسبت کہا کرتے "بد اندیش اور حاسد ہے۔ ۔ ۔ مگر کس غضب کا دماغ پایا ہے!"

بعض کہتے "کتنا بڑا نقاد ہے! ایک جوہر قابل ہے!"

یہانتک کہ ایک رسالے کے ایڈیٹر نے اس بیوقوف کو اپنے تنقیدی حصے کی ادارت سپرد کر دی۔

بیوقوف ہر شخص اور ہر چیز پر ایک ہی نہج اور ایک ہی انداز میں تنقید کرتا چلا گیا۔

اب وہی شخص جو مستند ادیبوں کی مخالفت کیا کرتا تھا خود ایک مستند ادیب بن گیا، اور نوجوان اس کی عزت کرنے لگے اور اس سے ڈرنے لگے۔

مگر بیچارے نوجوان اور کرتے بھی کیا؟ اگرچہ عام طور پر کسی کی عزت کرنے کے لئے کوئی خاص مجبوری نہیں ہوتی، لیکن یہاں تو معاملہ ہی دگرگوں تھا۔ اگر کوئی اس کی عزت نہ کرتا تو وہ "زمانے سے بہت پیچھے رہ جاتا!"

سچ ہے بزدلوں کی دنیا میں بیوقوفوں کی خوب گزرتی ہے۔

(ترجنیف) **منصور احمد**

وقت گزرنے کے بعد

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ڈانٹے گیبریل روزیٹی کے پاس آیا اور اسے اپنی نقاشی اور مصوری کے چند نمونے دکھائے۔

اس کی سانسوں سے شراب کی بو نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ روزیٹی نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ یہ تصویریں مہمل اور ناقص ہیں۔ اور اس نے اس حقیقت کو بڑی ہشیاری اور خوبی کیساتھ اس آدمی سے بیان کر دیا۔

آنیوالے شخص نے تھوڑی دیر پس و پیش کیا۔ پھر تصویروں کا ایک اور لفافہ اپنی جیب سے نکالا اور اس کو دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ ایک طالب علم کی نقاشی کے نمونے ہیں۔ روزیٹی ان کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور اس نے کہا کہ جو طالب علم ایسی نقاشی کر سکتا ہے اس کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ اس شخص نے کہا "آہ جناب یہ میں ہی ہوں۔ بلکہ میں ہی یہ طالب علم تھا۔ آپ کے الفاظ نے میرے اوہام کی تصدیق کر دی۔ میں نے اپنے دماغ کی بہترین استعداد کو شیطان (میخواری) کے حوالہ کر دیا ہے۔

محشر عابدی بی اے

(ترجمہ)

شائیلاک

کے سامنے

شیکسپیئر کا عذرِ گناہ

یہ ۱۶۱۴ء کے موسمِ سرما کی ایک رات کا واقعہ ہے مسٹر ولیم شیکسپیئر جو اُن دنوں اپنے وطن سٹرٹفرڈ میں عزلت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ایک کمرے میں آتش دان کے سامنے نہایت مزے میں بیٹھے تھے۔ پہلو میں آتشِ سیال کا ایک شیشہ رکھا تھا اور پاؤں آتش دان کی مینڈ کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ بالکل تنہا تھے اور انہیں کسی ملاقاتی کی آمد کی توقع نہ تھی۔

اسی لئے جب انہوں نے اتفاقاً آنکھ اٹھائی تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آتش دان کے دوسری طرف مقابل کی بڑی کرسی پر سیاہ جُبّے میں ملبوس ایک معمر شخص بیٹھا ہے۔ اُس کی ڈاڑھی اور سر کے بال بالکل سفید ہو رہے تھے اور آنکھوں سے غیر معمولی ذہانت ٹپک رہی تھی۔ نگاہیں چار ہوتے ہی اُس کے لبوں پر کسی قدر غضبناک اور زہریلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس کے ساتھ ہی وہ استفہامیہ انداز میں پکارا "مسٹر شیکسپیئر؟"

مسٹر شیکسپیئر نے جو اس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے جواب دیا "جی ہاں! اس ہیچ میرز کو شیکسپیئر ہی کہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جناب کا اسمِ گرامی مسٹر شائیلاک ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اس سے قبل صرف تخیل ہی کی آنکھوں سے آپ کو دیکھا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کھائی۔"

بڈھے نے بہ طورِ اثبات سر جھکایا۔

پھر مسٹر شیکسپیئر نے کہا "کہئے غریب خانے پر کس طرح قدم رنجہ فرمایا اور اس خاکسار کو سرفراز فرمانے کا باعث کون مبارک امر ہوا؟"

مسٹر شائیلاک نے متانت سے جواب دیا "یہی تو عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اُس جہنم میں جہاں میں رہتا ہوں یعنی توہمات کی اُس دنیا میں جسے عظیم الشان دل و دماغ کے انسانوں نے پیدا کر کے زندگی سے اس قدر معمور کر دیا ہے کہ اب کبھی ہمارے مرنے کا امکان نہیں رہا میں ایک مدت سے اس ملاقات کا تہیہ کر رہا تھا۔ مسٹر شیکسپیئر سچ یہ ہے کہ مجھے آپ کو دو چار کھری کھری باتیں سنانی ہیں۔ معاف فرمائیے میرے دل میں برسوں سے آپ کے خلاف معاندانہ جذبات پرورش پا رہے ہیں۔"

مسٹر شیکسپیئر نے کہا "آپکی یہ باتیں سُن کر مجھے رنج پہنچا ہے لیکن فی الواقع آپ نے میرے جذبۂ تجسس کو بھی بیدار کر دیا ہے۔

سو جو کچھ جی میں ہے کہے جائیے میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

مسٹر شائیلاک۔ تو سنیئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ شائیلاک بنام انٹونیو کے مشہور مقدمے میں آپ نے مجھے نہایت بدفطرت اور جلاّد ثابت کر دکھایا، حالانکہ آپ خوب جانتے تھے اور سب سے بہتر جانتے تھے کہ جن لوگوں کو آپ نے ہیرو کے طور پر انتخاب کیا یعنی بسینیو، لورینزو اور گریشیانو وغیرہ وہ سب نہایت گندہ ذہن، اجڈ، جانگلو، چالباز، کمینے دجّال تھے۔

مسٹر شیکسپیر۔ صبر سے، حوصلے سے ——

مسٹر شائیلاک۔ ذرا میری جگہ اپنے آپ کو تصور کر کے غور فرمائیے کہ اس صورت میں آپ کا طرزِ عمل کیا ہوتا۔ روپیہ بلا معاوضہ قرض دے دینا، کیا یہ تاجرانہ مقابلے کے اصول کے مطابق ہے؟ خیر اسے تو جانے دیجئے۔ مجھے یہ بتائیے کہ اگر آپ سوداگر ہوتے اور آپ کا کوئی ہم چشم آپ کے ٹخنوں پر پاؤں کی ٹھوکریں رسید کرتا یا آپ کے چہرے پر تھوکتا تو کیا آپ اسے پسند کرتے؟

مسٹر شیکسپیر۔ (دھیمی آواز میں) نہیں۔

مسٹر شائیلاک۔ اور اگر لوگ آپ کو ملحد، خونی، اور کتا کہتے تو کیا آپ برداشت کر سکتے؟

مسٹر شیکسپیر نے پہلے ہی کی طرح نفی میں جواب دیا۔

اب مسٹر شائیلاک کی آواز بلند ہوگئی۔ انہوں نے کہا اور "اگر ایک بدنسل لونڈا آپ کی بیٹی کو بھگا لے گیا ہوتا۔ نہیں نہیں! بلکہ اس نے آپ کے روپے پر ہاتھ صاف کرنے اور آپ کی ایک ایسی انگشتری اڑانے کے لئے جس کی علیحدگی آپ کو کسی قیمت پر گوارا نہ ہوتی، اس لڑکی کو چور بنا لیا ہوتا تو؟

مسٹر شیکسپیر نے دوبارہ صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ بجا اور درست سہی لیکن وہ آدھ سیر گوشت" ——

مسٹر شائیلاک (جوش سے بات کاٹ کر) وہ آدھ سیر گوشت جو مجھے کبھی وصول نہ ہوا اور جس سے میں انتہا درجے کی پاجیانہ سخن سازی کے بعد محروم کر دیا گیا، مسٹر شیکسپیر معاف کیجئے یہ سب آپ ہی کا کیا دھرا ہے۔ اگر آپ میرے معاملے میں انصاف سے کام لیتے تو میں سر تا سر یہ مقدمہ جیت چکا تھا۔

مسٹر شیکسپیر۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

مسٹر شائیلاک۔ سنیئے نا! آپ کی پورشیا نے یہ قانونی نکتہ پیدا کیا تھا کہ مجھے اپنے آدھ سیر گوشت کے طلب کرنے کا حق تو حاصل ہے —— اس میں چون و چرا کی گنجائش نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی —— لیکن مجھے خون کے ایک بھی قطرے پر کسی قسم کا حق نہیں پہنچتا۔ لڑکی کی ہوشیاری ضرور قابلِ داد تھی لیکن آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ میرے پاس اس بات کا ایک قاطع جواب تھا۔

مسٹر شیکسپیر (تعجب سے آنکھیں اٹھا کر) قاطع جواب! وہ کیا؟

مسٹر شائیلاک۔ ہاں ہاں، قاطع جواب! اگر آپ جو میری سیرت سے خوب واقف تھے اسی کے مطابق مجھے اپنے قول و فعل کا مختار بنا دیتے تو میں نیاری کی وہ ترازو اور قصاب کی وہ چھری جس سے آپ نے عجب بے ڈھنگے طور پر مجھے مسلح کیا تھا فوراً ان کے حوالے کر کے جواب دیتا کہ "مجھے تو صرف اپنے آدھ سیر گوشت سے غرض ہے اور میرے اس مطالبہ کی صحت سے تمہیں انکار نہیں۔ اب گوشت کاٹ کر میرے حوالے کرنا میرا نہیں، تمہارا کام ہے۔ اگر تم خون کو محفوظ رکھنے کے خواہشمند ہو تو رکھو۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد! میں تو اس شرط کے ساتھ بھی مال وصول کرنے پر رضامند ہوں" مسٹر شیکسپیر! بتایئے مجھے وہ کیا خاک جواب دے سکتے تھے! میں ایک پٹے ہوئے گتے کی طرح عدالت سے نکلنے کے بجائے انہیں ناکوں چنے چبوا دیتا۔ آپ نے دنیا کے سامنے مجھے شیطان سیرت بنا کر پیش کرنے کی کوشش تو خیر کی ہی تھی لیکن اس کے ساتھ میرے قول و فعل کو نہایت مجہولانہ بھی بنا دیا۔ زیادہ شکایت تو مجھے اس بات کی ہے۔

مسٹر شیکسپیر۔ اس وقت آپ کی طبیعت بہت مشتعل ہو رہی ہے اور اس جوش کی حالت میں آپ سے یہ عرض کرنا شاید قرینِ انصاف نہ ہو کہ آپ کو کچھ میری مجبوری کا خیال بھی تو ہونا چاہیئے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ میں نے اس باب میں آپ کے کردار کی صحیح آئینہ داری نہیں کی لیکن لگی لپٹی رکھے بغیر میری صاف صاف گزارش یہ ہے کہ اگر آپ کے حسبِ مراد میں آپ کو اپنے اقوال و افعال کا مختار بنا دیتا تو اس صورت میں وہ یقیناً آپ کی فطری فراست سے ہم آہنگ ہو جاتے۔ اب للہ غور فرمایئے کہ اگر صورتِ حال یہ ہوتی تو میرا ڈراما کیا ہوتا؟

"آپ کے ڈرامے پر شیطان کی پھٹکار!" یہ الفاظ مسٹر شائیلاک نے اس جوش سے کہے کہ مسٹر شیکسپیر چونک پڑے ـــــ اور بیدار ہو گئے اور انہیں معلوم ہوا کہ یہ خواب تھا ـــــ

(ایچ۔ جی۔ ایس) ـــــ حامد علی خاں

تجلیات

سب کی نظر سے آپ نے مجھ کو گرا دیا | تنہا بنا دیا مجھے، یکتا بنا دیا
کھوٹا پڑا جہاں میں جو سودا ہر اک مجھے | سرمایہ اپنے عشق کا مجھ پر لٹا دیا
امیدِ ماسوا سے کیا صاف دل مرا | اور اپنی یاد سے اُسے روشن بنا دیا
تا مجھ سے کہہ سکیں کہ ترا مدعا ہوں میں | مجھ کو جو دل دیا بھی تو بے مدعا دیا
کس نے طیورِ صبح کو نغمے سکھا دیئے | سیلابِ نور کس نے چمن میں بہا دیا

"ح۔ ب"

خاتون

عام طور پر اس لفظ کے معنی جو لغت سے ملتے ہیں وہ ایک شریف عورت یا نیک عورت کے ہوتے ہیں لیکن کسی زمانے میں یہ لفظ صرف چینی ملکہ اور شہزادی کے لئے مخصوص تھا۔ پرانی چینی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ لقب چھٹی صدی میں ٹیوکین کی طرف سے خاقان کی بیوی کو دیا گیا تھا۔ اس کا چینی تلفظ اس وقت خو ہو تون تھا۔ چینی شہزادیاں جن کی شادی کسی خاقانی شہزادے سے ہو جاتی تھی۔ یکی خاتون کہلانے لگتی تھیں۔ طبری سرگزشتوں میں خاتون کا مطلب خاقان کی بیوی ظاہر کیا گیا ہے۔ ساسا بند بہرام گور کی حکومت میں ہمیں ایک خاتون کا پتا ملتا ہے جو ایک فتح کے بعد لونڈی بنا لی گئی تھی۔ خسرو پرویز ثانی کے عہد حکومت میں ایک خاتون نے بہت سے تحائف لے کر بہرام کیوبن کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔

اسلامی عہد حکومت میں ۲۸۰ھ یا ۸۹۳ء میں سمٰعیل بن احمد نے ترکی پر حملہ کر کے وہاں کے بادشاہ اور اس کی ملکہ خاتون کو گرفتار کر لیا۔ ترکی عربی لغات میں اس لفظ کو کاتین لکھا گیا ہے۔ عثمانی ترکی میں یہ کادین ہو گیا۔ عربوں نے اس لفظ کو خاتون ہی رکھا اور اس کی جمع خواتین بنالی۔

لفظ کاتین کا مطلب متاہل عورت لیا جاتا ہے۔ اس کا استعمال اب بھی خرگیزی، کمانی وغیرہ زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ ترکی لفظ کادین کے معنے ہیں شریف عورت۔

مصر میں ملوکی حکومت کے دوران میں خاتون کا لقب صرف ملکہ اس کی بیٹیوں، ماں اور بہنوں کے لئے مخصوص تھا۔

ذیل میں تاریخ سے ہمیں جو خاتون نام ملتے ہیں وہ درج کئے جاتے ہیں:۔

خاندانِ ایوبیہ میں (۱)۔ الملک العادل سیف الدین ابوبکر بن ایوب کی ماں کا نام خاتون تھا جس کا انتقال ۵۹۳ھ (۱۱۹۶ء) میں ہوا

۲۔ الملک الاشرف موسیٰ بن الملک العادل کی بیٹی کا نام جس کی شادی الملک المنصور محمد بن صالح سے ہوئی اس کا انتقال ۶۹۴ھ (۱۲۹۵ء) میں ہوا

دوسرے **خاندانوں میں** (۳) ملک رضوان کی بیٹی اور سلجوق توتوش بن الپ ارسلان کی نواسی جس کی شادی عطابیگ زنگی بن آک سنکور سے قبل ۵۲۳ھ (۱۱۲۹ء) میں ہوئی۔

۴۔ جناح الدولہ حسین کی لڑکی جس کی شادی ۵۳۱ھ میں عطابیگ زنگی سے ہوئی۔

۵۔ خاتون سفریہ جو سلجوق سلطان محمد ثانی کی دادی تھی اور سلطان سنجر کی ماں تھی اس کا انتقال ۵۰۵ھ یا ۱۱۲۱ء میں مرو کے مقام پر ہوا۔ ایرانی مورخین نے اس کو ترکان خاتون کے نام سے لکھا ہے۔ اس کا نام سفریہ اس وجہ سے پڑا کہ اس کی شادی ۴۷۰ھ یا ۱۰۷۸ء کی مہم میں ہوئی۔

۶۔ خاتون اسما ملک شاہ کی بیٹی تھی اس کی شادی ۵۰۲ھ یا ۱۱۰۵ء میں خلیفہ المستظہر باللہ سے ہوئی۔

محسن عبداللہ

دلِ دیوانہ

سنبلِ پیچاں سے گلشن میں اُلجھ پڑتا ہے تو
بے سبب بھی راہ چلتے سائے سے لڑتا ہے تو

گھر میں گھبراتا ہے تو، صحرا سے وحشت ہی تجھے
خلوت و جلوت ہر اک حالت سے نفرت ہے تجھے

آہ بھرتا ہے چمن میں، دشت میں روتا ہے تو
غنچہ ہے، لیکن شگفتہ ہی نہیں ہوتا ہے تو

خار سے تجھ کو خلش ہے گُل سے تیری لاگ ہے
تیری ہستی بھی دلِ وحشی عجب کھٹراگ ہے

ہائے کس سے کس جگہ لے جا کے بہلاؤں تجھے
تو سمجھتا ہی نہیں میں کیسے سمجھاؤں تجھے

فہیم بیگ چغتائی

مسولینی اور فاسیّت

(۳)

میں نے کہا "آپ کا خیال ہے کہ دنیا کے اقتصادی بوجھ کا ایک بڑا حصہ عورت کو اُٹھانا پڑے گا؟"

"بے شک"۔

"اگر یہی بات ہے تو آپ یا کوئی اور اس حقیقت سے کیوں کر انکار کرسکتا ہے کہ عورت کا مرتبہ بالکل مرد کے برابر ہے؟"

"میں عورت کے سیاسی اثر کو بڑھانے سے نہیں ڈرتا۔ بعض اندیشہ پرستوں کو خوف ہے کہ عورت کی سیاسی طاقت میں افزونی دنیا کو ایک مصیبت میں گرفتار کردے گی۔ مجھے اس سے انکار ہے"۔

"عورت کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم کس صدی میں سے گزر رہے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی صدی میں سے۔ تو پھر ہمیں اس مسئلے کو اپنی صدی کے فیشن کے مطابق حل کرنا چاہیئے نہ کہ اُس صدی کے فیشن کے مطابق جسے گزرے مدتیں ہوچکیں۔

"میں اس بحث میں زیادہ فائدہ نہیں دیکھتا کہ آیا عورت کا رتبہ مرد سے کمتر ہے یا بلند تر۔ اس لئے کہ عورت اور مرد میں بڑا اختلاف ہے۔

"عورت کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ اُس سے مرد کی اُس استعداد کا اظہار نہیں ہوتا جسے ترکیب کہتے ہیں، اور وہ کوئی بڑی تخلیقی صنّاع نہیں ہے۔ دوسری طرف بداہت کو میں نے ہمیشہ عقل و فہم سے ایک لطیف تر صفت سمجھا ہے۔

"عقل و فہم کا مظاہرہ تو ایک گھوڑا بھی کرسکتا ہے لیکن بداہت ایک عورت ہی کا حصہ ہے۔ لیکن یہی بداہت اس کو سیاسیات اور سیاسیّین کے نزدیک زیادہ ناقابلِ اعتماد ٹھیراتی ہے۔ اگر دنیا کی تمام عورتوں کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہوجائے تو مجھے امید نہیں کہ اُن میں سے نصف سے زیادہ عورتیں ایسی نکل سکیں جو اپنے اس حق کو استعمال میں لائیں"۔

میں نے کہا "حق سے فائدہ اٹھانا نہ اٹھانا عورتوں کا اپنا معاملہ ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آپ کے قول کے مطابق فاسیت عمومیت کے مرادف ہے تو ایک عمومیہ کیونکر مرد عورت کی کامل مساوات کا انکار کر سکتی ہے"

مسولینی نے جواب دیا "عورتوں کو رائے دینے کا مسئلہ عمومیہ یا خصوصیہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ اس کا ثبوت چاہیں گے؟ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے ملکوں میں سب سے بڑھ کر عمومیت پسند ملک سوئٹزرلینڈ ہے۔ اور سوئٹزرلینڈ نے بھی عورتوں کو رائے دینے کا حق نہیں دیا۔

"میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ سپین ایک شدید مذہبی، ایک مغرور خصوصیت پرست اور اپنی قدیم روایات کا ایک زبردست حامی ملک ہے لیکن اس پر بھی اُس نے عورت کو رائے دینے کا حق دیا ہے اور وہاں اِس کی وجہ سے معاشرہ پر کوئی تباہی نہیں آئی۔

"مجھے عورتوں کے حقِ رائے دہی پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں اس کو بہت ضروری نہیں سمجھتا۔ صرف عورتوں کو رائے دینے کا حق مل جانے سے دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔ کیونکہ مردوں سے مختلف ہونے کے باوجود وہ ہم سے مختلف نہیں۔ مرد عورت دونوں کے لئے حقِ رائے دہی سے زیادہ اہم ذاتی تربیت ہے، ایک مقصد کے لئے زندہ رہنے اور مرنے کی قابلیت ہے بیسویں صدی کی انسانی تاریخ اس سے بحث نہیں کرے گی کہ مرد اور عورتیں کس طرح رائے دیتے ہیں۔ وہ بتائے گی کہ وہ کیا کرتے ہیں"۔

میں نے پوچھا "فاسیت سے دنیا کی تہذیب کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟"

مسولینی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے جواب دیا "فاسیت انسان کو تاریک راہوں سے نکالتی ہے یہ سرمایہ اور محنت کو ایک نئی ترکیب سے ملاتی ہے سرمایہ اور محنت مملکت کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو گئے تھے۔ پارلیمانی حکومت کی مثال اُس بے بس نرس کی سی تھی جس کے اختیار سے شریر بچے نکل گئے ہوں۔ اس وقت فاسیت آگے بڑھی "سوسائٹی فصاحت کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔ فاسیت زمانۂ حاضرہ کو آزادخیالی کی طفلانہ کہانیاں چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے۔ بے معنی جھگڑوں اور خودغرضیوں کی بجائے اس نے تنظیم پیدا کی ہے۔ دنیا نئی قسم کی تنظیم کے لئے فاسیت کی رہین منت ہے۔

"جو کام حقیقت میں فاسیت نے کیا ہے وہ انتظامی طاقت کا استحکام ہے۔ آپ کا دستور مزاحمت اور توازن پر عمل پیرا ہو کر محکمۂ انتظامیہ کے اختیارات کو اعتدال پر رکھتا ہے۔ مگر اٹلی کو شامل کر کے یورپ کے بہت سے ملکوں میں محکمۂ انتظامیہ پارلیمانی تفرقوں کی آماجگاہ بن گیا تھا میں اس حد تک قیصر سے متفق ہوں کہ مملکت کا سردار سب کا نمائندہ ہے،

کسی ایک جماعت کا نہیں۔

"کسی حکومت کا محکمۂ انتظامیہ بے دست و پا نہیں ہونا چاہیئے۔ محکمۂ انتظامیہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کام کرنے اور کرانے اور پیش ناموں اور تدبیروں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ کسی حکومت کی کتنی ذلت ہے کہ اُس کا محکمۂ انتظامیہ اختیار سے محروم اور عمل کے ناقابل ہو؟

محکمۂ انتظامیہ کو حکومت میں دوبارہ ایک ایسی جگہ دینا جس کا وہ حقدار تھا ہمارا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ انتظام کی استعداد قومی زندگی کی نمائندہ اور قومی ارادے کی قوت کا ثبوت ہے۔ محکمۂ انتظامیہ کو ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کو حل کرنے پڑتے ہیں۔

"یہ انتظامی قوت جو قومی فرمانروائی کا نشان ہے حکومت کے کسی دوسرے شعبے کے پاؤں تلے نہیں روندی جا سکتی۔ حکومت کے کل پرزوں کو حرکت میں رکھنا اور اُس کی حفاظت کرتے رہنا اسی قوت کا کام ہے۔

"کسی مملکت میں نظامِ انتظامیہ کو کبھی ایسی سطح پر نہیں لایا جا سکتا کہ وہ تُوتُپلیوں کا ایک کھیل بن جائے اور لوگ پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس کے تار ہلایا کریں۔

"یہ ہے فاسیت کا عقیدہ، اور اِس عقیدہ کو فاسیت نے ایک مسلّمہ حقیقت ثابت کر دیا ہے"

---

(۴)

میں نے کہا "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے انداز میں فاسیت بھی اتنی ہی انقلاب پرور ہے جتنی کہ بالشویت تھی"۔

مسولینی نے فوراً جواب دیا "آپ درست کہتے ہیں۔ اٹلی کے سامنے بالشویت اور فاسیت دو مسلک تھے۔ اُس نے فاسیت کو انتخاب کر لیا۔ فاسیت نئی نئی راہیں نکال رہی ہے۔ انقلاب میں یہ طاقت نہیں ہے۔ ایسے لوگ جنہیں قسمت نے انقلابی ذہنیت عطا کی ہے اُن فوجی سرداروں ہی کو پسند آسکتے ہیں جو میدانِ جنگ میں کام کر رہے ہوں۔ انقلاب اور جنگ دو ایسے لفظ ہیں کہ ان کا منشا تقریباً ایک ہے"۔

مسولینی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے اور ایک ایک لفظ کو آہستہ آہستہ اور تول تول کر ادا کرتے ہوئے کہا "فاسیت حقیقت پر مبنی ہے۔ بالشویت کی بنا نظریاتی ہے۔ ہم کیا چاہتے ہیں؟ ہم قطعیت اور حقیقت چاہتے ہیں۔ ہم بحث اور نظریے کے ہوائی قلعوں میں سے نکل کر فاسیت کی مضبوط چٹان پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔

"ہم نظریوں کو انجامِ کار ہمیشہ حقائق میں تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ورنہ سفرِ زندگی کو ہم بھی انہیں سپہ سالاروں کی سی فرد مائگی کے ساتھ طے کریں جو اپنی فوجوں کو صفحۂ قرطاس پر حرکت دیتے رہتے ہیں ہمیں بھی ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جو ایک میز پر بیٹھ کر اپنی فوج کا تعین ایک نقشے پر پن لگا لگا کر کیا کرتے ہیں"۔

"یہ سپہ سالا ہمیں اُس وقت سوئیاں چبھویا کرتے تھے جب ہم سپاہی لوگ خندقوں میں بیٹھ کر اپنا راشن کھانے پر مجبور تھے۔ جب ہم اِن پن ٹھونکنے والے سپہ سالاروں سے کہتے تھے کہ اب وقت ہے کہ نقشے کو دیوار کے ساتھ ٹانگ دیا جائے اور خود میدان میں نکلا جائے تو وہ اِس راہ کی مشکلات کو سوچتے تھے، وہ شکست کی مصیبت کا خیال کرتے تھے، خندقوں کی پرصعوبت زندگی کو دیکھتے تھے اور رُک جاتے تھے۔

"انسانوں کے پرکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ کمزور لوگ خیال کو عمل میں تبدیل نہیں کر سکتے، وہ کسی تجویز کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنا سکتے۔ زبردست وہ ہیں جو سوچنے کے ساتھ ہی عمل بھی کرتے ہیں۔

"جب دو عناصر میں اختلاف پیدا ہو جائے اور اُن کی کشمکش ثابت کرے کہ اب ان کا ملاپ کسی صورت نہیں ہو سکتا تو اس کا واحد علاج جبر ہے۔

"میرے نزدیک جبر اصولی طور پر میانہ روی ہے لیکن جبر کی قوتوں کا استعمال اُن تجربہ کار لوگوں ہی کو سزاوار ہے جو اپنی کوششوں کو صحیح راہ پر لگا سکیں۔ جبر راضی ناموں سے زیادہ اخلاقی چیز ہے۔ یہ امر کہ جبر کسی بلند مقصد کے لئے جائز ہے اس بات کو ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ لوگ جو جبر کا استعمال کریں بلند اخلاق رکھتے ہوں، اور ذاتی مفاد اُن کے مدِ نظر نہ ہو۔ جب ہمیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے جو سادہ لوح ہوں اور راست باز یا محض جاہل ہوں یا دیوانے تو ہمیں جبر سے پرہیز کرنا لازم ہے"۔

"جبر کے اُن جرائم کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں جو فسیسٹوں سے منسوب ہیں؟"

"سیاسی ارتقا کی طرف قربانی اور مظلومیت کا شکار ہوئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس راہ میں چند غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ ایسی غلطیاں اگر سرزد ہو جائیں تو فاسیت کے اصولوں کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ کبھی کبھی تو مقدس ترین لڑائیوں میں بھی ظلم کا کوئی نہ کوئی فعل سرزد ہو جاتا ہے۔ فیسیٹوں کو سیہ پوش کہا جاتا ہے لیکن آپ یقین کیجئے وہ سیہ دل نہیں ہیں۔ سیاہ قمیص کا پہننا کسی ایسے شخص کو زیب نہیں دیتا جس کا دل سفید نہ ہو"۔

میں نے کہا "سنا ہے کہ آپ کی اپنی افواج میں نااتفاقی پھیلی ہوئی ہے۔ کیا اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ آپ نے دوسری تمام جماعتوں کو قطعاً موقوف کر دیا ہے"

"نااتفاقی کہیں نہیں ہے۔ ہمارا ایمان ضابطے میں ہے ہم یہ ضابطہ نہ صرف دوسروں ہی پر عائد کرتے ہیں بلکہ اپنے اوپر بھی عائد کرتے ہیں

نیسیٹوں کی جماعت میں اتنی یک جہتی اور یک دلی کبھی پیدا نہیں ہوئی جتنی کہ آج ہے۔ اور آج وہ ایک اکائی بنی ہوئی ہے۔

میں نے اُن چھ ہونے والے خونیوں کا خیال کر کے جنھوں نے مسولینی کی جان لینے کی کوشش کی تھی کہا "کیا حد سے زیادہ طاقت کو ایک شخص کی ذات میں مرکوز کر دینا خطرناک نہیں ہے؟ اگر وہ شخص مرجائے تو ساری عمارت گر پڑتی ہے"۔

مسولینی نے کہا "ہر بڑی تحریک کا ایک نمائندہ ہونا چاہیئے۔ اور اس نمائندے کو اس تحریک کے تمام صدمے سہنے اور اس کے تمام اندیشے برداشت کرنے چاہئیں۔ اُسے اُس کی آگ میں جلنا چاہیئے اور اپنی جان کو کھونا چاہیئے۔

"فیسیسٹ انقلاب کا جھنڈا ابھی میرے ہاتھوں میں ہے اور میں اسے تمام مزاحمت کرنے والوں کے خلاف بلند رکھوں گا خواہ مجھے اس کے عوض اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے اور اپنا خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے۔

"لیکن میں فاسیّت نہیں ہوں۔ میں صرف اُس کی زبان ہوں۔ کُل اپنے ہر جزو سے بڑا ہوتا ہے۔ فاسیّت مسولینی سے بڑی ہے۔ میرا کام میرے بعد بھی زندہ رہے گا"۔

---

(۵)

بنیٹو مسولینی نے کہا "صحت اُن لوگوں کے لئے ہے جنہیں معلوم ہے کہ اسے کیونکر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب ایک مرتبہ کوئی اسے حاصل کر لیتا ہے تو اسے جاننا چاہیئے کہ اسے کیونکر برقرار رکھا جائے"۔

اپنے محل میں جہاں اس کا دفتر ہے مسولینی نے مجھ سے کہا "فاسیّت جسمانی صحت کا مذہب ہے۔ ہم ضابطے کے قائل ہیں، اور کوئی ضابطہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اُس کے ساتھ کامل دماغی، اخلاقی اور جسمانی امداد شامل نہ ہو۔

"میں نے بارہا سوچا ہے کہ تہذیب قدیم کے کارہائے نمایاں خصوصاً قدیم یونان اور قدیم روما کے کارنامے مورخینِ عالم کے اندازے سے بہت زیادہ حد تک ایک سلیم جسم میں ایک سلیم قلب پر منحصر تھے۔ قدما نے کبھی ایک سلیم قلب کے خیال کو ایک سلیم جسم سے علیحدہ نہیں کیا جیسا کہ ہم اکثر کرتے رہتے ہیں"۔

پھر اُس نے اپنے چست فراک کوٹ کے نیچے بلا ارادہ اپنے عضلات کو تانتے ہوئے کہا "میں خود باقاعدہ ورزش کرتا ہوں۔ میں حکومت کے کاروبار کو بھی اپنی ورزش میں حارج نہیں ہونے دیتا۔ میں گھوڑے کی سواری کرتا ہوں، میں ہوائی جہاز میں اڑتا ہوں، میں موٹر چلاتا ہوں، میں شکار کرتا ہوں، میں تیرتا ہوں اور میں پہاڑوں پر چڑھتا ہوں۔ پہاڑ پر چڑھنے میں میرا خیال ہے تقریباً ہر قسم کی ورزش آجاتی ہے۔ جسم کے ہر پٹھے پر اس کا اثر پڑتا ہے۔

میں اُن لوگوں کو پہاڑوں پر چڑھنے کی نصیحت کروں گا جو اس کے خطرات برداشت کرنے کے لیئے تیار ہوں — ہر شخص کو نہیں "۔

مسولینی نے فخریہ لہجے میں کہا "لیکن میں ہر شخص کو کسی نہ کسی قسم کی ورزش کی ہدایت کرتا ہوں۔ کیا آپ نے روم کے باشندوں پر نگاہ ڈالی ہے؟ خمیدہ کمریں آپ کو کہیں نظر نہ آئی ہوں گی۔ ہم نے اپنے نوجوانوں کی کمریں مضبوط کردی ہیں اُن کی آنکھیں اور دل بھی مضبوط ہیں۔ فاسیت نے اٹلی کے نوجوانوں کو جسمانی صحت کی قدر و قیمت کا اندازہ کرادیا ہے۔ ہم اُن کو سکھا رہے ہیں۔ کہ انہیں کس طرح سانس لینا، کس طرح اٹھنا بیٹھنا اور کس طرح اپنے جسم کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ کیا آپ نے ہمارے بچوں میں تبدیلی کو ملاحظہ کیا ہے؟"

مسولینی نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا "ورزش ہوشمندی، قوتِ فیصلہ اور تحریکِ عمل پیدا کرتی ہے جسمانی تربیت سے اُسی قدر سیرت کی تربیت بھی ہوتی جس قدر عضلات کی تربیت ہوتی ہے۔

"میں تو یہاں تک کہوں گا کہ دنیا کے عظیم ترین مصلح کی انتہا درجہ ذہنی تعلیم بھی ورزش ہی کی ایک شکل ہوتی ہے یہ ورزشیں دماغی ہوسکتی ہیں لیکن اُن کی قدر اُس قابلیت میں باقی رہتی ہیں جو ایک ہم قدر سلسلہ حرکات کو ظہور میں لانے والی ہو۔

"میں شکر گزاری کے ساتھ اس امر اظہار کرتا ہوں کہ فاسیت کے پیرو اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے اتنا کام لیتے ہیں کہ اُن کے جسم پھول کر بے ڈول نہیں ہوگئے۔ اُن میں ابھی چھریرا پن باقی ہے۔ اُن کے پٹھے مضبوط ہیں۔ اٹلی کا شباب اُن کے دم سے ابھی قائم ہے اور اُن کی اس خوش نصیبی کا سہرا ورزش کے سر ہے۔"

مسولینی مزدوروں کو شہر کے ناصاف محلے چھوڑنے اور مضافات میں آباد ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ اُس کے متبعین کے قول کے مطابق وہ اٹلی کو پھیپھڑے بہم پہنچا رہا ہے۔ اُس نے جسمانی تعلیم کو سرکاری مدارس میں لازم قرار دینے کے لیئے احکام جاری کر رکھے ہیں۔ لیکن اُس کی رائے میں مدرسہ صرف ایک آغاز ہے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد فرد کا اپنا فرض ہے کہ وہ جسمانی طاقتوں اور روحانی قوتوں کو بڑھاتا رہے۔

اُس نے کہا "فیسسٹ حکومت مدارس سے متعلق تمام کلبوں کو جو ورزش کے لئے قائم ہیں ہر ممکن امداد دے رہی ہے جسمانی تعلیم سے کسی طرح بھی بے التفاتی نہیں برتی جاتی۔ نوجوان طالب علموں پر مدرسوں میں اس کی اہمیت اچھی طرح واضح کی جاتی ہے۔ والدین کو یہ خیال ذہن نشین کرانے کے لئے کہ جسمانی تعلیم لڑکے کی تضیع اوقات کا باعث نہیں ہر کوشش عمل میں لائی جاتی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جسمانی تعلیم بچے کو آئندہ زندگی میں بڑی بڑی مشکلات

سے نجات دلاسکتی ہے "۔

میں نے دریافت کیا "کیا اعلیٰ حضرت عورتوں کی جسمانی تربیت پر بھی اتنا ہی زور دیتے ہیں جتنا کہ مردوں کے معاملے میں دے رہے ہیں ؟"

مسولینی نے جواب دیا "ہاں، یقیناً - میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جسمانی تربیت عورتوں کو زیادہ شوخ ڈھنگ بنا دیتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی جسمانی ورزش سے عورتوں میں کوئی ایسی بات پیدا ہوجاتی ہو جو اُن کے حسن یا اُن کی دلربائی میں کمی پیدا کر دیتی ہو"۔

مسولینی قوت کا قائل ہے۔ وہ عقل کا بھی قائل ہے، لیکن اُسی صورت میں کہ یہ کسی نہ کسی شکل میں دنیا کو فائدہ پہنچا سکے۔ دونوں کا امتزاج نہایت اعلیٰ نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

اُس کا قول ہے کہ دنیا کے بہترین فلسفی جسمانی تعلیم و تربیت کے علم بردار تھے۔ یہ خیال اُن لوگوں کے عقیدے سے مل جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت مسیح جسمانی صحت کے بہت بڑے معلم تھے۔ اس کے ثبوت میں وہ یہ واقعات پیش کرتے ہیں کہ بانیٔ مسیحیت چلنے لگتے تھے تو پہروں چلا کرتے تھے، لوگوں کا علاج دوا کے بغیر کرتے تھے اور جنگل میں جا کر چالیس چالیس دن کا روزہ رکھتے تھے۔

مسولینی کہتا ہے "اگر وہ لوگ جو کسی قوم میں ذہنی خصوصیت کے دعوےٰ دار ہیں جسمانی تعلیم کے سلسلے میں اپنی مثال پیش کریں تو باقی سب اُن کے نقشِ قدم پر خود بخود چلنے لگیں گے۔

"سچ یہ ہے کہ اگر ہم نہایت احتیاط کے ساتھ اُن شخصیتوں پر نظر ڈالیں جو زمانہ ہائے قدیم سے ورزش کے ذریعے اپنے اجسام کی تربیت کرتے رہے ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ بہترین فلسفی، زبردست مفکر اور اعلیٰ درجے کے معلم سب کا مسلک جسمانی صحت رہا ہے۔ یہ غلط ہے کہ علمی مذاق جسمانی تربیت کا مخالف ہوتا ہے۔ سقراط کے زمانے سے لے کر آج کے زمانے تک دنیا کے فلسفیوں کی زندگیاں اس امر کی شاہد ہیں"

---

(۶)

مسولینی کہتا ہے "جو کچھ تمہیں دینا ہے اگر ممکن ہو تو محبت کے ساتھ دو، اور اگر ضروری ہو تو جبر کے ساتھ دو، لیکن اِس جبر کی رہنما بھی محبت ہی ہونی چاہیئے، جس طرح ایک بادل کے پیچھے سورج چمکتا رہتا ہے۔

"یہی نسخہ ہے جس پر فاسیّت کی کامیابی کا انحصار ہے تعلیم کا راز بھی یہی ہے۔

"وہ آدمی جس کا پہلا اصول ضابطہ ہے یقینی طور پر تعلیم و تربیت کا رتبہ بلند کرتا ہے۔

"بہت سی دست بدست لڑائیوں کا فتح کرنا اور ایک بڑی جنگ کا فتح کرنا بالکل یکساں تو نہیں ہوتا لیکن دست بدست لڑائیوں میں ہار کر کبھی کسی نے کوئی بڑی جنگ فتح نہیں کی۔ جنگ کو سپہ سالار فتح کرتا ہے۔ لیکن دست بدست لڑائی میں فتح سپاہی ہی کی تلوار سے ہوتی ہے۔ اگر آپ جنگ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ جہاں ایک جنگ ایک کمانڈر کی قابلیت سے فتح ہوتی ہے وہاں وہ ایک سپاہی کی ناقابلیت سے ہر بھی جاتی ہے۔ یہ کہاوت سچ ہے کہ جنگ کی کامیابی آزمودہ کار سپاہیوں پر ہے اور اس کی ناکامی کی وجہ ناتجربہ کار رنگروٹ ہوتے ہیں۔ تربیت ایک نہایت ضروری چیز ہے۔

"لیکن ایک تربیت ایسی ہوتی ہے جو سنوارتی ہے اور ایک تربیت ایسی ہوتی ہے جو بگاڑتی ہے۔ جب ہم سنتے ہیں کہ فلاں نوجوان ناکام رہا تو ہمارے دل میں پہلا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس کی تربیت کیسی ہوئی تھی؟ اُس کے استاد کون لوگ تھے۔ تعلیم کا مسئلہ درحقیقت استادوں کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔"

میں نے دریافت کیا "آپ کے خیال میں نئی پود کو تعلیم دینے کے لئے غیر معمولی استاد کہاں پائے جاتے ہیں؟"

مسولینی نے جواب دیا "مجھے غیر معمولی استادوں کی تلاش نہیں۔ مجھے صرف قابل استادوں کی تلاش ہے۔ فاسیزم کی کوشش انفرادی اعتلا نہیں بلکہ ایک عمومی اوسط ہے۔"

"کیا آپ اپنے مدارس میں تعلیم کا معیار بلند کر رہے ہیں؟"

مسولینی نے جواب دیا "ہماری توجہ صرف مدارس کی طرف نہیں ہے بلکہ تھیٹر، ایوانات موسیقی، عجائب خانے، سب ہمیں تعلیم میں مدد دیتے ہیں تعلیم فضیلت کی سند حاصل کرتے ہی ختم نہیں ہو جاتی۔

"سیکھنے والے کے لئے ہر چیز مدرسہ ہے۔ پھر کیوں نہ ہم سیکھنے والے بنے رہیں، اور عجائب خانوں، تھیٹروں، گانوں اور تصویروں کو دیکھیں سنیں اور ان کی قدر کریں۔

"یہ چیزیں تعجب کے اظہار کے لئے یا جدت پسندی کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے یا سنسنی پیدا کرنے کے لئے نہیں ہیں خواہ ان سے یہ سب باتیں ظہور میں آئیں۔ یہ مکتب کی مختلف شکلیں ہیں تعلیم کے مختلف ذرائع۔ ان سے ذوق، آنکھ اور روح کو تعلیم ملتی ہے۔ یہ تخیل کو زندہ کرتی ہیں۔

"عوام کے لئے تعلیم کا مسئلہ انہیں چیزوں کے ذریعہ سے حل ہوگا۔

"آرٹ تعلیم کا ایک اہم ترین جزو ہے۔

"اطالوی بہ آسانی کہ سکتا ہے کہ آرٹ اُس کی میراث ہے اُس کا گھر ہے۔ تمام اطالوی بھائی بھائی ہیں۔ کیونکہ آرٹس نے انہیں ایسا ہی بنایا ہے۔ آرٹ آج زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ آرٹ ایک غلام ہے۔ آرٹ کو تجارتی ڈاکو کے حریص پنجوں سے آزاد کرانا چاہیئے۔ وہ اُس کے بلند مقصد سے آشنا نہیں ہے۔

"ایک بات جو دورانِ تعلیم میں ——— خواہ وہ تعلیم اخلاقی ہو یا ذہنی یا جسمانی ——— ہر موقع پر مدِنظر رہنی چاہیئے تعلیم کا مقصد ہے۔

"تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو۔

"ایسی تعلیم دینا مشکل ہی کیا ہے جو انسان کو بہترین حالات میں رہنے کے قابل بنائے۔ وہ تعلیم جس کی بناء اِس نظریہ پر ہو کہ سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا صحیح معنوں میں تعلیم نہیں ہے تعلیم وہ ہے جو ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم اُن باتوں کا انسداد کر سکیں جو درست نہیں ہیں۔

"یہ خیال قدیم ہے لیکن اس وجہ سے ہم اسے رد نہیں کر سکتے۔

"ایک دن فیلقوسِ اعظم شاہِ مقدونیہ نے تین خبریں سنیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اُس نے یہ سب ایک ہی دن سنیں۔

"پہلی یہ کہ اُس کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔

"دوسری یہ کہ اُس کے ایک سپہ سالار نے ایک خطرناک دشمن کو شکست دی ہے۔

"تیسری یہ کہ اولمپک کھیلوں میں خود فیلقوس کو ایک شاندار فتح نصیب ہوئی ہے۔

"فیلقوس اِن خوشخبریوں کو سنکر سخت متاثر ہوا، اور اُس نے دعا کی: اے میرے خدا، جلد مجھ پر تھوڑی سی مصیبت بھی نازل کر!

"اِس دعا میں ایک نہایت دانشمندانہ خیال پنہاں ہے۔ یہ مصیبت ہی ہے جو ہمیں محسوس کراتی ہے کہ ہماری تعلیم و تربیت کیسی ہوئی، ہمارے اوصاف کا کیا درجہ ہے، اور ہم نے کس حد تک اپنے آپ کو زندہ رہنے اور تکالیف برداشت کرنے کے قابل بنایا ہے۔

"زندگی کے لئے ہماری تیاری ایسی ہی کامل ہونی چاہیئے جیسی جنگ کے لئے ہوتی ہے۔ میرے دل میں اس علم کی کچھ زیادہ عزت نہیں ہے جو عمل میں منتقل نہ ہو سکے"۔

مسولینی کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ایک منٹ کے لئے اس کی باہیں نپولین کے انداز میں پُشت کے

پیچھے بندھی رہیں۔

پھر اُس نے کہا "بڑے بڑے فلسفی جتنی دیر میں ایک سوال کو حل کر سکتے ہیں اتنی ہی دیر میں ایک درجن سائل کو کاغذ پر حل کر لیتے ہیں"۔

میں نے کہا "اعلیٰ حضرت بھی تو علم و عقل کی عزت بڑھانے میں کسی فلسفی سے کم نہیں"۔

مسولینی نے جواب دیا "میں علم و عقل کو فیسسٹ تحریک کی ایک خصوصیت بنانے کا مخالف نہیں ہوں میں یہ چاہتا ہوں کہ بہبودِ عام کی خاطر علم و عقل کو کام میں لگایا جائے۔ میں رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ سے ادبیات کی ترویج کا حامی ہوں۔ علمی مقابلے تعریف کے قابل ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ادبا کو اپنی قابلیتوں کا مظاہرہ فیسسٹ نقطۂ نظر سے کرنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کو جھوٹی حمایتِ آزادی مصنوعی اشتراکیت اور بناوٹی عمومیہ پرستی کے پول کھولنے چاہئیں۔

"باقی رہی وہ تعلیم جو جامعات سے حاصل ہوتی ہے، تو اس کے معاملے میں میں ہر اُس چیز کا حامی ہوں جو ہمارے اصول و حالات سے مطابقت رکھتی ہو۔ مگر اِس تعلیم کا جو جزو ہمارے حالات سے مطابقت نہیں رکھتا اُس سے ہمیں جس قدر جلد بھی ممکن ہو نجات حاصل کرنی چاہیئے۔

"اگر کالجوں کے پڑھے ہوئے لڑکے فاسیت جیسی پیچیدہ تحریک پر ایک معاندانہ پیرائے میں تنقید کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں تو پھر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسے کالجیوں پر جو صرف بحث کرنا جانتے ہیں پولیس کی ایک پلٹن کو ترجیح دوں گا جو کام کر سکے۔

"میں خود سنڈیکلسٹ تحریک کا ایک پیرو ہوں۔ میں مزدوروں کی حمایت کا قائل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں مزدوروں کی جماعتوں کو فیسسٹ تحریک میں شامل کرنا اور اُن کو منظم کرنا چاہتا ہوں، خواہ اس سے اسی قدر فائدہ حاصل ہو سکے کہ ہمیں لبرل تحریک کو دفن کرنے کے لئے کوئی کام کا آدمی مل جائے۔

"سنڈیکل ازم لبرل ازم کے لئے فنا کا پیغام ہے۔ لبرل ازم کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ یہ ذراتی اور سالماتی ہے اور اس کے اوانات ہمیشہ نواۃ سے ٹوٹ ٹوٹ کر الگ ہوتے رہتے ہیں۔ سنڈیکل ازم میں عوام کو متحد کرنے کی خاصیت ہے، اُن میں یک رنگی اور خلوص پیدا کرنے کی۔ کیونکہ وہ اُن کو جدا جدا نہیں بلکہ مل کر کام کرنے کے ذرائع بہم پہنچاتی ہے۔

"فاسیت اور سنڈیکل ازم میں فرق یہ ہے کہ سنڈیکل ازم ایک عقیدہ ہے اور فاسیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس لئے

سنڈیکل ازم کے عملی پہلوؤں پر گفتگو کرنا تضیعِ الفاظ ہے۔ فاسیت یہ ثابت کرتی ہے کہ ایک آدمی باتیں کر رہا ہے اور وہ اپنے موضوع کو اچھی طرح سمجھتا ہے تو وہ عقلمند ہو سکتا ہے، لیکن وہ جو کام کر رہا ہے اور اپنے کام کو اچھی طرح جانتا ہے اول الذکر سے بدرجہا زیادہ عقلمند ہے۔"

میں نے کہا "لیکن اُن لاکھوں آدمیوں کا آپ کیا علاج کریں گے جو مختلف عقائد اور مختلف حالات میں پیدا ہوئے اور بڑھے؟ کیا آپ لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی گزشتہ تعلیم کو جو آپ کے معیار پر پوری نہیں اترتی اپنے دماغوں میں سے نکال کر پھینک دیں؟"

سولینی نے جواب دیا "کیوں نہیں؟ ذرا سوچئے تو سہی اُس محل کے کھنڈروں سے ایک کیا خوبصورت مکان تعمیر ہو سکتا ہے جس کی اب کچھ ضرورت نہ رہی ہو، جس کا وجود زمین کے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہا ہو! بالکل اسی طرح گزشتہ زندگی کے کھنڈروں سے ایک بہتر اور بلند تر زندگی کی تعمیر کے لئے سامان بہم پہنچ سکتا ہے۔

"بعض دھاتوں کا مزاج معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن پر پے در پے ہتھوڑے سے ضربیں لگائی جائیں۔ زندگی انسانوں کا مزاج اسی طریق سے پرکھتی ہے۔ میں نے اسی حقیقت کے علم سے فائدہ اٹھایا ہے اور میرے عادات و اطوار میرے ہی تجربے سے مجھے حاصل ہوئے ہیں اگر میں نے لوگوں کو ان طمانچوں سے پہچانا ہے جو انہوں نے برداشت کئے تو میں نے اپنے آپ کو بھی انہیں طمانچوں سے پہچانا ہے۔ جو لوگوں کی طرف سے مجھے وصول ہوئے ؟

"اپنے آپ کو رہنمائی کے لئے مجھے خود اپنی گزشتہ زندگی کی بہت سی باتیں چھوڑنی پڑی تھیں۔ (مسکرا کر) مثلاً ایک یہ کہ مجھے اپنی ایک فطرتی بزدلی کو زیر کرنا پڑا۔ بلکہ آج بھی جب کبھی میں کسی مجمع کے سامنے تقریر کرنے لگتا ہوں تو مجھے اس بزدلی سے کُشتی کرنی پڑتی ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ اس پر کس طرح غالب آئے؟"

"اپنے آپ کو بھول جانے سے۔ صرف اپنے مقصد کا خیال سامنے رکھنے سے۔ خلوص جس طرح زندگی میں کامیاب بناتا ہے اسی طرح خطابت کی کامیابی کا بھی ضامن ہے۔ اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا اگر کسی مقرر کی بات چالاکی پر مبنی سمجھی جائے بشرطیکہ اُس میں خلوص کی بھی کوئی جھلک نظر آ رہی ہو۔ تاہم یہی کافی نہیں ہے کہ وہ بات عوام کو پُرخلوص معلوم ہو، ضرورت اس کی ہے کہ انسان کے دل میں خلوص ہو۔"

میں نے کہا "کیا خلوص میں بھی خطرات نہیں ہیں؟ کیا ایک رہنما اپنا دل کھول کر عوام کے سامنے رکھ

سکتا ہے ؟"

"بیاسیین کو زیادہ باتیں کرنے سے روکا گیا ہے، لیکن اگر وہ کم گو ہو جائیں تو اُن پر گریز اور بزدلی کا الزام لگایا جاتا ہے ۔ اس لئے اگر کسی وقت زیادہ بولنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے تو کسی وقت کم بولنا بھی مہلک ثابت ہوتا ہے ۔

"میں اکثر بولتا ہوں، لیکن ضرورت کے سوا کبھی نہیں بولتا ۔ میں خاموشی کا قائل ہوں ۔ میں اس شخص کی خاموشی کا قائل ہوں جو کام کر رہا ہو، اُس شخص کی خاموشی کا نہیں جو اپنا وقت ضائع کر رہا ہو ۔

"اختصار ـــ مجھے اختصار پسند ہے ۔ میں اسے اپنے فقرات میں لانے کی کوشش کرتا ہوں ۔ میں اسے اپنی تقریروں میں داخل کرنا چاہتا ہوں ۔ میں نے اپنی تقریر میں ایسے انداز کو قطعًا ترک کر دیا ہے جس میں محض مرصّع الفاظ اور نمائشی ترکیبیں ہوتی ہیں ۔

"سطحیت اس دور کی لعنت ہے ۔ ہم ہر بات کے متعلق اپنی رائے کو ایک ایسے علم کی بنا پر قائم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو نہایت ادھورا اور ناقص ہوتا ہے ۔ بہت سے اخبار نویس خالص رائے عامہ طلب کیا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ہی صدائے بازگشت کو سنتے ہیں اور اُسی کو جذباتِ عامہ کہہ کر پکارتے ہیں ۔

تعلیم و تربیت کا اہم ترین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہمیں کامل بنائے ۔ وہ شخص کچھ نہیں جانتا جو کسی چیز کو کامل طور پر نہ جانے ہمیں جاننا چاہیئے کہ ہم کیا کریں ہمیں جاننا چاہیئے کہ ہم کیونکر کریں ہمیں اپنے دائرۂ عمل کی حدود بھی معلوم ہونی چاہئیں ۔

پھر اُس نے مسکرا کر کہا "بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بہت زیادہ باتیں کرتے ہیں، لیکن اکثر بھول جاتے ہیں کہ بہت زیادہ کام کرنا اس سے آسان ہے ۔ البتہ یہ جاننا کہ کیا نہ کیا جائے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ یہ کہ کیا کیا جائے ۔"

منصور احمد

آنکھ

مست اور مے خوار آنکھ
دلربا ، دلدار آنکھ
سحر زا ، عشوہ طراز
جاں فروز ، اور جانفزا

نشّوں میں سرشار آنکھ
کتنی جادو بار آنکھ
اُف غضب پُرکار آنکھ
ناتواں ، بیمار آنکھ
کتنی اچھی آپ کی

جاذب جنس وفا
مستیوں کی جان ہے
باعثِ تزئینِ حُسن
صانعِ تقدیر کی
ہے مری سرکار آنکھ

حُسن کی زردار آنکھ
نام کی ہشیار آنکھ
حُسن کی سردار آنکھ
صُنع کا شہ کار آنکھ

شمیم

رباعیات

(۱)

ناشاد کسے کہتے ہیں اور شاد کسے
مجبور کسے کہتے ہیں آزاد کسے
اک دل ہی کے سو بھیس بدلتا ہے فراق
برباد کسے کہتے ہیں آباد کسے

(۲)

ناشاد ہیں تو شاد بھی ہو جائینگے
برباد دل آباد بھی ہو جائینگے
مجبور سے مجبور تو ہو لیں پہلے
قیدی ترے آزاد بھی ہو جائینگے

(۳)

دنیا کو کسی طرح سے یہ راز ملے
دنیا کے کسی ساز سے یہ ساز ملے
دنیا کو تو دے چکے ہم سکون جاوید
کچھ دل کے دھڑکنے کا بھی انداز ملے

(۴)

جینا تو نہیں ہے جبر جینے کا ہے نام
رونا تقدیر کا ہے اغراض کا کام
اے موت کی نیند میں بھی جاگے ہیں بہشت
اے زیست کی آزاد اب اپنا لیں بام

فراق گورکھپوری

ظرافت کی حقیقت و ماہیت

(۲)

کچھ دن ہوئے کسی رسالے میں میاں محمد اسلم کا ایک مزاحیہ افسانہ شائع ہوا تھا۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ ایک روز اُن کے محلے کے ایک مکان سے اس قدر شور و غل اٹھا کہ وہاں خلقت کا انبوہ لگ گیا اتنے میں کلو پہلوان ایک موٹا ڈنڈا لے کر آیا اور کہنے لگا ذرا بتاؤ تو کتنا بڑا تھا۔ کدھر بھاگا۔ کہیں کالا ناگ تو نہ تھا۔ ابھی مکان کا ملازم پورا جواب بھی دینے نہ پایا تھا کہ حضرت سانپ وانپ نہیں نکلا ہے کہ اخبار کے نامہ نگار آپہنچے اور پوچھنے لگے کس دیوار میں نقب لگائی گئی اور کتنا مال چوری گیا۔ ملازم اپنا جملہ ختم بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ حضرت چوری ووری نہیں ہوئی ہے کہ آگ بجھانے والا انجن ٹن ٹن کرتا ہوا موقع واردات پر پہنچ گیا اور قریب کے کنوئیں میں نل لگا دیا۔ ملازم ابھی سمجھا ہی رہا تھا کہ حضرت آگ واگ نہیں لگی ہے کہ ڈنڈا پولیس وہاں پہنچ گئی اور سول نافرمانوں کا مجمع سمجھ کر لوگوں پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ جب مجمع برخاست ہوا اور نفس معاملہ کے متعلق تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ پیاز کے چھلکے پر گھر کی خادمہ کا پاؤں پھسل گیا تھا اور اس کے ہاتھ سے دو آنے کی پیالی زمین پر گر کر پھوٹ گئی تھی۔ اس پر بیگم صاحبہ غریب ملازمہ پر برس پڑیں اور ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ خدا کی پناہ۔ نتیجہ جو کچھ ہوا اسے آپ پڑھ ہی چکے۔ معجز بیان شاعر مرزا داغ کے حسب ذیل شعر کو اسی قسم کا ایک مزاحیہ افسانہ یا طربیہ ڈرامہ تصور کرنا چاہیئے

غضب آیا ستم ٹوٹا۔ قیامت ہو گئی برپا یہ پوچھا تھا کہ تم آزردہ مجھ سے میری جاں کیوں ہو

مزاحیہ افسانوں میں مذاق اور ظرافت کا ایک اہم ذریعہ واقعات کا پلٹا کھانا یا قسمت کے پانسے کا الٹنا ہے۔ بلند بانگ دعوٰی کرنے لیکن عمل کے وقت پھسڈی ثابت ہونے کے واقعات بھی بڑی دل لگی اور دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ ایک شخص اپنی بہادری کے کارنامے اور شیر مارنے کے واقعات بڑے زور شور سے بیان کرتا ہے لیکن اگر مٹی کا شیر بھی کہیں نظر آجائے تو وہ سب سے پہلے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہے۔ کوئی شخص اپنی بیوی کی تندمزاجی، بے سلیقگی، بدانتظامی، اور پھوہڑپنے کی شکایت کرتا ہے لیکن خانم کے سامنے آتے ہی میاں کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ عاشقوں کے متعلق تو مشہور ہی ہے کہ معشوق کی عدم موجودگی میں وہ گلہ و شکوہ کا دفتر تیار کرکے

رکھتے ہیں لیکن جہاں معشوق سامنے آیا محض اس کا رعبِ حسن سارے شکایتی دفتر کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ میرؔ نے اسی خیال کو ایک دلپذیر شعر میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

کہتے ہیں کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ایک شخص اپنے حریف کو نیچا دکھانے اور پامال کرنے کے لئے اس کی عدم موجودگی میں خوب پینترے بدلتا ہے لیکن حقیقی مقابلے کی نوبت آئی کہ حضرت اپنی ساری پہلوانی اور اکڑفوں بھولے۔ ایک پرانا قصہ ہے کہ ایک گھاٹ پر جہاں دھوبی کپڑے دھوتے تھے ایک بھوت آیا کرتا تھا جس کے ڈر سے دھوبیوں نے گھاٹ پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ جب داروغہ صاحب کے کپڑے وقت پر دُھل کر نہ آئے اور ان کو بھوت کے واقعہ کا علم ہُوا تو انہوں نے تمام دھوبیوں کو بلا کر خوب ڈانٹا۔ ان کی توہم پرستی پر سخت ملامت کی اور سب کو زبردستی گھاٹ پر لے جا کر کپڑے دھونے کا حکم دیا اور خود گھوڑے سے اترے۔ ریتلی زمین میں کھونٹے گاڑ کر گھوڑے کا اگاڑ پچھاڑ باندھ دیا اور بھوت کا انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک دوپہر کے وقت بھوت بہت دور ایک کیکر کے درخت کے نیچے نظر آیا۔ داروغہ صاحب نے خوفزدہ دھوبیوں کو دم دلاسا دیا اور بھوت کو دور ہی سے تلوار دکھا کر کہا کہ مردود اگر تو ادھر آیا تو تیرا تکا بوٹی کر ڈالوں گا۔ لیکن بھوت لاپروائی سے نزدیک آتا ہی گیا۔ دھوبی تو جان بچا کر بھاگ گئے اب رہ گئے اکیلے داروغہ صاحب۔ جب انہوں نے دیکھا کہ تلوار کی دھمکی بے سود ثابت ہوئی تو وہ لاحول پڑھنے اور درود شریف کا ورد کرنے لگے۔ لیکن بھوت عجیب قماش کا تھا۔ اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ آگے بڑھتا آیا اور جب بالکل قریب پہنچ گیا تو داروغہ صاحب بدحواسی کے عالم میں گھوڑے پر اُچکے اور دو چابک لگائے۔ گھوڑا اگاڑ پچھاڑ کھا کر بے تحاشا آبادی کی طرف بھاگا اب داروغہ صاحب کی پیٹھ پر کھونٹوں کی تڑاتڑ مار پڑنے لگی۔ وہ سمجھے کہ بھوت ہی مار رہا ہے۔ وہ گھوڑے کو جتنا تیز دوڑاتے اتنی ہی زیادہ مار لگتی۔ بالآخر جب وہ بازار میں پہنچے اور لوگوں نے گھوڑے کو روکا تو بیچارے داروغہ کو ہوش آیا اور اپنی حماقت کا علم ہُوا۔ اس قسم کے سینکڑوں مزاحیہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض نقادانِ فن نے ایسے واقعات کو ایک ضابطہ (فارمولا) کی شکل میں لانے کی کوشش کی ہے۔ فرض کرو کہ ب الف کا حریف ہے (ممکن ہے کہ ب کوئی بھوت ہو یا شیر ہو یا الف کی بیوی ہو یا اس کا دشمن ہو یا رقیب ہو یا آجر ہو) ب کی عدم موجودگی میں الف بڑی شیخی بگھارتا ہے۔ ڈینگ ہانکتا ہے۔ ب کو زک دینے۔ اسے نیچا دکھانے اس کی توہین و تذلیل کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے لیکن ب جب سامنے آتا ہے تو الف اپنے سارے پینترے بھول جاتا ہے۔ اہانت کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتی ہے اور اس کو دبکنا پڑتا ہے۔ الف جو نقصان

یا ذلت یا تکلیف تب کو پہنچانا چاہتا تھا اس کا وہ خود شکار بن جاتا ہے۔ غرض کہ تب غالب آتا ہے اور الف مغلوب ہوتا ہے۔ چاہ کن را چاہ در پیش۔ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ ہنوز دلی دور است ان محاوروں سے اسی قسم کے واقعات کی تشریح ہوتی ہے۔

ایڈیسن نے مزاح کی دو قسمیں قرار دی ہیں ایک کو وہ "مزاحِ کاذبہ" سے اور دوسری کو "مزاحِ صادقہ" سے نامزد کرتا ہے۔ اس نے ان دونوں کی تفریق تمثیلی رنگ میں ایک فرضی نسب نامہ کے ذریعے سے کی ہے "مزاحِ کاذبہ" جو ظرافت کی جھوٹی دعویدار ہے خبط اور ہنسی کی اولاد ہے۔ ہنسی حماقت کی بیٹی اور خبط لغویت کا بیٹا ہے۔ لغویت کذب کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ غرض کہ مزاح کاذبہ کا مورثِ اعلیٰ کذب ہے۔ "مزاحِ صادقہ" ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کے بزرگواروں میں خوش طبعی۔ خوش فہمی۔ لطف و انبساط۔ تفریحِ طبع۔ مذاقِ لطیف وغیرہ شامل ہیں اور اس کی مورثِ اعلیٰ صداقت ہے۔ اس کے بعد ایڈیسن نے مزاحِ کاذبہ کی چند خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مزاحِ کاذبہ میں مسخرگی و نقالی کا وافر عنصر پایا جاتا ہے۔ جھوٹا مزاحیہ نگار اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتا کہ وہ بدکرداری۔ بیوقوفی۔ ریاکاری۔ تکبر۔ تعیش اور حرص و آز کی ہنسی اڑاتا ہے یا نیکی۔ عقلمندی۔ زہد و ورع۔ سادگی۔ دکھ اور غربت کی تحقیر آمیز ہجو کرتا ہے۔ وہ دوست اور دشمن کا یکساں طور پر استہزا کرتا ہے۔ وہ تہذیب و اخلاق کا پابند نہیں ہوتا بلکہ محض دل لگی اور مذاق کی خاطر ہر بری بھلی چیز کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ وہ اصول کے بجائے ذاتیات پر حملے کرتا ہے۔ اس کے برخلاف سچی مزاح وہ ہے جس سے کسی کی دل شکنی و دل آزاری نہ ہو۔ جس کا دامن ہزل۔ پھکڑ اور فواحش سے پاک ہو۔ جس سے طبیعت میں تکدر و تنغص پیدا نہ ہو۔ جو معیارِ اخلاق اور مذاقِ سلیم کے منافی نہ ہو۔ سچا مزاحیہ نگار ہمدردی اور تضحیک کے موقعوں میں امتیاز کرتا ہے ایک ہی واقعہ ایک موقعہ پر مضحکہ خیز اور دوسرے موقعہ پر ہمارے جذبۂ ہمدردی کا محرک ہوتا ہے۔ اگر ایک مریض کے پاؤں کو کمزوری کی وجہ سے لغزش ہو اور وہ تلملا کر گر جائے تو یہ رحم اور ترس کا موقعہ ہوگا نہ کہ تضحیک و استہزا کا۔ لیکن اگر کوئی متوالا ڈگمگاتا ہوا نظر آئے یا کوئی تندرست و توانا شخص بد احتیاطی سے پھسل کر گر جائے تو ہمیں خواہ مخواہ ہنسی آئے گی یہ مزاح و ظرافت کا موقعہ ہے۔ الغرض کسی شخص کے ایسے نقص یا خامی پر ہنسنا جائز نہیں ہے جو فطری ہو اور جس میں انسان کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہ ہو۔

مزاح کی بحث کے بعد ظرافت کی دوسری قسم بذلہ سنجی (وٹ) ہماری توجہ کی محتاج ہے۔ پروفیسر ریچر کا قول ہے کہ بذلہ سنجی تخیل یا خیال آرائی کے عملِ معکوس پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ شاندار و پرعظمت عنصر کو الٹ دینے سے سرمنجو

میں آتی ہے۔ وہ خفیف کو خفیف تر اور حقیر کو حقیر تر بنا دیتی ہے۔ وہ اکثر اعلیٰ چیز کو ادنےٰ سطح پر کھینچ لاتی ہے جس سے ہماری حیرت اور قدر دانی کا جذبہ کمزور ہو جاتا ہے کبھی وہ ادنیٰ اور حقیر شے کو اٹھا کر اعلیٰ و شاندار چیز کے پہلو میں رکھ دیتی ہے تاکہ دونوں کا تقابل مضحکہ خیز ثابت ہو۔ بذلہ سنجی صرف ہمارے عارضی و سطحی نقوشِ تاثر کو اُبھارتی اور نمایاں کرتی ہے۔ وہ اشیا کی ایسی صفت یا خاصیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی جو ہمدردی یا نفرت کے جذبہ کو مشتعل کرے۔ بذلہ سنجی تو صرف اس بات کی مقتضی ہے کہ ہلکے پھلکے خیالات و جذبات کو پر لطف زبان میں ادا کر دیا جائے لیکن بعض وقت سنجیدہ معاملات کو مذاقیہ پیرایہ میں یا معمولی بات کو پُرشکوہ الفاظ میں ادا کرنے سے بھی ظرافت نمودار ہوتی ہے۔ عام طور پر غیر متناسب تشبیہ بذلہ سنجی کی جان خیال کی جاتی ہے غیر متناسب تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ مشبہ بہ مشبہ سے غایت درجہ پست یا حد درجہ بلند ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

دیکھنا ناسخ سرِ شیخ معجم کی طرف ــــ کیا کلس سواک کا ہے گنبد دستار پر

یہاں کلس کو سواک سے اور گنبد کو دستار سے "پھبتی نما" تشبیہ دے کر ظرافت پیدا کی گئی ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن ــــ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

کہاں خلدِ بریں اور کہاں ایک بازاری معشوق کا کوچہ

دُھن دیس کی تھی جس کو گاتا تھا اک دہاتی ــــ بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

اس جگہ ایک اہم و سنجیدہ سیاسی مسئلہ کو ایک دیہاتی کی زبان میں ادا کر کے ظرافت کا چوکھا رنگ پیدا کیا گیا ہے

لحد میں دوشِ عزیزاں پہ ہو کے بار آئے ــــ عدم میں غل ہوا پیدل گئے سوار آئے

شعر کا مضمون کتنا سنجیدہ، قنوطی اور منشائم ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں روزمرہ زندگی کے ایک ادنیٰ واقعہ یعنی پیدل جانے اور سوار آنے کی مثال نے نہ صرف جذبہ کی شدت کو کم کر دیا بلکہ اسے ہنسی مذاق کی چیز بنا دیا۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغِ ہجراں کا ــــ طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

عشق و عاشقی میں سینہ کا داغدار اور گریباں کا چاک ہونا ایک فرسودہ و پامال مضمون ہے لیکن شاعر نے اس بات کو جس آن بان اور شان و شوکت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ حد درجہ انبساط خیز ہے۔

الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ نا دلہا ــــ کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا

حافظ علیہ الرحمۃ نے یہ شاندار پیرایۂ بیان ایک اہم عارفانہ رمز اور صوفیانہ نکتہ کی ترجمانی کے لئے اختیار کیا تھا لیکن

اکبر الہ آبادی نے بے ادنیٰ تغیر اس پر شکوہ اسلوب کو ناول خوانی جیسی ادنیٰ بات کا حامل بنا کر لطف و دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

ظرافت و بذلہ سنجی کے متعلق عام خیال ہے کہ وہ اپنا اثر مقابلہ کے ذریعے سے پیدا کرتی ہے۔ اوپر کی مثالوں سے بھی واضح ہے کہ بذلہ سنجی دو چیزوں میں مشابہت و مماثلت کی دریافت پر مبنی ہے۔ جان لاک اس نظریہ کا زبردست حامی تھا۔ وہ ظرافت و بذلہ سنجی اور تجویز و استدلال میں تفریق کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ "جن لوگوں میں بذلہ سنجی و حاضر جوابی کا مادہ بکثرت پایا جاتا ہے ان کے غور و فکر اور تجویز و استدلال کی قوت بالعموم کمزور ہوتی ہے۔ ظرافت و بذلہ سنجی کا انحصار خیالات کے اجتماع و ترکیب پر ہے اور اس کا کام مختلف اشیا کے درمیان ایسی مشابہت و مطابقت دریافت کرنا ہے جس سے چشم تخیل کے آگے خوشگوار تصویریں پیش ہو سکیں۔ برخلاف اس کے تجویز و استدلال کا کام خیالات کی تحلیل و تفریق ہے۔ جن چیزوں میں بظاہر کوئی اختلاف نظر نہیں آتا ان میں نازک فروق دریافت کرنا تجویز و استدلال کا خاصہ ہے اس لئے یہاں کسی مشابہت و مماثلت کی بنا پر ایک چیز کو سہواً دوسری چیز سمجھ لینے کا احتمال باقی نہیں رہتا۔"

جان لاک کے اس بیان کو ایڈیسن بذلہ سنجی کی سب سے مکمل اور منطقی تشریح قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ اس میں کچھ ترمیم و اصلاح بھی پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگرچہ بذلہ سنجی کے لئے مشابہت کا ادراک ضروری ہے لیکن خیالات کی ہر مشابہت پر ظرافت کا انحصار نہیں ہوتا بلکہ مشابہت ایسی ہونی چاہیئے جس سے خوشی اور تعجب ہو۔ غرض کہ حیرت اور مسرت کے احساسات ظرافت و بذلہ سنجی کا لازمہ ہیں۔ اگر خیالات کی مشابہت بالکل بدیہی ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ اگر ایک آدمی کے گانے کا دوسرے آدمی کے گانے سے مقابلہ کیا جائے یا کسی چیز کی سفیدی کی مثال دودھ یا برف سے دی جائے یا رنگ ولون کے تنوع کی تعبیر قوس قزح سے کی جائے تو اس سے نہ حیرت پیدا ہو سکتی ہے نہ انبساطی کیفیت۔ ظرافت کا اقتضا ہے کہ اس بدیہی مشابہت کے علاوہ اشیا یا خیالات میں کوئی ایسی مماثلت یا مقارنت کا سراغ لگایا جائے جو تعجب خیز بھی ہو اور مسرت بخش بھی۔ مثلاً اگر ایک عاشق اپنے معشوق کے متعلق کہے کہ اس کا سینہ برف کے مانند سفید ہے تو یہ قول ظرافت آمیز نہیں کہلا سکتا لیکن جب وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا ہے کہ اس کا سینہ برف ہی کی طرح سرد بھی ہے تو معاً سامع پر ایک حیرت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اندر حظ و انبساط کی کیفیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی اصلی ظرافت ہے۔ ایک ظرافت نگار کارکنانِ قضا و قدر کی لاپروائی و تکاسل کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر شخص تو برسات کے پہلے اپنے مکان کی چھت کی داغ دوزی کرا لیتا ہے لیکن اللہ میاں کی آسمانی چھت ہر سال یونہی ٹپکتی

رہتی ہے۔ آسمان کو سائبان یا چھت کہنا تو ایک معمولی بات ہے لیکن بارش کو چھت کے ٹپکنے سے تشبیہ دینے میں البتہ ایک طرح کی جدت وندرت پائی جاتی ہے جس سے سامع کو تعجب کے ساتھ لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ الغرض لاک کا بیان اور ایڈیسن کی ترمیم وتشریح ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ بذلہ سنجی کی لازمی شرط دو چیزوں کے درمیان ایسی مشابہت کی دریافت ہے جس سے انسان کو تعجب اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بیان ظرافت و بذلہ سنجی کی ان تمام اقسام پر حاوی ہے جو تشبیہ واستعارہ۔ رمز وکنایہ۔ تلمیح واشارہ۔ معمّا۔ مقولہ۔ لطیفہ۔ حکایت۔ مذاقیہ نقل اور ڈرامائی تحریر پر مبنی ہوتی ہیں۔

لیکن جان لاک اور ایڈیسن کے خیال سے تمام نقادانِ فن متفق نہیں ہیں۔ چنانچہ ہیرس (Harris) کہتا ہے کہ لاک نے ظرافت و بذلہ سنجی اور تجویز واستدلال کے درمیان جو امتیاز قائم کیا ہے اس کی رو سے یہ ثابت کرنا کہ "کسی مثلث کے تینوں زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں" استدلال واستنباط کا نہیں بلکہ ظرافت وبذلہ سنجی کا نتیجہ قرار پائے گا اور اقلیدس کے تمام اصول ومبادیات لطائف وظرائف کا مجموعہ کہلائیں گے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ظرافت ہر حال میں ادراکِ مشابہت ہی کی مرہونِ منت نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات دو یا زیادہ اشیا کے مابین نازک وغیر متوقع فرق کی دریافت بھی بذلہ سنجی کے لئے اساس کا کام دیتی ہے۔

ظرافت و بذلہ سنجی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی کی بات کا ایسا شوخ وطعن آمیز جواب دیا جائے یا اس پر ایسے آوازے کسے جائیں یا ایسی پھبتی کہی جائے یا اسی کے الفاظ کو اس انداز سے دہرایا جائے کہ قائل کا مطلب ہی الٹا ہو جائے یا اس کی بحث وحجت کا رخ ہی پھر جائے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کم حیثیت شاعر کی تعریف میں کہا کہ اس کا کلام اس وقت چمکے گا جب لوگ غالب اور میر کو بھول جائیں گے۔ اس پر سننے والے نے یہ چبھتا ہوا فقرہ جڑ دیا کہ "لیکن اس سے پیشتر نہیں"۔ اب مطلب یہ ہو گیا کہ نہ لوگ کبھی میر اور غالب کے زندۂ جاوید کلام کو بھولیں گے نہ کبھی اس گمنام شاعر کو شہرت نصیب ہو گی۔

ایک رسالہ کے مدیر صاحب اپنے ہر پرچہ میں ایک رئیس کا کلام شائع کر کے اس کے محاسن پر روشنی ڈالا کرتے تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ مدیر صاحب بڑے سخن فہم معلوم ہوتے ہیں اور فلاں رئیس کا کلام انہیں بہت مرغوب ہے۔ دوسرے شخص نے جواب دیا کیسی مرغوبیت اور کہاں کی سخن شناسی حضرت یہ سب "آئندہ" عنایات کا سپاسگذارانہ احساس ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مدیر صاحب بالکل کور مذاق ہیں۔ ان کی مدح سرائی محض لالچ گرانہ ہے۔ وہ کوئی ملازمت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔

ایک شخص نے کہا کہ شیخ سمیع اللہ بڑے نمازی اور عبادت گزار ہیں۔ گویا یہ اُن کی حد درجہ کی تعریف تھی لیکن دوسرے

نے جواب دیا کہ اجی ان کو اور کام ہی کیا ہے۔ اب وہی مدح ذم میں تبدیل ہوگئی۔ مطلب یہ ہوا کہ شیخ سمیع اللہ ایک ناکارہ و کاہل الوجود آدمی ہیں۔ ان کو کچھ کام کاج آتا ہی نہیں۔ پھر نماز نہ پڑھیں تو اور کیا کریں۔

اردو میں بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں ناصح۔ واعظ۔ شیخ۔ زاہد وغیرہ کی ہنسی اڑائی گئی ہے اور اُن کے عُجب و ریاکاری کا تار و پود بکھیر اگیا ہے۔ مثلاً

اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت	اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند	واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے	کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ

مندرجہ بالا مثالوں میں ظرافت کی بنا خیالات کی مشابہت یا مماثلت نہیں ہے۔ بلکہ یہاں قول اور فعل یا دعوی اور عمل یا ظاہر اور باطن یا نمائش اور حقیقت کے درمیان امتیاز و تفریق کی گئی ہے۔ اس لئے جان لاک کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ ظرافت و بذلہ سنجی کا کام خیالات میں مشابہت دریافت کرنا اور تجویز و استدلال کا کام ان میں امتیاز قائم کرنا ہے حقیقت الامر یہ ہے کہ دعویٰ اور عمل یا ظاہر اور باطن میں فرق دریافت کرنا ظرافت اور استدلال دونوں کا مشترکہ کام ہے۔ اسی طرح دو یا زیادہ خیالات کا آپس میں مقابلہ کرکے ان میں ربط و نظم قائم کرنا بھی دونوں کا خاصہ ہے۔

البتہ ظرافت و بذلہ سنجی کی ایک امتیازی خصوصیت جو اسے تجویز و استدلال سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ یہ لفظی شعبدہ بازیوں اور دور از کار تصنعات کے ذریعے سے دو یا زیادہ چیزوں میں جزئی و اتفاقی مطابقت قائم کرتی ہے جسے اشیا کی ماہیت اور فطری خاصیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی مثالیں رعایتِ لفظی۔ ایہام تجنیس۔ ذو معنی شعر یا جملے۔ چیستان۔ معمے۔ دو سخنے وغیرہ ہیں۔ یہاں مذاق و ظرافت کی محرک وہ نام نہاد مشابہت ہے جو ایک لفظ یا فقرے کو دو معنوں میں استعمال کرکے پیدا کی جاتی ہے تجویز و استدلال میں اس قسم کی لفظی مشابہت سے کام نہیں چل سکتا۔ لفظی و صوتی مماثلت کی بنا پر جو ظرافتیں پیدا کی جاتی ہیں اُن کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:-

(۱) ایک روز مرزا غالبؔ نواب فتح الملک سے ملنے گئے۔ نواب صاحب کسی ضروری کام میں مشغول تھے اس لئے مرزا صاحب کو فوراً بلا نہ سکے۔ مرزا صاحب غلام گردش میں ٹہلتے رہے۔ جب نواب صاحب فارغ ہوئے تو نوکر سے کہا کہ دیکھو مرزا نوشہ کہاں ہیں۔ مرزا غالب جہاں ٹہل رہے تھے وہیں سے پکار کر بولے کہ "غلام گردش میں ہے" نواب صاحب یہ سنکر خوب ہنسے اور باہر آکر مرزا صاحب کو اپنے ساتھ دیوانخانہ میں لے گئے۔ یہاں

بنائے مذاق غلام گردش کا لفظ ہے جس سے مراد عرفِ عام میں خدمتگاروں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے لیکن مرزا صاحب نے جس لب ولہجہ میں اس لفظ کو ادا کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ مرزا صاحب گردش میں یعنی چکر اور پریشانی میں ہیں۔

(۲) ذومعنی شعر

آنکھ اپنی جو لگی چین نہیں خواب نہیں آنکھ لگتی ہے تو کہتے ہیں کہ نیند آئی ہے

یہاں آنکھ لگنے کے دو معنی ہیں ایک نیند کا آنا۔ دوسرے کسی پر عاشق ہونا۔

(۳) رعایت لفظی

مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں وصل کی شب پلنگ کے اوپر

پلنگ چارپائی کو بھی کہتے ہیں اور شیر کو بھی۔ دوسرے معنی میں اس لفظ کو چیتے سے خاص مناسبت ہے۔

(۴) ایہام

مہندی ملے سے لال ہوں جب اس کے ہاتھ کیونکر زباں سے اس کی نزاکت کا ہو بیاں

یہاں رنگِ حنا سے ہاتھوں کا سُرخ ہونا مراد نہیں جو معنی قریب ہیں بلکہ مہندی ملنے کے صدمہ سے ہاتھوں کا سرخ ہوجانا مقصود ہے اور یہ معنی بعید ہیں۔ مہندی کا ذکر معنی قریب کے مناسب ہے۔

(۵) تجنیس جہاں دو لفظ تلفظ میں مشابہ اور معنی میں مغائر ہوں

(ل) کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ کہ۔ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ

(ب) نہ وہ پہنچا نہ کلائی ہے ہات نہ وہ پہنچا نہ کل آئی ہیہات

(۶) دوسخنے

گھوڑا کیوں اَڑا ـــ پان کیوں سڑا ـــ پھیرا نہ تھا گوشت کیوں نہ کھایا ـــ ڈوم کیوں نہ گایا ـــ گلا نہ تھا

(۷) معما۔ مومن خان نے مہتاب رائے کا معما اس طرح کہا ہے

ہم اُلٹے۔ بات الٹی ۔ یار الٹا بنے کیونکر کہ ہے سب کام الٹا

ہم۔ بات اور یار کو اُلٹنے سے مہتاب رائے بن جائے گا۔

(۸) چیتان یا پہیلی۔ خرگوش کی پہیلی ملاحظہ ہو:۔

سارا چاہو دیکھنا تو جنگل اس کا باس آدھا گھر کمہار کے آدھا سب کے پاس

خرگوش کا آدھا خر یعنی گدھا کمہار کے گھر رہتا ہے اور اس کا نصف دوم گوش یعنی کان سب کے پاس موجود ہے لیکن پورے لفظ خرگوش سے ایک جانور مراد ہے جو جنگل میں رہتا ہے۔ معمے اور چیستان میں فرق یہ ہے کہ معمے میں مقصودِ اصلی حروف اور الفاظ ہوتے ہیں اور چیستان میں مقصودِ اصلی اشیا کی ذاتیں ہیں۔

علاوہ بریں ہزل، پھکڑ، پھبتی، ضلع جگت، تک بندی وغیرہ کا شمار بھی لفظی تصنعات میں ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض میں الفاظ کی بازیگری کے علاوہ خیال آرائی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ سب ایسی مبتذل اور سوقیانہ چیزیں ہیں کہ ان کی مثالیں درج کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

ایڈیسن نے مزاح کی طرح بذلہ سنجی کو بھی صادق اور کاذب میں تقسیم کیا ہے۔ وہ ان تمام اقسامِ ظرافت کو جھوٹی بذلہ سنجی قرار دیتا ہے جو لفظی صناعی پر مبنی ہوں۔ اس کے نزدیک سچی بذلہ سنجی وہ ہے جس کا دارومدار الفاظ کے بجائے خیالات کی ماہیت پر ہو۔ ایڈیسن نے سچی اور جھوٹی بذلہ سنجی کی جانچ کا واحد طریقہ یہ بتایا ہے کہ ظریفانہ کلام کو غیر زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر ترجمہ میں ظرافت قائم رہے تو اسے سچی بذلہ سنجی تصور کرو اور اگر ظرافت کا عنصر غائب ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ محض الفاظ و اصوات کی شعبدہ بازی تھی۔ اس نے مثال کے طور پر ارسٹی نیٹس (Aristinelus) کا ایک ظریفانہ قول نقل کیا ہے۔ ارسٹی نیٹس ایک حسین عورت کے متعلق کہتا ہے کہ "جب وہ لباسِ فاخرہ زیب تن کرتی ہے اس وقت بھی خوبصورت نظر آتی ہے اور جب وہ لباسِ عریانی میں جلوہ گر ہوتی ہے تب بھی حسین معلوم ہوتی ہے"۔ چونکہ ہر مہذب زبان میں اس کا ترجمہ آسانی سے ہو سکتا ہے اس لئے اس کا شمار سچی ظرافت میں ہونا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ ایڈیسن کی رائے بڑی حد تک صحیح و صائب ہے۔ لفظی ظرافت تعجب خیز و لطف بخش تو ضرور ہوتی ہے لیکن اس میں دیرپائی و گہرائی نہیں پائی جاتی۔ اس کے برعکس جو ظرافت خیالات کی غیر متوقع مشابہت یا نازک فرق پر مبنی ہو وہ بہت موثر اور کارگر ہوتی ہے۔ ظریفانہ کلام جتنا زیادہ مکمل تسکین بخش، صحیح اور اشیا کی حقیقت و ماہیت سے وابستہ ہوگا اتنی ہی زیادہ اس میں تیزی اور "نشتریت" پائی جائے گی۔ استہزا کی قوت خیال کی سچائی کے متناسب ہوتی ہے۔ مثلاً ڈیوک آف بکنگھم کا قول ہے کہ "قانون کی حیثیت عورت کی سی نہیں ہے کہ وہ جتنا پرانا ہو اتنی ہی اس میں خرابی آئے"۔ اس قول کی صحت اور سچائی کتنی واضح اور بدیہی ہے لیکن بغضِ نسوانی کے لئے اس سے زیادہ تیز نشتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس قول پر "الحق مُرٌّ" کی مثل صادق آتی ہے۔

بایں ہمہ ایڈیسن کی رائے غلو و مبالغہ سے خالی نہیں ہے۔ اس نے جھوٹی اور سچی ظرافت کی جانچ کا جو واحد

طریقہ تجویز کیا ہے وہ ہر حال میں صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ ظرافت کی بہت سی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں جو لفظی صنّاعی پر مبنی ہونے کے باوجود چھوٹی نہیں کہلاسکتیں۔ چنانچہ اکبر الہ آبادی کا مشہور قطعہ ہے کہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں　　اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ کدھر گیا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

یہاں پردہ کا لفظ ساری ظرافت کی جان ہے۔ ایک جگہ اس کے معنی برقع و نقاب کے ہیں اور دوسری جگہ عقل پر پردہ پڑنے سے مرادِ عقل کا زائل ہونا ہے۔

ایک بار میر مہدی مجروح جو مرزا غالب کے ارشد تلامذہ سے تھے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے پاؤں دبانے لگے۔ ہر چند مرزا صاحب نے منع کیا وہ نہ مانے اور بولے کہ قبلہ کیوں منع فرماتے ہیں اگر ایسا ہی ہے تو کچھ اجرت دے دیجئے گا۔ جب میر صاحب پاؤں دبا چکے تو از راہِ مذاق اجرت طلب کرنے لگے۔ مرزا صاحب نے کہا میاں اُجرت کیسی۔ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہاری اجرت دابی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ یہاں ظرافت کا انحصار دابنے کے لفظ پر ہے۔ پاؤں دابنے اور اجرت دابنے میں جو معنوی فرق ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

مرزا غالب کا ایک شعر ہے کہ

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو　　روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اس شعر میں کھانے کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلے مصرعہ میں "کھانے کو کچھ نہ ہو" سے مراد یہ ہے کہ کچھ غذا میسر نہ ہو اور ثانی مصرعہ میں روزہ کھانے کے معنی روزہ نہ رکھنے کے ہیں۔ بہر حال مذکورہ بالا ظریفانہ کلام کا ترجمہ دوسری زبان میں اس حسن و خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اگر غیر زبان میں ان کا مفہوم ادا بھی کر دیا جائے تو ظرافت قائم نہ رہ سکے گی تاہم کون ایسا کورِ مذاق ہوگا جو ان بذلہ سنجیوں کو کاذب سمجھے گا۔

ظرافت و بذلہ سنجی کے اور بھی بہت سے ذریعے اور طریقے ہیں۔

(۱) ایک طریقہ یہ ہے کہ الفاظ دیکھنے اور سننے میں تو نہایت جزیل۔ پر شکوہ اور بھاری بھرکم ہوں لیکن وہ "شرمندۂ معنی" نہ ہوں۔ مثلاً

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں،　　ناخنِ قوسِ قزح شیشۂ مضراب نہیں

ناسخ کے متعلق مشہور ہے کہ جب کوئی شخص اُن کے پاس شاگردی کے لئے آتا تو وہ چند بے معنی الفاظ کے

اجتماع سے ایک مہمل شعر کہ دیتے ۔ اگر وہ سوچنے لگتا تو اسے شاگردی میں لے لیتے ورنہ اگر وہ بے سمجھے بوجھے یونہی تعریف کرنے لگتا تو اسے ٹکا سا جواب دے کر بڑھا دیتے ۔ انہیں مہمل و بے معنی اشعار میں سے ایک یہ بھی ہے

ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں　　　آدمی مخمل میں دیکھے مورچے بادام میں

(۲) ظرافت کا دوسرا مشہور و معروف ذریعہ حاضر جوابی ہے ۔

حسرت ایک نابینا شاعر تھے ۔ آب حیات میں ان کی بینائی ضائع ہونے کے متعلق عجیب و غریب واقعہ درج ہے جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ۔ بہرحال ایک روز سید انشا ان کی ملاقات کو گئے تو انہیں غور و خوض میں منہمک پایا ۔ پوچھا حضرت کیا سوچ رہے ہیں ۔ وہ بولے ایک مصرع موزوں ہوا ہے دوسرے مصرع کی فکر ہے دریافت کیا کہ وہ کون سا مصرع ہے ذرا میں بھی تو سنوں ۔ حسرت نے کہا مصرع ہوا ہے کہ اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی ۔ انشا جو خوش طبعی و حاضر جوابی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے برجستہ کہ اٹھے کہ " اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی " ۔ حسرت بہت جھینپے اور لکڑی لے کر انشا پر دوڑے ۔ بڑی دیر تک یہ آگے آگے بھاگتے رہے اور وہ ڈنڈا لئے ان کے پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے ۔

ایسا ہی ایک لطیفہ عرفی کی نسبت مشہور ہے کہ ایک روز جب وہ فیضی کی ملاقات کو گئے تو انہیں " سر بزانوئے تامل " پایا ۔ وجہ دریافت کرنے پر فیضی نے کہا کہ میں نے ایک بے نقطہ کی تفسیر لکھی ہے اس میں اپنے والد صاحب کا نام لانا چاہتا ہوں ۔ عرفی نے کہا سوچنے کی کیا بات ہے اپنی زبان میں " ممارک " لکھ دیجئے ۔ واضح ہو کہ فیضی کے باپ کا نام مبارک تھا جسے گنوار لوگ ممارک بولتے ہیں ۔

(۳) پُرمذاق تلمیح بھی خندہ و ظرافت کی محرک ہوتی ہے ۔ جیسے

سینۂ عمر کی زنبیل　　　دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی　　　غم گیتی سے مرا

مشہور ہے کہ لقا کی ڈاڑھی کے ہر بال میں موتی پروئے جاتے تھے اور عمرو عیار کی زنبیل میں جو کچھ رکھا جاتا تھا سب غائب ہو جاتا تھا ۔ وہ کبھی پُر نہیں ہوتی تھی لیکن اس میں ہاتھ ڈالنے پر جو کچھ چاہو نکل آتا تھا ۔

(۴) کسی مشہور محاورے مثل یا مقولے کو کسی مضحکہ خیز واقعہ کی تشریح کے لئے استعمال کرنے سے بھی ظرافت نمودار ہوتی ہے ۔ مثلاً

مثل ہے نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی　　　بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلی حج کو چلی

دلی کی مشہور و نامی رنڈی شیریں جب حج کو جانے لگی تو عبدالله خان اوج نے یہ شعر اس کے حسب حال کہا تھا ۔

اکبرالہ آبادی نے ہندی کے مشہور محاورے "نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی" کو نہایت پر مذاق طریقہ سے اس قطعہ میں نبھایا ہے۔

قومی ترقی کی رادھا پیاری بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
نومن تیل کی فکر ہے ساری چندے کی تحریک ہے جاری

(۵) کبھی کسی شعر یا عبارت کا الٹا سیدھا مطلب بیان کر کے یا سے غلط انداز سے پڑھ کر بھی ہنسنے ہنسانے کا موقع پیدا کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ظرافت و بذلہ سنجی ارادی فعل ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی شعر کا غلط مطلب بیان کرے یا اسے غلط طور پر پڑھے تو یہ ظرافت ہوگی ورنہ اگر کوئی شخص اپنی کم علمی یا نادانی سے غلطی کرے تو اس کی یہ غلطی صرف مضحکہ خیز ہوگی۔

(۶) شاعر کبھی دوسروں کی اور کبھی خود اپنی حماقتوں کو بیان کر کے لوگوں کو ہنسنے اور لطف اُٹھانے کا موقع فراہم کرتا ہے جیسے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

(۷) ظرافت و بذلہ سنجی کے اور بھی کئی اہم ذرائع ہیں جیسے تعلی، شوخی، تکذیب، تمسخر، شاعرانہ چالاکی، حسن طلب، توجیہہ، طنز وغیرہ۔ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ بیان موجبِ طوالت ہوگا لہذا ان کی علی الترتیب صرف ایک ایک مثال درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے

ا۔ بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
ب۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
ج۔ کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
د۔ شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
ہ۔ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے
و۔ بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
ز۔ دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی ہیچ مدانی میری
ح۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

واضح رہے کہ ظرافت و بذلہ سنجی کے صرف چند اہم ذرائع اوپر بیان کئے گئے ہیں لیکن وہ فی الحقیقت نہیں

ذرائع تک محدود نہیں ہے بلکہ بقول مسٹر بیرد (Mr. Barres) اس کے طریقے توضیح و تشریح سے بے نیاز اور احصاو شمار سے باہر ہیں۔ زبان کی جتنی بھول بھلیاں۔ الفاظ کے جتنے ہیر پھیر۔ پروازِ تخیل کی جتنی سمتیں اور خیال آرائی کی جتنی راہیں ممکن ہیں بذلہ سنجی کے اتنے ہی طریقے اور ذریعے ہیں۔

ایک پرانا مقولہ ہے کہ "استہزا صداقت کی جانچ ہے" اگرچہ یہ متنازع فیہ امر ہے لیکن بالکل بے بنیاد نہیں کہلا سکتا۔ مثلاً اگر کسی شخص پر کوئی پھبتی کہی جاتی ہے تو وہ اسی وقت پُرلطف اور محرکِ خندہ ہوتی ہے جب وہ اس شخص کی ظاہری وضع قطع یا باطنی اوصاف کے مطابق ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میر تقی میر کے ایک معاصر فضل علی دانا تھے۔ ان کا رنگ نہایت سیاہ اور داڑھی بھی خوب لمبی اور کالی تھی۔ ایک محفلِ مشاعرہ میں جب وہ حاضر ہوئے تو اتفاق سے کرتہ بھی سیاہ پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی اس ہیئتِ کذائی پر سودا کو مذاق کی سوجھی اور بول اُٹھے کہ "ہولی کا ریچھ آیا"۔ اس پر ساری فضا قہقہہ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اگر اس پھبتی میں صداقت کا عنصر شامل نہ ہوتا اور وہ نشانہٗ ظرافت کی وضع قطع کے مناسب نہ ہوتی تو لوگوں کو اس قدر ہنسی نہ آتی۔ شیخ ناسخ نہایت فربہ لحیم و شحیم اور طویل القامت پہلوان تھے۔ کھانا بھی بہت کھاتے تھے۔ بالعموم تہمد باندھے رہتے تھے۔ ان کا سر ہمیشہ گھٹا رہتا تھا۔ ان تمام باتوں کے مدنظر لوگوں نے ان پر "دم کٹے بھینسے" کی پھبتی کہی۔ اس پھبتی کی کامیابی کا راز بھی اس کی صداقت میں مضمر تھا۔

(باقی) **محمد حسین ادیب**

نواہائے راز

تھی اک سیاہ بخت کو کس بات کی امید	آئی سحر بر آتو گئی رات کی اُمید
زندہ ہوں میں تو کس لئے حیراں ہے روزگار	کیا اب نہیں ہے اُس سے ملاقات کی امید
فتنہ ہی اور بارشِ آفات دم بہ دم	ہم اور رو براہیٔ حالات کی امید
اے بوالہوس! نہ پوچھ مزے مجھ سے یاس کے	خوش ہوں کہ قطع ہو گئی دن رات کی امید

مٹ کر بھی اُس کی یاد نہ اِس دل سے جا سکی
حامد کو مجھ سے کیوں ہے محالات کی امید

حامد علی خاں

وہی گیت

وہی گیت پھر سنا دے مرے گیت گانے والے

جسے سُن کے یاد آئیں مجھے بھول جانے والے

وہی گیت جس سے پیدا ہو سکونِ شادمانی

وہی گیت دُور جس سے ہو جنونِ نوجوانی

وہی گیت پھر سنا دے وہی گیت پھر سنا دے

مرے گیت گانے والے مرا رنج و غم بھلا دے

وہی گیت......!

مقبول

کروڑپتی

ہگی بلا کا حسین تھا۔ خوبصورت پر شوکت چہرہ، گھونگرالے بال اور بھوری آنکھیں! بہت ہر دل عزیز تھا اور روپیہ پیدا کرنے کے طریقے کے علاوہ تقریباً اور تمام علوم و فنون کا ماہر تھا!! وہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مار چکا تھا لیکن ذاتی وجاہت اور علم وفضل کے باوجود اُسے کہیں سے پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی تھی۔ آخر کار ہگی" نے وہی کیا وہ اکثر نوجوان کرتے ہیں یعنی ملک کے بیکاروں کی تعداد میں ایک کا اضافہ کر دیا۔ وہ ایک بیکار اور خوشدل جوان تھا۔ صبح و شام نفیس سوٹ پہن کر چھڑی ہاتھ میں لے لی اور کسی سڑک پر نہایت پرشکوہ انداز سے چہل قدمی کر آئے اور گھر آ پڑے۔ چہرہ تو پُر نور تھا ہی پیٹ میں بھی نور ہی نور بھرا پڑا تھا اور اس کے سوا کچھ نہ تھا!

اس پر طرہ یہ کہ آپ مبتلائے عشق تھے۔ ہر وقت یہ خیال تھا کہ آتش عشق سے میری ہڈیاں تک گھل رہی ہیں دل پگھلا جا رہا ہے کبھی فلک پیر کی کج رفتاریوں پر نالاں ہوتے اور کبھی اپنی بے مائگی پر کف افسوس ملتے۔ بیکار تھے آخر کچھ تو کرتے!

لورا مرین ایک پنشن یافتہ کرنل کی صاحبزادی تھیں مشکل یہ تھی کہ ان کو بھی ہگی سے عشق تھا چنانچہ ہگی صاحب ہر روز کوئے جاناں کا طواف کرنے اور بارگاہ عشق میں باریاب ہوتے۔ کرنل صاحب ویسے تو ہگی سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آتے مگر شادی کی بات پر کان نہ دھرتے تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا "میاں پہلے کہیں سے دس ہزار پونڈ لاؤ پھر گھر بسانے کی فکر کرنا"

ایک روز ہگی اپنی معشوقہ سے ملنے جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کا دوست ایلن ٹریور رہتا تھا۔ وہ ایک بہت مشہور مصور تھا اور اگرچہ ہگی کی طرح خوبصورت نہ تھا بلکہ ذرا کریہہ المنظر تھا لیکن اس کے باوجود اس کی مصوری کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ اس کی تصاویر بڑی بڑی قیمتیں اور انعامات حاصل کرتی تھیں۔ فنون لطیفہ کی محبت نے اس کو قوی الحس بنا دیا تھا اور وہ خالص فنی اعتبار سے ہگی کے حسن وجمال کا مداح تھا۔ ہگی کی شکل وصورت میں وہ آرٹ کا ایک بہترین نمونہ دیکھتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ فن کار کو صرف ان لوگوں سے ملاقات کرنی چاہیئے جو اپنے اندر ایک جذب رکھتے ہوں جو سراپا حسن ہوں اور جن کو دیکھنے اور جن سے ہمکلام ہونے سے ایک سرور قلبی حاصل ہو"

ہگی نے زینے کو طے کیا اور کمرے میں داخل ہوا۔ ٹریور ایک فقیر کی تصویر بنا رہا تھا جو قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں فقیر خود کھڑا تھا۔ یہ ایک ضعیف العمر آدمی تھا۔ اس کا چہرہ نہایت رحم انگیز اور مسکین تھا جس پر بے شمار جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے کامل بیکسی، یاس اور حرماں کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے اور ایک

پھٹا پرانا چغہ اس کے شانے پر پڑا تھا۔ اس کا جوتا جگہ جگہ سے گٹھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں ایک مُڑی تُڑی لاٹھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنی ٹوپی میں بھیک مانگ رہا تھا۔

ہگی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "آپ کے پیشِ نظر واقعی ایک عجیب نمونہ ہے"۔

مصوّر نے گردن پھیرتے ہوئے جواب دیا "یقیناً۔ ایسے فقرا آج کل دیکھنے میں نہیں آتے"۔

ہگی نے ایک آہ کھینچتے ہوئے کہا "یہ بڈھا فقیر کیسا مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے لیکن فن کار کے لئے تو اس کا چہرہ ایک نعمتِ عظمیٰ ہے"

ایلن نے جواب دیا "کیوں نہیں لیکن کیا آپ کا خیال ہے کہ ایک فقیر کو خوش و خرم ہونا چاہیئے؟"

ہگی ایک کرسی پر بیٹھ گیا "اس فقیر کو اس طرح کھڑے رہنے کا کیا معاوضہ ملتا ہے؟"

"ایک شلنگ فی گھنٹہ"

"آپ کو ایک تصویر کی کیا قیمت ملے گی؟"

"دو ہزار گنیاں!"

ہگی نے کہا "میرا خیال ہے کہ فقیر کو کچھ فیصدی ملنا چاہیئے کیونکہ آخر یہ بھی تو اتنی محنت اور صبر سے خاموش نمونہ بنا کھڑا رہتا ہے"

ایلن نے جواب دیا "آپ کس قدر بے معنی بات فرما رہے ہیں مردہ رنگوں میں سے ایک زندہ تصویر بنانا یا سنگِ مرمر کے حجاب سے ایک پیکرِ خیال پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ بعض اوقات فن جسمانی محنت و مشقت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا ہے ـــــ اچھا آپ بیٹھئے اور سگرٹ پیجیئے میں ابھی آیا"۔

بڈھے مغموم فقیر نے جو اتنی دیر سے خاموش کھڑا تھا ٹریور کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھایا اور قریب ہی ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور وہ اس قدر رنجیدہ اور افسردہ معلوم ہوتا تھا کہ ہگی سے نہ رہا گیا اس نے ایک پاؤنڈ فقیر کی ٹوپی میں ڈال دیا یہی اس وقت اس کی کل کائنات تھی۔

تبسم کی ایک ہلکی سی لہر فقیر کے ہونٹوں پر دوڑ گئی اور اس نے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے پاؤنڈ قبول کر لیا۔

ٹریور کی واپسی پر ہگی نے اجازت چاہی اور پا پیادہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف چل دیا۔

شام کو وہ کلب گیا۔ ٹریور بھی ایک طرف بیٹھا سگار کے کش لگا رہا تھا۔ ہگی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ کی تصویر تو بخیر و خوبی پوری ہو گی"؟

ٹریور نے جواب دیا "بالکل۔ اور سنیئے تو بڈھا فقیر آپ کی بڑی تعریف کر رہا تھا اور مجھے آپ کا نام اور پتہ اسے بتاتے ہی بن پڑی"

ہگی نے کہا "مجھے امید ہے کہ جونہی میں گھر پہنچونگا۔ وہ دروازہ پر اپنا کاسہ لئے کھڑا ہو گا ـــــ خیر یہ تو آپ مذاق کر رہے ہیں کہ فقیر نے میرے ساتھ اتنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ البتہ میری یہ خواہش ضرور ہے کہ میں اس غریب آدمی کی کوئی معتد بہ امداد کر سکوں۔ وہ کس قدر بدبخت اور

افسردہ تھا۔ ہاں میں اپنے پرانے کپڑے اُسے دے دُونگا۔ اس کا لباس تو بالکل چھیر چھیر ہو رہا تھا۔"

ٹریور نے کہا "ان چیتھڑوں میں وہ کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مکلف لباس میں اس کی تصویر اتنی مکمل نہیں ہو سکتی میرے نزدیک وہ چیتھڑے ہی اس کی زندگی کی رومان ہیں فن کار کے نقطۂ نظر سے اس کا افلاس اس کے لئے نعمتِ عظمےٰ ہے"

ہگی "فن کار کے سینے میں دل کی جگہ فولاد کا ٹکڑا ہوتا ہے۔"

ٹریور۔ فن کار کا دل اور دماغ ایک ہوتا ہے۔ اس کے احساسات و جذبات اس کی تمام تر زندگی پر حکومت کرتے ہیں۔ آرٹ کا کام نفاذِ اصلاحات نہیں۔ یہ سماج کو سدھارنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ہر چیز کو بری ہو یا بھلی اپنے اصلی رنگ میں دیکھے۔ اور اس کا اظہار کر دے ــــ ہاں لورا کی بابت کوئی بات بتائیے۔ فقیر اس کے حالات جاننے کا بھی بہت خواہشمند تھا۔"

ہگی۔ "کیا آپ نے لورا کی بابت بھی سب کچھ اُسے بتا دیا؟"

ٹریور۔ "جی ہاں میں نے کرنل صاحب کی دس ہزار پاؤنڈ والی شرط اسے بتا دی تھی"

ہگی نے غصہ سے کہا "آپ نے الف سے لے کر یٓ تک میرے تمام معاملات ایک فقیر کو اس ہیگانہ طریقے سے بتا دیئے۔"

ٹریور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "پیارے ہگی جسے آپ فقیر سمجھ رہے ہیں۔ وہ یورپ کا رئیس ترین آدمی ہے اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ تمام لندن کو خرید کر آزاد کر دے۔ ہر دارالسلطنت میں اس کا ذاتی مکان ہے۔ وہ سونے کی رکابیوں میں کھانا کھاتا ہے اور روس کو جب چاہے جنگ سے روک سکتا ہے۔ یہ بڈھا فقیر بیرن ہاسبرگ تھا۔ وہ میرا بڑا دوست ہے۔ میری اکثر تصاویر وہی خریدتا ہے ایک مہینہ ہوا اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ایک فقیر کے لباس میں اس کی تصویر بناؤں۔ دیکھئے وہ چیتھڑوں میں کتنا خوبصورت معلوم ہوتا تھا!"

ہگی نے تعجب سے کہا "اخاہ! اور میں نے تو اسے ایک پاؤنڈ بھی دے دیا۔ جسے اُس نے شکریہ سے قبول کیا تھا۔"

ٹریور نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "آپ کی دریا دلی کے کیا کہنے۔ شاباش!"

ہگی۔ "آپ نے اس وقت مجھے یہ کیوں نہ بتایا کہ میں ایسی بیوقوفی نہ کرتا۔"

ٹریور۔ "اول تو مجھے آپکے اس بے پناہ جذبۂ سخاوت کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ دوسرے اس وقت بیرن صاحب جیسا کہ آپ دیکھ رہے تھے تعارف کے لئے مناسب لباس نہ پہنے ہوئے تھے۔"

ہگی۔ "توبہ! کیسی بے وقوفی سرزد ہوئی!"

تھوڑی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ ہگی اپنی اس دریا دلی پر اظہارِ تاسف کرتا رہا اور ٹریور اس کو سراہتا رہا۔

رنجیدہ اور افسردہ اپنی اس حرکت پر شرمایا ہوا ہگی مکان پر پہنچا اور لیٹ گیا۔

صبح سویرے اس کے نوکر نے ایک ملاقاتی کارڈ دیا۔ جس پر لکھا تھا۔ **بیرن ہاسبرگ**

ایک خوش پوش نوجوان اندر داخل ہوا جس نے ہگی کو مخاطب کر کے کہا "مجھے بیرن ہاسبرگ نے آپکے پاس یہ لفافہ دے کر بھیجا ہے"

ہگی نے لفافہ کا عنوان پڑھا۔ **ایک فقیر کا تحفۂ شادی**

اندر دس ہزار پاؤنڈ کا چیک ملفوف تھا!

جیوا د میرٹھی

(ترجمہ)

غزلیات

(۱)

طلبِ عاشقِ صادق میں اثر ہوتا ہے | گو ذرا دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

خون روتا ہوں مگر کس کو ترس آتا ہے | جان کھوتا ہوں مگر کون خبر ہوتا ہے

دار و منصور کے قصے سے سبق حاصل کر | بے خبر طبقۂ عشاق نڈر ہوتا ہے

مجھ سے مت کہہ کہ محبت میں رفیقِ رہِ دوست | کون ہوتا ہے فقط شوقِ سفر ہوتا ہے

فیض اٹھانا ہے تو چل خدمتِ آزاد میں چل
کہ فقیروں کی توجہ میں اثر ہوتا ہے

(آزاد انصاری)

(۲)

داغ سینے کے یاد آتے ہیں | تارے جس وقت جھلملاتے ہیں

ایسی جلدی ہی کیا عدم والو | بانگ دو کہ ہم بھی آتے ہیں

کیا محبت بھی ہے خلل کوئی | لوگ مجنوں ہمیں بناتے ہیں

رنگِ فطرت کہاں بدلتا ہے | مدرسوں میں عبث پڑھاتے ہیں

اُن کو پہروں سلام کرتا ہوں | تب کہیں جاکے سر ہلاتے ہیں

نت نئے مشغلے ہیں سیفی کے
آج کل بھیروں اڑاتے ہیں

(سیفی نوگانوی)

(۳)

ایک طلسمِ مذہبی مستی حسنِ یار میں | نرگسِ سحر کار میں زلفِ گرہ نگار میں

کلفتِ انتظار میں دل ہی خفا بہار سے | رنگ بھی ہو بہار کا رنگ بھی ہو بہار میں

تلخیٔ عشق دل میں ہے غم مری آب و گل میں ہے | زہر ملا کے دو مجھے بادۂ خوشگوار میں

خاک ہی رات کا سکوں کم نہ ہوا امرا جنوں | چاند بھی جا کے سو رہا دامنِ کوہسار میں

جھوم رہی ہیں کیف میں نرگس و لالہ و سمن | بادہ کشو چلے چلو رقص ہے لالہ زار میں

کون بتائے جاکے یہ اُن خرامِ ناز کو | عشقِ غریب مٹ گیا عشق کی رہگذار میں

مطربِ دل نواز سن جوگ میں کوئی چیز چھیڑ
سوز و گداز عشق کا رنگ نہ تھا ملہار میں

(عابد علی)

(۴)

یہ رنج ناپائدار کیا ہے یہ عیشِ بے اعتبار کیا ہے
یہ دردِ راحت نواز کیا ہے یہ راحتِ دل فگار کیا ہے

نوازشِ شوخ کی وہ کیفیتیں کوئی میرے دل سے پوچھے
گذارشِ التفات پر اُن کا پوچھنا بار بار "کیا ہے؟"

کسی سے ملنے کی تو نے اے دل قسم تو کھائی ہے ہو کے نادم
مگر ترا اعتبار کس کو، مگر ترا اعتبار کیا ہے

ہزار باتیں بناؤ اکبر ہزار الفت چھپاؤ اکبر
یہ نالۂ دل فگار کیا ہے یہ دیدۂ اشکبار کیا ہے

(جلال الدین اکبر)

(۵)

نہ طاقت آہ بھرنے کی نہ یارا ضبط کرنے کا | مریضِ غم بقدرِ ہمت نہ جینے کا نہ مرنے کا

مجھے کچھ شغلہ سا ہوگیا ہے آہ بھرنے کا | ترا ہی نام جینے کا تجھی کو یاد کرنے کا

تڑپ جاتی ہے خود بجلی مگر تڑپا نہیں سکتی | تمہیں آتا ہے ڈھب ہر ایک کو بیتاب کرنے کا

مرے قلب و جگر کا چارہ گر نامی کیا درماں | نہ اس کا درد تھمنے کا نہ اس کا زخم بھرنے کا

دلِ مضطر کو اپنے ضبط کی تعلیم کیونکر دوں | طریقہ کس طرح سکھلا دوں پارے کو ٹھہرنے کا

تسلی عہد و پیماں سے زیادہ مجھ کو دیتا ہے | یہ انداز آپ کے منہ پھیر کر انکار کرنے کا

فلک پر کہکشاں ہے جنگل میں دریا باغ میں نہریں | گماں میں ہے رستہ کون سا تیرے گزرنے کا

نکل پڑتے ہیں آنسو جب کسی سے بات کرتا ہوں | نتیجہ کیا یہی ہوتا ہے ناصح ضبط کرنے کا

بوقتِ رخصتِ محبوب بھی نکلا نہ دم تن سے | الٰہی اور پھر وہ کونسا ہے وقت مرنے کا

عجب افسردہ کیوں ہے سیر کو چل کوہ و صحرا کی | فضا تو دیکھ ندی کی سماں تو دیکھ جھرنے کا

(میر سعادت حسین نخیب)

ہندی ادب کے جواہر پارے

میری دنیا

جس دنیا میں نہ پھول کھلتے ہیں، نہ بھونرے گونجتے ہیں، نہ بانسری بجتی ہے۔ جہاں رونا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے، جہاں امواج ہی امواج ہیں اور ساحل ناپید ہے، جہاں موسمِ بہار کا نام و نشان ہی نہیں ہے ـــ اے شاعر! میں اس نرالی دنیا کا رہنے والا ہوں۔

ـــــــــــــــ

جہاں ہمدردی آنسو بن کر سکونت پذیر ہے، جس کی فضا پر شاعروں نے دل نچھاور کر دیئے ہیں، جہاں نہ صبح ہوتی ہے اور نہ کرنوں کی کلیاں کھلتی ہیں۔ جہاں دردِ دل کی شدت سے نہ صبح کا پتا چلتا ہے نہ شام کا، جہاں محبت ایک بے پناہ آگ سمجھی جاتی ہے ـ اے شاعر! میں اس دنیا کا رہنے والا ہوں۔

ـــــــــــــــ

جہاں رہگیر تاروں کے پیالوں میں اپنے آنسو بھر بھر کر اور اندھیرے میں رک رک کر چلتے ہیں، جہاں زندگی کی تمناؤں اور آرزوؤں کی چتا بنتی ہے، جہاں شاعری آگ لگاتی ہے اور تخیل ہنستی ہے، جہاں کی ملکہ آہ ہے اور جہاں کی کسن جبینہ کراہ ہے۔ اے شاعر! میں اس دنیا کا رہنے والا ہوں۔

(جاگرن سے ترجمہ)

ـــــــــــــــ

میں

"میں نیلے رنگ کا بادل بلکہ بادل کا بھی چھوٹا سا ٹکڑا ہوں اور اپنا دکھڑا رونے کے لئے ہمیشہ مارا مارا پھرتا ہوں۔"

"میں وہ مرجھایا ہوا پتہ ہوں جو خزاں کے دامن میں چھپتا پھرتا ہے۔"

"میں دنیا کے اس حصے پر گرنے والی بوند ہوں جس پر ریگستان غفلت کی نیند سو رہا ہے۔"

"میں بدنصیب بھکاری کی آنکھوں میں پلنے والا آنسو ہوں جو اس کے برے دن میں ڈھلک پڑتا ہے۔"

"میں مٹی کا ایک پتلا ہوں، بلکہ پتلے کی غیر محسوس بیقراری۔ میں ایک چھوٹی سی کہانی ہوں جسے سنکر پتھر بھی پانی ہو جاتا ہے۔"

"میں چرخ پر زندگی گزارنے والی بیوہ کی چھوٹی سی جھونپڑی ہوں۔ میں یتیم کی وہ آہ ہوں جو جھونپڑیوں میں فروخت ہوتی ہے"۔

"میں ٹھوکر کھانے والی چھوٹی سی ٹھیکری ہوں، حالانکہ میں پہلے "عمر خیام" کا ساغر تھا"۔

(جاگرن سے ترجمہ)

نچھاور

میری جان! میں کیونکر تمہاری پوجا کروں؟

میں بڑے شوق سے جذبات کے شگفتہ پھولوں کو نظم کے رشتے میں گوندھ کر لائی تھی کہ تمہارے قدموں پر چڑھاؤنگی اور قدموں کی خاک لوں گی، لیکن میں الھڑ نادان تمہاری زیب و زینت اور حسن و جمال کے دیکھنے میں ایسی محو ہوئی کہ میں اپنی سُدھ بُدھ ہی بھول گئی۔ پھر میں کیونکر تمہاری پوجا کروں؟ میں تو خود تم پر نچھاور ہو گئی"۔

میری جان! میں تمہیں کیونکر رجھاؤں؟

میں نادان، آج سوہنی گانا گانے آئی تھی سینے میں جذبات کا طوفان برپا تھا۔ دل بیقرار ہو رہا تھا لیکن میں نے جوں ہی آواز درست کر کے گانا شروع کیا، میں راگ بن کر اڑ گئی اور میری بین تان بن کر۔ پھر میری جان! میں تمہیں کیوں کر رجھاؤں؟ میں تو خود تم پر نچھاور ہو گئی۔

میری جان! میں تمہیں کیوں کر سجاؤں؟

میں نے چاہا تھا کہ تمہاری پیاری صورت کی تصویر بنا کر تمہاری یادگار کے طور پر اپنے دل میں رکھ لوں۔ لیکن میں نے جوں ہی رنگ میں ڈبو کر قلم کو پھیرنا چاہا، میں خود تصویر کی طرح بے حس و حرکت بن گئی۔ پھر میری جان میں تمہیں کیوں کر سجاؤں؟

(ہنس سے ترجمہ)

ابو محمد امام الدین

سجدۂ شوقے کہ می بالد بہ پیشانی مرا

(غالب)

جو تو کہے گی تو دریا بھی چیر جاؤں گا،
لڑوں گا سیل سے پیہم تھپیڑے کھاؤں گا
جو تو کہے گی تو تارے بھی توڑ لاؤں گا
زمیں پہ ایک نیا کہکشاں بناؤں گا
وہ لعل جن سے ہو قندیلِ عرش شرمندہ
میں اُن کو تیرے لئے فرشِ رہ بناؤں گا
فضائے نور کے خوابیدہ جلوہ زاروں کو
ترے حریم محبّت میں کھینچ لاؤں گا
چرا کے لاؤں گا حوروں کی مسکراہٹ میں
ریاضِ خُلد کے پھولوں کو توڑ لاؤں گا
اُڑا کے لاؤں گا ناہید کے حسیں نغمے
لبِ چناب تجھے بیٹھ کر سناؤں گا
مگر خدا کے لئے ایک بار آ بھی جا
میں قلبِ مردہ ہوں اے جاں مجھے جلا بھی جا

عطاءاللہ سجاد

فلسفی کی ڈائری

بہت سے لوگ اپنے مصائب کا باعث خود ہوتے ہیں۔ ان کا تخیل ہمیشہ مصنوعی مصائب کی اختراع میں لگا رہتا ہے۔ مگر فلسفیوں کے پیدا کردہ مصائب نہایت مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ ان کا دماغ ہمیشہ ایسے ہی مصائب کی جولانگاہ بنا رہتا ہے۔ ذیل میں ایک فلسفی کی ڈائری کے چند اوراق پیش کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ فلسفیوں کی زندگی کتنے لاانتہا مصائب سے معمور رہتی ہے۔

پیر:- جب سیارے ساکن و جامد ہو جائیں گے، چاند شق ہو جائیگا اور زمین اپنی قدیم محوری حرکت بند کر دیگی اس وقت کتنی مصائب بپا ہونگے۔ کیا معلوم کہ ان تغیرات کا آغاز ہو چکا ہو اور مستقبل قریب میں ہم تمام ہلاک ہو جائیں۔ انسان کس درجہ بے عقل ہے جو خوشیاں مناتا ہے ہنستا ہے کھیلتا ہے اور اس ہلاکت سے بالکل بے خبر ہے ــ!

منگل۔ رات بھر بڑی بے چینی رہی۔ مگر جب صبح اٹھا، تو اس خیال سے کچھ تسکین حاصل ہوئی کہ یہ تغیرات کسی نامعلوم وقت پر وقوع پذیر ہوں گے۔ میں خوش ہوں کہ میں ان ہوشربا تغیرات سے قبل ہی مر چکا ہونگا اور ان کے مہلک اثرات سے محفوظ رہونگا۔ مگر یہ جو جغرافیائی تغیرات آہستہ آہستہ نمودار ہوتے رہتے ہیں میرے لئے موجب صد آلام ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق انگلستان ایک کروڑ سال کے عرصے میں بحیرۂ منجمد شمالی تک پہنچ جائیگا۔ اس وقت ہمارے بچے بحیرۂ مذکور کی یخ بستہ آب و ہوا کو کیسے برداشت کر سکیں گے۔ دورِ حیات میں ایک کروڑ سال ایک قلیل عرصہ ہے ـــ ایک لمحہ ـــ میرا جسم انگلستان پر نازل ہونے والے مصائب کے خیال سے ہر وقت کانپتا رہتا ہے۔

بدھ۔ میرے حساب سے متوقع دُم دار تارا آج رات کو نمودار ہوگا۔ اگر یہ زمین سے ٹکرا جائے تو دنیا فنا ہو جائے ـــ جاہل لوگ کتنے عالیشان مکانات بنا رہے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں یہ تغیر عنقریب ہی واقع ہونے والا ہے۔

تارے کا نمودار نہ ہونا بھی ہلاکت آفریں ہوگا کیونکہ دُمدار تارے سورج کو روشنی بخشتے ہیں اور اگر سورج اپنی مطلوبہ ضیا سے محروم رہ جائے تو یہ سوزندہ موم بتی کی طرح گر پڑیگا۔ اور زمین اس کی روشنی کے بغیر گہوارۂ مصائب بن جائے گی۔

جمعرات۔ متوقع تارا نمودار نہیں ہوا، اور میں محزون ہوں اولاً یہ کہ میرا حساب غلط نکلا ثانیاً سورج روشنی سے محروم رہ جائیگا۔ ثالثاً عقلمند آدمی ہماری غلط تعبیروں کو بہ نظرِ تحقیر دیکھیں گے رابعاً اگر تارا آج رات نمودار ہو بھی جائے تو اس کا زمین سے ٹکرانا لابدی ہے۔

جمعہ۔ ہماری جماعت اس تارے کو دیکھنے کے لئے باہر آئی ہوئی ہے ہم نے سولہ ایسے تارے دیکھے ہیں اور اب ہم سب کی نظریں متوقع تارے پر مرکوز ہیں۔

ہفتہ۔ میں چاند کی بے قاعدہ حرکات سے بہت گھبرا رہا ہوں۔ آج میری بیوی غائب ہوگئی ہے، اگرچہ یہ میرے لئے باعثِ حزن نہیں۔ جو چیز میرے لئے سب سے زیادہ غم انگیز ہے وہ چاند کی بے قاعدگی ہے ؀

(ترجمہ)

طاہر قریشی

محبّت

چشمے دریا میں،
اور دریا سمندر میں جا ملتے ہیں،
فضائے آسمانی کی ہوائیں ایک دوسرے سے ہمکنار ہوتی رہتی ہیں۔
دنیا کی کوئی شے تنہا نہیں۔
کائنات کے جملہ مظاہر قانونِ فطرت کے مطابق اپنے آپ کو ایک دوسری ہستی سے وابستہ کر دیتے ہیں پھر کیوں نہ میں اپنی ہستی کو تیری ذات میں محو کر دوں؟

سر بہ فلک کہسار مصروفِ آسماں بوسی ہیں۔
موجیں ایک خاص عالمِ کیف و سرمستی میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہی ہیں۔
کوئی پھول اپنے ہم جنس سے نفور رہے
تو اُس کی یہ خطا قابلِ عفو نہیں سمجھی جائے گی۔
ضیائے مہر کرۂ ارضی کو اپنی آغوشِ اُلفت میں لئے ہوئے ہے۔
چاندنی فرطِ محبت میں سطحِ محیط کو چومتی رہتی ہے۔
اس تمام بوس و کنار سے کیا حاصل؟
اگر تو مجھے پیار نہ کرے!

"زمانہ"

اَیُوبِن

حسین اَیُوبِن ——— مر چکی ہے ——— میں چاہتا ہوں (۱) کہ چند گھنٹے اس کے پاس تصور کی گہرائیوں میں غرق ہو کر گزاروں! یہ اس کی کتابوں کی الماری ہے، یہ اس کا بستر ہے، یہ پھول ہے جو اس نے ابھی ابھی توڑا تھا، اور جو شیشے

کے گلاس میں اس کی روح کی پرواز کے ساتھ ہی مرجھا رہا ہے۔ دروازے بند پڑے ہیں، کمرے میں کوئی روشنی نہیں صرف دو شعاعیں دروازوں میں سے اندر داخل ہو رہی ہیں۔

وہ سولہ برس کی تھی جب وہ اِس دنیا سے چل بسی شاید وہ میرے نام سے بھی واقف نہ تھی۔ ابھی اُس کی عمر ہی کیا تھی کہ وہ محبت کو سمجھتی۔ اس کے علاوہ اُس کی زندگی بے حساب امیدوں اور بلند مقاصد سے معمور تھی ـــــ بہت سے فرائض اور کم تفکرات سے ! حتیٰ کہ کسی مخفی طاقت نے اچانک اُسے اوپر اٹھا لیا !! اب صرف اُس کی سنہری بھویں اُس کے حسن کا آخری نشان ہیں۔

(۲)

اَیُولِن ! کیا اب اِس کا وقت نہیں رہا کہ تیرے اور میرے درمیان کوئی رشتۂ محبت قائم ہو ؟ کیا اس لئے کہ تیری روح میں بلندی اور پاکیزگی تھی اور با اقبال ستارے تیری پیدائش پر طلوع ہوئے تھے ؟ کیا اِس لئے کہ میرا سن تجھ سے تین گنا بڑا ہے ؟ کیا اِس لئے کہ ہماری ملاقات میں ناقابلِ اندازہ بُعد حائل ہو چکا ہے ؟ اور کیا اس لئے کہ سوائے انسان ہونے کے ہم دونوں میں کوئی دنیاوی تعلق نہیں ؟

(۳)

نہیں نہیں ! وہ خدائے بزرگ و برتر جس نے اُلفت کو پیدا کیا پہلے محبوب کے دل میں عشق کی آگ بھڑکاتا ہے ! تو میں اپنی اُلفت کی بنا پر تجھ سے اُلفت کی درخواست کرتا ہوں۔ خواہ اس کے ایفا میں صدیاں گزر جائیں، خواہ تجھ سے ملنے کے لئے مجھے ایسے سینکڑوں جہانوں کا سفر کرنا پڑے۔ مگر وہ وقت آخر کار آنے والا ہے اور آ کر رہے گا جب کہ اے میری محبوبہ ـــــ میں سمجھ سکوں گا کہ تیرا معصوم اور پاک وجود دنیا میں کیا مقصد لے کر آیا تھا ؟ تیری سنہری زلفیں کیوں اس قدر جاذبِ نگاہ تھیں ؟ تیرے ہونٹ کیوں اس قدر سرخ اور دلربا تھے ـــــ دلربا، گلاب کی طرح ؟

(۴)

مجھے تجھ سے بے انتہا محبت ہے اور اگرچہ میرا دل اُلفت سے معمور ہے پھر بھی اس میں تیرے دلفریب تبسم کے لئے، سُرخ لبوں کے لئے، اور سنہری بالوں کے لئے جگہ باقی ہے !

اس لئے، دیکھ میں یہ پنکھڑی تیرے یخ بستہ سفید ہاتھ میں بند کئے دیتا ہوں، جب تُو دوبارہ اُٹھے تو یاد کر لینا اور سمجھ جانا ـــــ !!

'ادبی دنیا'

میاں بی بی کا رشتہ

(از روئے ظرافت)

(از جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی)

یہ رشتہ بھی عجیب ہے۔ اِسے جس قدر مضبوط سمجھئے اسی قدر کمزور ہے۔ اس کی مضبوطی کا حال تو یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے فرمانے کے بموجب انسان اس کے لئے اپنے ماں باپ چھوڑتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ یہ رشتہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا جسے جوڑے اُسے انسان توڑ نہیں سکتا۔ ہندوستان کی عورتوں کا عقیدہ ہے کہ میاں بی بی کا رشتہ ازل میں قرار پا جاتا ہے۔ اُسی کے موافق پیچھے سے دنیا میں شادیاں ہوتی ہیں۔ ہندو مذہب میں تو میاں بی بی جدا ہی نہیں ہو سکتے اور عیسائی مذہب میں بھی طلاق کا خیال تھوڑے ہی دنوں سے ہوا ہے۔

دنیا میں مرد عورت کی محبت کے افسانے ہر ملک میں اتنی کثرت سے مشہور ہیں کہ ان میں مبالغہ ثواب کے برابر سمجھا جاتا ہے حالانکہ دونوں کی جوانی کے بعد اُس وقت کی باتیں مضحکہ کے لائق رہ جاتی ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں شروع میں کہہ آیا یہ رشتہ جس قدر مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ اُس سے زیادہ اُلجھن کا بھی سبب ہے۔ خاص کر جب کہ تعلیم و تہذیب کا رواج زیادہ ہو۔ میاں اگر پڑھے ہوئے ہیں اور بی بی نہیں تو اُلجھن کے سوا اور اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ میاں کے دماغ میں ولایت کی بُو سمائی ہے اور بی بی کو گھر سے باہر نکلنا کبھی نصیب نہ ہوا تو دونوں میں اتفاق کی اُمید خلافِ قیاس ہے۔ بی بی کو اگر میر حسن کی مثنوی ازبر ہے اور میاں کو دلائل الخیرات تو شاید ہی ایک سی طبیعت کا یقین ہو سکے۔

جہالت میں اگر مرد جاہل ہے تو اکثر عورتوں کی بربادی کا سبب ہوتا ہے لیکن اگر عورت مرد سے زیادہ لکھی پڑھی ہے تو مرد کو بہت آرام کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔

میاں بی بی میں اُلجھن کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب دنیا میں کوئی چیز دیرپا نہیں تو میاں بی بی کی محبت کو ہمیشہ کے لئے پائدار سمجھ لینا اپنی ہی سمجھ کا قصور ہے۔ عربی کی ایک مثل مشہور ہے کہ النکاح فرح شہرٌ و ثقل دھرٌ و کسر ظھرٌ و غم دھرٌ وغیرہ۔ ہر ایک اور عیب زیادہ لیکن یہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔ میاں جو بی بی کی نظر سے کسی وقت اوجھل نہ ہوں تو بی بی پر ترس کھانا بیجا نہیں۔ کتاب سے جی اکتائے تو طاق پر رکھ دیجئے۔ میاں کو طاقِ نسیان پر رکھنا مشکل ہے گرمیوں میں دوپٹہ سے جی گھبرائے تو اتار کر رکھ دیجئے۔ میاں کو جِنّ کی طرح سر سے اتارا نہیں جاتا۔ سودا لینے کو بازار بھیجنے کا بہانہ بیکار کہ سودا سلف کے لئے ماما موجود ہے۔ اِدھر صبح نمودار ہوئی اُدھر اِن کا رُخِ زیبا۔ اِدھر آفتاب

چھپا اُدھران کے بچھونے کی فکر ہوئی۔ کھانے میں ذرا دیر ہوئی اور یہ شیر کی طرح کھانے کو دوڑے۔ میاں کا کوئی یار آگیا اور بی بی کو فکر ہوئی کہ ابھی چولھے کے پاس سے ہٹی ہوں پھر تو اچولھے پر چڑھانا پڑے گا۔

بچہ بیمار ہو کر بچا ہے تو بی بی مولود شریف کے لئے کہہ رہی ہیں اور میاں اربابِ نشاط کو بلانا چاہتے ہیں۔ وہ کچھ کہتی ہیں یہ کچھ ۶ من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال کا معاملہ ہو رہا ہے۔

بی بی کسی تقریب میں ملنے کو چلیں تو نیا دوپٹہ نکالا گیا۔ میاں کے سامنے وہی چیکٹ کپڑے جو باورچی خانہ کے دھوئیں کی بُو میں بسے ہوئے ہیں۔ یہ تن ہیں جتنے تکلف ہیں غیروں کے لئے۔ میاں "گھر کی مرغی دال برابر"۔

امرسن صاحب نے ایک نقل بڑی ہنسی کی لکھی ہے کہ تیمور کی بیبیوں میں زبیدہ نامی ایک بیگم بہت خوبصورت تھی۔ تیمور کو کہتے ہیں کہ بدشکل تھا۔ کچی ڈاڑھی۔ گال پچکے ہوئے۔ سانولا رنگ تھا۔ اور ٹانگ سے تو سب ہی جانتے ہیں کہ لنگڑا۔ اس پر رات دن کی معرکہ آرائیوں اور لڑائیوں کی تکالیف میں شکل کا تو خون ہی سمجھئے۔

ایک دن تیمور کو اپنی شکل آئینہ میں دیکھ کر رنج ہوا کہ خدا نے اس قدر دولت و اقبال دیا۔ اتنے ملکوں کا بادشاہ بنایا مگر خوبصورتی جو اکثر معمولی آدمیوں کو بھی میسّر ہے مجھے نہ دی۔ تیمور کا مزاج تو عجیب تھا ہی اُس کو اُس دن بڑا رنج رہا۔ یہاں تک کہ سُنا ہے کہ کھانا بھی نہیں کھایا۔

وزیروں اور مصاحبوں نے سمجھایا کہ حضور اس بات کا خیال نہ کریں۔ خدا نے تمام دنیا کے خوبصورتوں پر حضور کو اختیار دیا ہے۔ یہ کیا بڑی بات ہے؟

وزیروں کے سمجھانے بجھانے سے تیمور محل میں کھانا کھانے گئے اور قصہ زبیدہ بیگم سے بیان کیا، زبیدہ بیگم نے کہا کہ حضور تو خاصہ نوش فرمائیں مگر میرا کھانا پینا تو چھُٹا۔ تیمور نے پوچھا کہ میں نے جو مجھے آئینہ دیکھنے سے رنج ہوا تھا چھُڑا دیا تم کیوں اتنا خیال کرتی ہو؟

زبیدہ نے جواب دیا کہ حضور نے تو ایک دفعہ اپنی صورت آئینہ میں دیکھی تو حضور کی بھوک جاتی رہی۔ مجھے تو ہر روز صبح اُٹھ کر چہرۂ اقدس کی زیارت کرنی پڑتی ہے۔ میرا تو کھانا پینا اب بند ہی سمجھئے۔

خیر یہ تو از روئے تمسخر سہی۔ لیکن سوسائٹی نے بڑی عقلمندی کی کہ اس رشتہ کو از روئے قوانین اور رسم و رواج سب سے زیادہ مضبوط بنایا کہ دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ کتنا ہی زور کریں یہ جنبش نہ کھائے ورنہ ڈر تھا کہ ؎

اگر زنجیر باشد بگسلانند

ساقی

مطبوعات

سیلابِ تبسم ۔ یہ جناب شوکت تھانوی کے چوبیس مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو دو سو اسی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس دور کے مزاحیہ نگاروں میں حضرتِ شوکت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ان کے بعض مضامین مثلاً سودیشی ریل اور تعزیت وغیرہ اتنے مقبول ہوئے ہیں کہ ہر زبان سے ان کا چرچا سننے میں آتا ہے افسوس کہ ہم وقت کی کمی کے باعث سیلابِ تبسم کا پورا مطالعہ نہیں کر سکے لیکن ایک عام نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی صفائی اور اندازِ بیان کی شستگی کے ساتھ لطیف مزاحیہ اشارات نے مضامین میں جان ڈال رکھی ہے اس کتاب کا دیباچہ ہمارے فاضل دوست اور مشہور مزاحیہ نگار مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے لکھا ہے

کتاب مجلد فروخت ہوتی ہے کاغذ بہت اچھا لگا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے

مینیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے طلب فرمائیے

جنت کا بھوت معنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی۔ حجم ۶۷ صفحات مجلد۔ کاغذ کتابت طباعت اور جلد حسبِ معمول عمدہ قیمت ۱۲؍ مرزا صاحب کا یہ ایک دلچسپ قصہ ہے جس میں ہندوستانی گھرانوں کی زندگی کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے افسانے کے ہیروئن کا کردار بہت قابلیت سے اجاگر کیا گیا ہے۔ قصے میں اول سے لیکر آخر تک زندگی زندہ دلی اور نوجوانی کی فضا پیش نظر رہتی ہے پلاٹ دلچسپ اور مربوط ہے اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو "گھر کی مرغی دال برابر" کا طلسم توڑ کر نہایت دلآویز پیرایہ میں نصیحت کی گئی ہے۔

پتا :۔ دفتر کتابت عظیم بیگ صاحب جودھ پور مارواڑ

دیکھا جائیگا معنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی حجم ۱۱۲ صفحات کاغذ کتابت اور طباعت نفیس۔ جلد خوبصورت قیمت ایک روپیہ "دیکھا جائے گا" افسانے کی ہیروئن کے والد کا تکیہ کلام ہے۔ افسانے میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں اس کے علاوہ اس جملہ کو ضرورت سے زیادہ فراخدلی سے پامال کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہنسی کے بجائے اسے پڑھ کر شاید رونا آتا ہے۔ اس افسانے میں کردار زیادہ روشن اور واضح نہیں ہو سکے اور زیادہ توجہ قصہ پورا کرنے پر صرف کی گئی ہے۔ افسانہ معمولی ہے۔ اس میں دو دولت پرست لفنگوں کا پول کھولا گیا ہے اور بالآخر مالدار ہیروئن کی شادی ایک قلاش ایم اے سے ہوئی ہے قصہ میں نکاح ہونے کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے وہ موجودہ صورت میں بالکل غیر ضروری ہے۔ نہ اس سے معلومات میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ قصہ کی دلچسپی بڑھتی ہے بلکہ اس سے عام پڑھنے والے کو تمام قصہ بے ربط معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان معمولی باتوں سے قطع نظر "دیکھا جائیگا" ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ ہماری ناقص رائے میں مرزا صاحب کو صحتِ زبان اور فقروں اور جملوں کے ربط کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔ **دفتر کتابت** (مرزا عظیم بیگ) جودھ پور مارواڑ سے منگوائیے ؀

فہرستِ مضامین

جلد ۲۴ — "ہمایوں" بابت ماہِ ستمبر ۱۹۲۳ء — نمبر ۳

اڈیٹر:- (۱) مولوی محمد حسین صاحب ادیب (۲) رقیں حباب۔

قیمت فی پرچہ ۸ر — چندہ سالانہ ۵ر مع محصول

اعلان

"ہمایوں" کے چندے اور حجم میں اضافہ

گوشتہ اعلان کے مطابق تقریباً دو سال تک "ہمایوں" اپنے معاونین کو ۵ کے بجائے ۴ سالانہ کی رعائتی قیمت پر مہیا ہوتا رہا ہے۔ چندے میں اس تخفیف کا محرک ہمارا یہ جذبہ تھا کہ ملک کی اقتصادی حالت کے پیش نظر "ہمایوں" کم از کم قیمت پر شائقین کو بہم پہنچایا جائے۔ تاکہ اس کے حلقۂ اثر میں توسیع ہو اور اس کی حقیر خدمات سے اہلِ ملک کی بیش از بیش تعداد مستفید ہو سکے لیکن "ہمایوں" کو اپنا موجودہ ظاہری و معنوی معیار قائم رکھنے کے لئے بیش قرار مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے اور دو سال کے تجربے سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ محض مصارف برداشت کرنے کے لئے بھی سابق چندے کا بحال ہونا اشد ضروری ہے۔ کیونکہ ہماری انتہائی مخلصانہ کوشش کے باوجود رعائتی قیمت پر آمد اور خرچ میں توازن پیدا نہ ہو سکا اور ثابت ہوا کہ وہ کم از کم قیمت جس پر ہم "ہمایوں" شائع کر سکتے ہیں ۵ ہی ہے چنانچہ ستمبر ۱۹۳۳ء سے "ہمایوں" کا سالانہ چندہ پانچ روپے چھ آنے مع محصول ہو جائے گا۔ اگر "ہمایوں" کی اشاعت میں غیر معمولی اضافہ نہ ہوا تو ہمیں اس کی شکایت نہیں، عام مذاق سے الگ رہنے کی سزا ہے جو ہمیں چار و ناچار منظور ہے۔

حجم میں اضافہ

چندے کی تخفیف کے ساتھ ہی ہم نے ایک کاپی کم کر کے "ہمایوں" کا خط بہت خفی کر دیا تھا اور سطریں بڑھا دی تھیں مگر اس سے کتابت کی خوبصورتی پر اثر پڑا اور مجبوراً ہم نے یہ شیوہ ترک کر دیا کیونکہ "ہمایوں" میں خوبصورتی کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہم بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ محض مواد زیادہ دینے کے لئے خط باریک کرنا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ اس کے بجائے حجم بڑھا دینا بہتر معلوم ہوا ہے چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۳ء سے "ہمایوں" کے حجم میں اضافہ ہو جائیگا اور اس کے بعد رسالہ ۸۴ صفحات کے بجائے ۹۶ صفحات پر شائع ہوا کرے گا۔ اتنا حجم ایک آدھ ماہوار رسالے کے سوا کسی ہمعصر ماہ نامے کا نہیں۔

موجودہ معاونین سے خاص رعایت

اس اعلان کے باوجود اُن معاونین سے جن کا چندہ دسمبر ۱۹۳۳ء تک یا اس سے پہلے ختم ہو گا سالانہ چندہ صرف پانچ روپے مع محصول لیا جائیگا یعنی انہیں سابق رعائتی چندے سے صرف دس آنے زائد ادا کرنے پڑیں گے اور اسی چندے میں وہ حسبِ معمول "ہمایوں" کا نفیس سالگرہ نمبر حاصل کرنے کے حقدار ہوں گے۔ اس کے بعد سالانہ چندہ سب کے لئے پانچ روپے چھ آنے مع محصول ہو جائے گا۔ اور ششماہی چندہ تین روپے مع محصول ہو گا۔

ہم "ہمایوں" کو بلند سے بلند تر معیار پر پہنچانے کے آرزو مند ہیں لیکن افسوس کہ اہل ملک اپنی قومی زندگی میں ادبیات کی اہمیت کو شاید صحیح طور پر محسوس نہیں کرتے ہمیں اپنے موجودہ معاونین سے توقع ہے کہ وہ آئندہ سال نہ صرف اپنی معاونت برقرار رکھیں گے بلکہ "ہمایوں" کی اشاعت میں کسی قدر توسیع کی کوشش بھی کریں گے۔ اگرچہ اس کی زیادہ توقع نہیں۔

حامد علی خاں

جہاں نما

عیسائیوں، بدھوں اور ہندوؤں کی مصوّری

حال ہی میں پروفیسر نیوگی نے اس موضوع پر ایک دلچسپ مضمون شائع کیا ہے ذیل میں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:۔

مسیحی مصوری کی خصوصیات

عیسائی مذہب کا مطالعہ کرنے والوں کو ایک بات خاص طور پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مذہبِ عیسوی اگرچہ امن، مسرت اور سکونِ قلب کا مذہب ہے لیکن یسوع کی اکثر تصاویر اور مجسموں میں اس کا چہرہ ہمیشہ اُداس اور ملول نظر آتا ہے۔ یہ تصاویر یسوع کے بچپن کی ہوں یا جوانی کی اداسی ہر حال میں ان کی نمایاں خصوصیت ہوتی ہے۔ یہ چہرہ امن و مسرت کے اُس پیغام کے بالکل متناقض معلوم ہوتا ہے جو یسوع لایا۔ یسوع کے اس چہرے کے ماخذ کے متعلق کچھ معلوم نہیں جو تصاویر میں پیش کیا جاتا ہے۔ خدا جانے کس نے ابتدا میں یہ چہرہ بنایا جس کی تقلید آج تک ہوتی رہی ہے۔ تاریخ اس باب میں بالکل خاموش ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ چہرہ کیونکر یسوع کا چہرہ تسلیم کر لیا گیا۔ مختلف زمانوں کی تصاویر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا بلکہ اقتضائے زمانہ کے ساتھ اس میں ارتقائی تبدیلی پیدا ہوتی رہی ہے اور بعد کی تصاویر میں زیادہ خوبصورتی اور شان پیدا ہو گئی ہے لیکن معدودے چند مستثنیات کو چھوڑ کر ان تصاویر کے موضوع سے قطع نظر ایک بات ان میں ضرور ہمیشہ مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مسیح کے چہرے پر گہری اداسی اور افسردگی کی کیفیت ہر تصویر میں نظر آتی ہے۔ اس اداسی کی توضیح صلیب وغیرہ کے واقعات سے ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ غمناک واقعہ مسیحی مصوری کی روح میں حلول کر چکا ہے اور مصوّر اس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ الم انگیزی مسیحی مصوّری کی خصوصیت ہو گئی ہے یہاں تک کہ یسوع کے بچپن کی تصویر بھی اس سے خالی نہیں۔ یہی حالت قدرتاً مریم کی تصاویر کی ہے اور یہ سلسلہ اس انتہا تک پہنچایا گیا ہے کہ فرشتوں وغیرہ کی تصاویر بھی افسردہ و محزوں نظر آتی ہیں۔ بہت کم تصاویر ایسی بھی ہیں جن میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی لیکن مصوروں کی اکثریت کے عمل کے پیشِ نظر ان چند تصاویر کو افراد کی ذاتی اپج کا نتیجہ قرار دینا پڑتا ہے اور من حیث المجموع مسیحی مصوری سے حزن و ملال کی خصوصیت جدا نہیں کی جا سکتی۔ بعض لوگ یسوع کے اداس چہرے کی وجہ گناہگار مخلوق کے لئے اُس کے جذبۂ رحم کو قرار دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں گناہ کے ساتھ نجات کا مسئلہ موجود ہے اور اگر یہ نہ ہو تو عیسائی مذہب نامکمل رہ جاتا ہے۔ دنیا کے نجات دہندے کے چہرے پر مسرت روحانی اطمینان اور سکون کے آثار ہونے چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیحی مصوّر صلیب کے واقعے سے بہت متاثر رہے ہیں اور مسیح کے پیغام کی صحیح روح اپنی مصوّری میں پھونک نہیں سکے۔

بدھ مذہب کی تصاویر

اب بدھ مذہب کی تصاویر لیجئے۔ بُدھ مذہب اور عیسائیت بعض باتوں میں مماثل ہیں مثلاً بُدھ مذہب بھی ایک ہی شخص کی ذات میں مرکوز ہے۔

یسوع کی طرح بدھ کے متداول چہرے کا ماخذ بھی معلوم نہیں لیکن برعکس مسیحیت کے بدھ مذہب حسرت واندوہ کا مذہب سمجھا جاتا ہے جس کا آغاز قنوطیت سے ہوتا ہے اور انجام نیستی پر۔ اگر بدھ کی تعلیم کی صحیح روح یہی ہوتی تو بدھ مذہب کی تصاویر حسرت ویاس کے مرقعوں کے سوا اور کچھ نہ ہوسکتی تھیں لیکن حالت اس سے بالکل متفاوت ہے۔ بدھ مذہب کی تقریباً ہر تصویر میں خوشی، زندہ دلی اور موسیقی کی فضا پیش نظر ہوتی ہے۔ عبادت کی تصاویر میں روحانی اطمینان اور مسرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایشیائی مصوروں کی فراست کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ نروان کا صحیح مفہوم سمجھ کر انہوں نے بدھ کے چہرے کی تصویر کشی کے وقت اس روحانی اطمینان اور مسرت کو متشکل کردیا ہے جس کی کنہ عام انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مسئلۂ کائنات کو حل کرچکا ہے اور حیات وممات کا عقدہ اس پر کھل چکا ہے۔ اگر اس حقیقت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہو کہ بدھ مذہب قنوطیت کا مذہب اور نروان نیستی کا مترادف نہیں تو بدھ کے مجسمے اور تصاویر سب سے قوی دلیل ہیں۔

یسوع اور بدھ کی زندگی میں ایک اور مشابہت بھی ہے وہ یہ کہ دونوں کو آزمائش میں پڑنا پڑا۔ یسوع کے شیطان پر فتح پانے کی تصویر میں بھی عیسائی مصوروں نے گہرے غم کے جذبات کی مصوری سے کنارہ کشی نہیں کی۔ البتہ یسوع کے چہرے پر غم کے ساتھ کسی قدر درشتی بھی پیدا کردی ہے۔ بخلاف اس کے بدھ مصوروں نے بھی اجنٹا کی دیواروں پر وہ تصاویر کھینچی ہیں جن میں بدھ نے مارا کی ترغیبات سفلی پر فتح پائی۔ ان تصاویر میں بدھ کے چہرے پر اس روحانی مسرت کا نور نظر آتا ہے جو انسان کو گناہ اور پست خواہشات پر فتح پانے کے وقت حاصل ہوتی ہے۔ صرف گھر بار چھوڑنے پر اور نروان سے قبل جب بدھ فاقہ کشی کرتا رہا یہ مسرت اس کے چہرے پر نظر نہیں آتی لیکن یہ ایک قدرتی بات ہے۔ اس وقت بدھ ایک روحانی کشمکش میں مبتلا تھا۔ نروان حاصل کرنے کے بعد کی تصاویر میں حسرت وحرماں کے آثار یکسر مفقود ہیں۔ ایشیائی مصور کا وجدان اتنا صحیح ہے کہ بستر مرگ پر بھی بدھ کی تصویر کے چہرے پر کامل سکون اور روحانی اطمینان دکھایا گیا ہے۔ گوئٹے نے سچ کہا ہے کہ ہر بلندی پر امن کا آشیانہ ہے۔ ہمیں مذہب کی ضرورت اس لئے نہیں کہ وہ ہمیں ہر وقت دنیا اور عقبیٰ کے غموں کی یاد میں محو رکھے۔ مذہب کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ ہمیں روحانی اطمینان، امید اور مسرت کی یاد دلاتا ہے۔

ہندوؤں کی مصوری

ہندو مذہب کی تصاویر اور مجسمے لاتعداد ہیں لیکن ان میں بھی ہمیں کہیں غیر ضروری اندوہ ویاس کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس ازلی وابدی ہستی کو متشکل کرنے کے لئے جو حد بیان وحد تمنا سے باہر ہے ہندو مصوروں کے وجدان نے جو کوششیں کیں ان کا شمار نہیں ہوسکتا لیکن عیسوی مصوری سے مقابلہ کے لئے ایک خاص مثال بہت مناسب ہے۔ مذہبیت کے قدیم حیرت انگیز اور متنوع تجربات کے دوران میں ہندوؤں نے بچے کی الوہیت کا خیال نظر انداز نہیں کیا۔ یسودھا اور کرشن کو ہم عیسوی مصوری کے "ماں اور بچے" کی نظیر قرار دے سکتے ہیں۔ یسودھا کرشن کی منہ بولی ماں تھی لیکن کرشن کے لئے اس کی مامتا نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا تھا اور اگرچہ ماں اور ایک آسمانی بچے کا موضوع دونوں مذاہب میں مشابہ ہے لیکن ہندو مصوروں نے اس کا استعمال الگ طریقے پر کیا جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے ماں اور بچے

کی مسیحی تصاویر حزن و ملال کی مظہرِ اتم ہیں۔ ماں بچے کے حسرتناک انجام سے ناواقف نظر نہیں آتی اور غضب تو یہ ہے کہ خود بچے کی پیشانی پر بھی اپنے انجام کے خوفناک علم کے تاریک بادل چھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بخلاف اس کے ہندو مصوّری نے کرشن اور یشودھا کی تصاویر میں روحانی مسرت دکھائی ہے جس کا یہ مظہر ہیں۔ ہر جگہ ماں بچے کو فخر و مسرت سے دیکھتی ہوئی نظر آتی ہے اور کمسن کرشن زندگی و زندہ دلی کا مجسمہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح گویا ہندوؤں کی مصوّری میں کسی "غم زدہ ماں" کا وجود نہیں۔

مسیحی مصوّری کا حزن و ملال اور عیسائی مصوروں کا فرض

اس نقطۂ نظر کے مطابق ہر عیسوی تصویر خانے کی فضا جس میں یسوع کی یا دوسری مسیحی تصاویر ہوں نہایت المناک ہوتی ہے اور جہاں تک مصوری کا تعلق ہے یہ مذہب مسرت سے محروم نظر آتا ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ صلیب کا واقعہ عیسوی مصوّری پر بے طرح چھا گیا ہے لیکن یسوع کی روحانی فتح کے صحیح اظہار سے مسیحی مصوروں کو مجتنب نہ رہنا چاہیئے۔ بیماروں کو تندرست کرنے، بچوں کو برکت دینے اور آسمان کی طرف صعود کرنے کے واقعات سے قطعِ نظر جن کی تصویرکشی کے وقت روحانی خوشی کا اظہار لازمی ہے یسوع کے پائیلٹ کی عدالت میں حاضر ہونے، صلیب اٹھا کر چلنے اور کانٹوں کا تاج پہن کر زخمی ہونے یا صلیب پر آخری دعا کرنے کی تصاویر بھی آسمانی مسرت کی آئینہ دار ہونی چاہئیں۔ غم زدہ یسوع کے مقابلہ میں درد و غم پر فتح پانے والے مسرور یسوع کی تصاویر مسیحی مذہب کی صحیح آئینہ داری کریں گی۔

عیسائی مصوّر یسوع کے مذہب اور سیرت کے اس پہلو کی تصویرکشی سے ابھی تک عہدہ برا نہیں ہوئے حالانکہ یسوع آسمانی برکت اور روحانی مسرت کا زبردست مبلّغ تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی مصور اپنی رسمی مصوّری کی قیود سے آزاد ہو کر اس طرف توجہ کریں۔ رسمی مصوّری یسوع کی تعلیمات کی صحیح ترجمان نہیں۔ عیسائی مصوّروں کی ایک نئی جماعت کو دنیا کے سامنے وہ یسوع پیش کرنا چاہیئے جو کانٹوں کا تاج پہنے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ صلیب پر سے دنیا کو غم اور دکھ اور موت کی فنا کا پیغام دے رہا ہو۔

تصاویر:۔ مولوی محمد حسین صاحب ادیب { "ہمایوں" کے جلیل القدر اور وسیع المعلومات قلمی معاون ہیں کسی دوسری جگہ ان کے مختصر حالاتِ زندگی درج ہیں۔ جن اصحاب نے مولوی صاحب کے عالمانہ مضامین پڑھے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے امید ہے کہ وہ آج "مضمون نگار" کے بیکر تصویر کو خاص دلچسپی کا مرکز پائیں گے۔

رقصِ حباب۔ یہ انگریز مصوّر سیسل ہیٹن کی بہترین تصویر سمجھی گئی ہے۔ نہ صرف مصوّر کی ذاتی اپج کا مظہر ہونے کے لحاظ سے بلکہ اس عبرت انگیز لیکن بصیرت افروز خیال کے لحاظ سے بھی جسے یہ پیش کرتی ہے یہ تصویر خاص قدر کی مستحق ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ تصویر حسن کاری کا ایک نفیس نمونہ بھی ہے۔

محمد حسین ادیب

ایک خاموش عالم کا ملک سے تعارف

مولوی محمد حسین صاحب ادیب کے تنقیدی مضامین ایک مدت سے "ہمایوں" میں چھپ رہے ہیں اور ملک میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ موجودہ اشاعت اُن کی تصویر اور مختصر حالات زندگی سے مزین ہو رہی ہے۔ "ظرافت کی حقیقت و ماہیت" کے متعلق مولوی صاحب کے فاضلانہ تبصرے کی آخری قسط بھی اسی پرچے میں اشاعت پذیر ہوتی ہے۔ (مدیر)

یہ لازم نہیں کہ ہر بڑے آدمی کی زندگی پُر شور، ہنگامی اور ڈرامائی ہو، ایک پُر امن، عافیت پسند اور ہموار و سادہ زندگی بھی ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہو کر سچی عظمت کے مدارج طے کر سکتی ہے۔ انسان اپنی خاموش علمی و ادبی مصروفیات کے ذریعے سے بھی ابنائے وطن کی سچی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب ادیب کا شمار بھی انہیں قابلِ قدر لوگوں میں ہے جن کی قومی خدمتگذاری کسی قسم کی چہل پہل، شور و شغب اور بلند بانگ دعاوی کی رہینِ منت نہیں ہے۔ آپ خاموش کام کرنے والے ہیں طبیعت نہایت صلح جو اور آشتی پسند واقع ہوئی ہے۔ آپ کے تنقیدی مضامین میں دل آزاری، رشک و حسد یا معاصرانہ چشمک کا کہیں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

آپ کا اصلی وطن قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد ہے۔ آپ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ قدیم طریقے کے مطابق اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم مکان ہی پر ہوئی اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لئے آپ آرہ ضلع اسکول میں داخل کئے گئے۔ آپ کی طالب علمی کا زمانہ نہایت شاندار رہا۔ ہر امتحان میں آپ اپنی جماعت میں اول آتے رہے۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ مکان پر فارسی اور عربی کی تعلیم جاری رہی ۱۹۰۹ء میں آپ نے انٹرنس کا امتحان بدرجۂ اول کامیاب کر کے سرکاری وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ پٹنہ کالج بانکی پور میں شریک ہوئے۔ آپ کو لڑکپن ہی سے کتب بینی کا بیحد شوق تھا۔ پٹنہ میں علمی تشنگی کی تسکین کے لئے کافی سامان موجود تھا۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں نصابی مضامین کے علاوہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں آپ کے زیرِ مطالعہ رہا کیں۔ کالج کے کتب خانہ کے علاوہ آپ نے اورینٹل پبلک لائبریری (کتب خانہ عمومیہ شرقیہ) بانکی پور سے بھی اچھی طرح استفادہ کیا۔ تعطیلات کا اکثر و بیشتر حصہ آپ اسی لائبریری میں گذارتے تھے۔ بہر حال ۱۹۱۳ء میں آپ نے پٹنہ کالج سے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

اگرچہ کالج ہی میں رہ کر آپ مافوق طیلسانی تعلیم حاصل کرنے کے بیحد متمنی تھے لیکن خانگی مجبوریوں کے باعث آپ کو تعلیم ترک کرنی پڑی۔ بالآخر فکرِ معاش نے آپ کو سر رشتہ تعلیمات سے وابستہ کر دیا۔ یہاں خانگی طور پر ایم اے کی تیاری کا بہترین موقع تھا۔ آپ نے اس موقع سے فائدہ

اٹھایا اور ۱۹۱۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اب سررشتۂ تعلیمات کی کامیاب ملازمت کے لئے ٹریننگ کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا لیکن ۱۹۲۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے ڈی کی سند حاصل کر لینے پر یہ آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ترکِ موالات کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ تمام زعمائے ملت تعمیری لائحہ کا ترک کر کے صرف تخریبی عمل کے علمبردار بنے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کے نزدیک انگریزی مدارس کی تعلیم ایمان فروشی کے مترادف اور سرکاری ملازمت گویا انہیں ان کی حلقہ بگوشی تھی۔ مولوی محمد حسین صاحب کو پٹنہ میں بڑے بڑے رہنمایانِ قوم و زعمائے ملت کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کے خطبات سے متاثر ہو کر صاحب موصوف نے انگریزی سرکار کی نوکری چھوڑ دینے اور کسی اسلامی ریاست میں ملازمت تلاش کر لینے کی ٹھان لی۔ سب سے پہلے ممالکِ محروسۂ سرکار نظام پر نظر پڑنا ایک فطری امر تھا۔ اس وقت یہاں کے سررشتۂ تعلیمات کی باگ نواب مسعود جنگ بہادر کے مبارک ہاتھوں میں تھی جن سے مولوی محمد حسین صاحب کو پٹنہ ہی میں نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ نواب صاحب نے موصوف کی درخواست کو شرفِ پذیرائی بخشا اور انہیں حیدرآباد طلب کر کے ایک گزیٹیڈ عہدہ سے سرفراز فرمایا۔

یہاں سے مولوی محمد حسین صاحب کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس ریاست ابد مدت کی پرامن فضا جو ہر قسم کی فرقہ وارانہ کشیدگیوں اور جذبات سے پاک ہے شہریارِ دکن کی غیر معمولی رواداری وحق پژوہی اور سادگی و صفت شعاری جو خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرتی ہے اور شاندار مغلیہ تہذیب و تمدن کے زندہ آثار جو اب بھی یہاں باقی ہیں۔ یہ تمام چیزیں صاحب ممدوح کو اس قدر پسند آئیں کہ بہت جلد انہوں نے حیدرآباد کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا۔ دس گیارہ سال سے وہ مختلف مدارسِ فوقانیہ کی صدارت پر فائز چلے آ رہے ہیں کتب بینی اور مطالعہ کا تو انہیں ابتدا ہی سے بیحد شوق تھا لیکن حیدرآباد آ کر قلم کی بھی چاٹ پیدا ہوئی اور وہ نہایت انہماک کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

عام طور پر مدارسِ فوقانیہ کا کتابی ذخیرہ تشنہ کامانِ علم کی آسودگی کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے لیکن مولوی محمد حسین صاحب کی علمی تشنگی ہمیشہ اس چشمہ کی تنک آبی کی شاکی رہی۔ فی الحقیقت ہائی سکول کا کتب خانہ آپ کے روز افزوں ذوقِ مطالعہ کا حریف نہ بن سکا۔ اس لئے صاحبِ موصوف کو اپنا ایک علیحدہ کتب خانہ قائم کرنا پڑا۔ اپنی تنخواہ کا ایک معتدبہ حصہ نئی نئی کتابوں کے خریدنے کے لئے وقف ہے۔ تمام دوسری ضروریات میں کمی ہو لیکن کیا مجال جو کتابوں کے میزانیہ میں کوئی فرق آئے نتیجہ یہ ہے کہ صاحبِ ممدوح کے پاس اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کتابوں کا نادر ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جو کتابیں ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوتیں وہ انگلستان اور امریکہ سے منگائی گئی ہیں۔ صاحب موصوف کو اپنے کتب خانہ سے بیحد انس ہے۔ وہ کتابوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں مخلص سے مخلص احباب کی صحبت میں بھی آپ کو اتنی خوشی حاصل نہیں ہوتی جتنی اپنے کتب خانے میں۔ خود صاحب ممدوح کا قول ہے کہ "جب میں اپنے کتب خانے میں مشغول مطالعہ ہوتا ہوں تو تمام دنیوی تردّدات و تفکرات کو بھول جاتا ہوں اور مجھے ایسا قلبی اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے جو اور کہیں میسر نہیں آ سکتا۔"

مولوی محمد حسین صاحب طبعاً قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ مغرب کی مادہ پرستی، جاہ طلبی، حرصِ زر اور ظاہری طمطراق سے سخت متنفر اور مشرقی تہذیب، قدیم شعائر اور روحانیت کے دلدادہ ہیں۔ وہ مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے خیالات و افکار کے زبردست حامی ہیں۔ کثرتِ کتب بینی و مضمون نگاری اور دوسرے علمی مشاغل نے مولوی محمد حسین صاحب کو بہت کم آمیز اور تنہائی پسند بنا دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ کی طبیعت میں حد درجہ کی متانت سنجیدگی اور خودداری

بھی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ انسانی سیرت کی قابلِ تعریف خوبیاں ہیں لیکن ناواقف اور ظاہر بین شخص کو اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے تاہم جو لوگ آپ کی طبیعت اور خصوصیات سے واقف ہیں وہ آپکے خلوص، ہمدردی، وسیع الاخلاقی اور منکسر المزاجی کے معترف ہیں۔ علاوہ بریں آپ میں ایک خاص صفت بھی موجود ہے جس سے یارباشی اور ملنساری کی کمی کی پوری پوری تلافی ہوجاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ صاحب ممدوح ایک زبردست مقرر بھی ہیں۔ کوئی مذہبی، معاشری، خانگی یا عام جلسہ ایسا نہیں ہوتا جہاں وہ تقریر کے لئے مدعو نہ کئے جاتے ہوں۔ مختلف مذہبی مواقع پر مسجدوں میں آپ کو واعظ کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔ آپ کی وہ تقریریں خاص طور پر پسند کی جاتی ہیں جن میں آپ علوم جدیدہ اور اکتشافات قریبہ کی مدد سے عقائد مابالغیب کی تشریح فرماتے ہیں۔ ہر معاشری مجمع میں آپ کی شرکت کلب میں روزانہ حاضری سے معذوری کی تلافی کر دیتی ہے۔

آج کل آپکے علمی مشاغل کے تین اہم شعبے ہیں۔ فنِ تعلیم، زبان و ادب اور مذہب و اخلاق۔ آپ کی فنی مہارت کے آئینہ دار وہ تحقیقی مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً المعلم حیدرآباد، اخبار تعلیم لاہور اور رہنمائے تعلیم میں شائع ہوا کئے ہیں۔ آپکے ادبی و تنقیدی مضامین آئے دن ملک کے موقر رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں جو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں لیکن آپ کی وسیع مذہبی معلومات سے صرف وہی لوگ مستفید ہوتے ہیں جنہیں آپکی تقاریر اور وعظ سننے کا موقع ملتا ہے۔ آپ اپنے مذہبی مضامین کی اشاعت پسند نہیں فرماتے کیونکہ آپ کا خیال ہے کہ مذہبی مضمون چھپوانا گویا جھگڑے مول لینا ہے۔

انسان اور حیوان میں بڑا فرق یہ ہے کہ حیوان کو صرف اپنے اور اپنے ننھے بچوں کے پیٹ کی فکر ہوتی ہے لیکن انسان کی ذات سے اس کے ابنائے وطن کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی مالدار اور صاحب اقتدار کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ دوسروں کے ساتھ کچھ بھلائی نہ کرسکے تو معاشرہ کے لئے اس کا وجود و عدم وجود دونوں یکساں ہیں۔ مولوی محمد حسین صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ ملک و قوم کی خدمتگذاری میں صرف ہوتا ہے۔ فرائضِ منصبی سے متعلق آپ کا وقت نونہالانِ چمن کو پروان چڑھانے اور آنے والی نسل کی قسمت کو سنوارنے میں گذرتا ہے۔ مختلف موقعوں پر آپ کی جو تقریریں ہوا کرتی ہیں ان سے عوام کی مذہبی و معاشری اصلاح و ترقی وابستہ ہے۔ اپنی فرصت کی ساعتوں میں آپ ادب و زبان کی جو خدمت انجام دیتے ہیں وہ فی الحقیقت ملک و قوم کی خدمت ہے۔ آپ کی مصروف زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ کس طرح ایک خاموش کام کرنے والا شخص خارزارِ سیاست سے اپنا دامن الجھائے بغیر بھی اپنے بے ریا مشاغل اور بے غرضانہ کارگذاریوں کے ذریعہ سے سچا محبِ وطن بن سکتا ہے۔

مولوی محمد حسین صاحب اپنی ملازمت کے سلسلہ میں جہاں کہیں رہے وہاں کے ہر فرقے اور ہر طبقہ کے لوگوں میں آپ کو ہر دلعزیزی حاصل رہی۔ چھوٹے بڑے امیر غریب، عوام، معززین اور عہدہ دار سب کے سب آپ کی اعلیٰ علمی قابلیت اور وسیع معلومات کی قدر کرتے اور آپ کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ انتہا درجے کی محنت کے باعث چند سال سے صاحب ممدوح مرض ذیابطیس میں مبتلا ہوگئے ہیں جس نے آپ کو نہایت نحیف و لاغر بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر شروع ہی سے آپ کو دماغی محنت ترک کرنے کا مشورہ دیتے آئے ہیں لیکن آپ اپنے علمی مشاغل ترک کرنے کو ذہنی و روحانی موت کے مترادف سمجھتے رہے ہیں۔ البتہ سال بھر سے آپنے دماغی کدوکاوش کسی قدر کم کردی ہے جس کا نتیجہ آپ کی صحت کے لئے بہ فضلِ خدا مفید ثابت ہو رہا ہے۔ دعا ہے کہ خدائے پاک آپ کو جلد صحت کلی عطا فرمائے تاکہ آپ پوری سرگرمی کے ساتھ رفاہِ عام کے کام انجام دے سکیں۔ تصویر جو اشاعت کے لئے روانہ کی جارہی ہے وہ صحت کے زمانے کی ہے۔

محمود علی خاں

میرا پہلا مضمون

"یہ جو میرے مضامین مختلف رسالوں میں آپ لوگ شائع ہوتے دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی میرا پہلا مضمون نہیں ہے۔"
ابھی یہیں تک لکھا تھا کہ ایک منطقی دوست نے اعتراض کیا کہ "یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ اشاعت میں تقدم و تاخرِ زمانی سے قطع نظر کوئی مضمون تو ایسا ہوگا جو آپ کا پہلا مضمون کہلانے کا مستحق ہو۔"

میں نے کہا۔ "جی نہیں۔ آپ کا اعتراض غلط ہے۔ ان مضامین میں سے کوئی بھی میرا پہلا مضمون کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "دیکھئے آپ ایک صریح منطقی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ دیکھئے نا . . . . ."

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کے اعتراض کے جواب میں کیا مجھے ایک کہانی سنانے کی اجازت ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "نہیں"۔

میں نے کہا۔ "تو میں بحث ختم کئے دیتا ہوں"۔

اس دھمکی سے گھبرا کر وہ بولے "اچھا کہانی کہئے"۔

میں نے کہا۔ "ایک دن میرے ایک منطقی دوست بازار میں سے گذر رہے تھے کہ ایک مکان کی دیوار کے ساتھ اُپلے لگے ہوئے دیکھے۔ وہیں ٹھہر گئے۔ میں بھی ہمرکاب تھا۔ اس مجموعۂ فضائل کو رکتے دیکھ کر میں بھی رُک گیا۔ میرے دوست بہت دیر تک اس دیوار کے سامنے کھڑے بحرِ فکر میں غوطہ زن رہے اور میں انتہائے نیاز کے ساتھ دست بستہ کھڑا رہا۔ آخر نہ رہا گیا۔ میں نے التماس کی۔ "حضرت آپ کیا سوچ رہے ہیں"۔ آنکھوں میں علم و منطق کی ایک دور رس چمک پیدا کر کے فرمایا۔ "یہ سوچ رہا ہوں کہ بھینس دیوار پر نہیں چڑھ سکتی۔ وہ کس قسم کی بھینس تھی جو اس دیوار پر چڑھ کر اپنا گوبر اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ گئی۔ اس وقت مشاہدے اور علم میں بڑی سخت کشمکش ہو رہی ہے۔ مجھے علم ہے کہ بھینس دیوار پر نہیں چڑھ سکتی اور مشاہدہ کہتا ہے کہ بھینس دیوار پر چڑھ سکتی ہے ورنہ یہ گوبر کہاں سے آتا"۔
میں نے ادب سے عرض کی اجازت ہو تو میں اس مسئلے کو حل کر دوں"۔
مربیانہ انداز میں مسکرا کر ارشاد فرمایا۔ "کہیئے کہیئے"۔

میں نے کہا۔ "حضرت بھینس دیوار پر نہیں چڑھی۔ بلکہ کسی آدم زاد نے بھینس کا گوبر لے کر دیوار پر اُپلے تھاپے ہیں یہ گول گول چیز جو دیوار پر آپ کو نظر آتی ہے اسے اردو میں اُپلا کہتے ہیں"۔

یہ کہانی سن کر میرے منطقی دوست نے برافروختہ ہو کر کہا "یعنی ؟"

میں نے ادب سے عرض کی "یعنی یہ کہ میرا پہلا مضمون شائع ہی نہیں ہوا۔ ابھی تک امپیریل بنک کے خزانچی کی تحویل میں ہے۔ اب فرمایئے جتنے مضمون میرے شائع ہوئے ہیں ان میں سے ہے کوئی میرا پہلا مضمون ؟"

میرے منطقی دوست نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا "اب لکھنے کی اجازت ہے"۔

انہوں نے کہا۔ "اجازت ہے"۔

تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر میرا پہلا مضمون شائع ہو جاتا تو دنیا میں تہلکہ مچ جاتا۔ اس کی نوعیت اور ادبیت دیکھ کر خواجہ حسن نظامی کسی ملائے مکتب کے مرید ہو جاتے اور سید سجاد حیدر ایک طول طویل تحریر کے ذریعے سے "خیالستان" کی تصنیف سے اپنی برأت کا اظہار کرتے۔ سالک صاحب "افکار و حوادث" کا کالم یکبارگی پھاڑ دیتے اور مہر صاحب کی غالب شناسی دھری کی دھری رہ جاتی۔ مضمون کی اشاعت کے دوسرے دن تمام اخبارات میں جلی قلم سے سنسنی پیدا کرنے والے عنوانوں کے ماتحت میرے مضمون کے متعلق افتتاحیہ مقالے شائع ہوتے۔ یورپ کے اخبارات میں خبروں کی رفتار کچھ اس طرح ہوتی :-

سید صاحب کا پہلا مضمون شائع ہو گیا

نوبل پرائز کمیٹی کے اراکین میں کشمکش

سید صاحب کو نوبل پرائز دینے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کی انتہائی کوشش

ایوان میں ہنگامہ

اس ہڑبونگ میں مجلس کا سیکرٹری نوبل پرائز کا روپیہ لے کر فرار ہو گیا

تازہ ترین اطلاعات مظہر ہیں کہ سیکرٹری ابھی تک روپوش ہے

تو مختصر یہ ہے کہ خیریت ہوئی میرا پہلا مضمون شائع نہ ہوا۔ اس مضمون کے لکھے جانے سے لے کر اس کی عدم اشاعت تک ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات پیش آئے ہیں کہ ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو لوگ مجھے "طلسم ہوشربا" کا جواب لکھنے کا ملزم گردانیں۔ اس لئے صرف اس کی شان نزول و عدم اشاعت کا بیان کیا جاتا ہے۔

دروغ برگردنِ ناظرین

شانِ نزول میرے پہلے مضمون کی یہ ہے کہ ایک دفعہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا یعنی مجھے اپنے پبلشروں کی طرف سے دو تین جا یک مشت پچاس روپے رائلٹی کے طور پر وصول ہوئے۔ اتنی بھاری رقم کو گھر میں رکھ کر میں خواہ مخواہ چوری اور ڈکیتی کے خوف سے اپنی جان کو مبتلائے رنج کیسے کر سکتا تھا۔ بیوی سے مشورہ لیا۔ اس نے کہا "کسی کاروبار میں لگا دو"۔

اس دن تو بات آئی گئی ہوئی میں سمجھا کہ جس طرح باقی روپے کاروبار میں لگائے جاتے ہیں اس طرح ان دنوں بھی کتابیں خریدی جائینگی لیکن ایک دن صبح کے ناشتے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیوی نہایت غور سے اخبار پڑھ رہی ہے۔ چپکے چپکے دبے پاؤں بلی کی چال اس کے شانے پر سے جھک کر دیکھا۔

دل دھک سے رہ گیا۔ وہ پرتاپ کا تجارتی کالم پڑھ رہی تھی۔

میں نے دل میں کہا۔ یا اللہ۔ آثار اچھے نہیں ہیں۔ آج تجارتی کالم کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ کل لیڈر پڑھیگی اور اگر ترقی کی یہی رفتار رہی تو کسی دن سول نافرمانی کی لیڈر ہوگی یا ادیب۔ دونوں صورتیں ایک دوسرے سے بڑھ کر خطرناک تھیں غشی کی سی حالت میں اپنی کرسی پر آگرا میری بیوی نے مسکرا کر پوچھا "بجلی کے کارخانے میں لگائیں تو کیسا؟"

میں نے حیران ہو کر دل ہی دل میں کہا۔ لیڈری کے آثار پیدا ہوگئے۔ غیر متعلق باتیں کرنے کا طریقہ آگیا۔

پھر میں نے زور سے کہا۔ "بجلی کا کارخانہ؟"

میری بیوی نے تیوری ڈال کر کہا "ہاں۔ وہ پچاس روپے بیکار پڑے ہیں۔ اس سے لاہور کے بجلی گھر کے کچھ حصے خریدیں"

میں نے جواب دیا "میری رقم بیکار کسی طرح نہیں کہلا سکتی۔ وہ بنک میں ہے اور اس کی بنا پر بنک والوں نے غالباً ایک اور کلرک کا اضافہ کیا ہوگا جو میری پاس بُک میں حیرت انگیز اور پُر اسرار اندراج کرتا رہتا ہوگا کبھی صفحے کے ایک طرف پچاس کبھی دوسری طرف پچاس۔ سچ تو یہ ہے کہ میری رقم کی وجہ سے بیکاروں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے"۔

میں دیکھ رہا تھا کہ اس تقریر کے دوران میں میری بیوی کا رنگ سُرخ سے سُرخ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے میں نے اپنی تقریر نہایت بے خودانہ انداز میں یوں ختم کی "لیکن اگر تم چاہو تو بڑے شوق سے اس سے بجلی گھر کے حصے خرید لیتی ہو مگر معلوم نہیں بجلی گھر کے کتنے حصے ہیں میرے خیال میں اوپر کا حصہ خریدنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ذرا ہوا اچھی ہوگی نیچے کی منزل تو عموماً گرم ہوتی ہے"۔

نتیجہ اس بحث کا یہ نکلا کہ اس واقعے سے تین دن بعد میری بیوی بجلی گھر کے کئی حصوں کی مالک تھی اب مجھے معلوم ہوا کہ حصہ دراصل ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوتا ہے جس کی رو سے اس ٹکڑے کا مالک بجلی گھر کی آمدنی میں شریک ہو جاتا ہے۔

ہفتے بھر کے بعد میں ناشتہ کر رہا تھا کہ ڈاکئے نے ایک لفافہ دیا۔ کھول کر دیکھا۔ پڑھا اور بیوی سے کہا۔ "دیکھا۔ اسی کہتے ہیں ادیب کی قدردانی انجمن ادباء کی طرف سے دعوت آئی ہے کہ میں ان کے سالانہ جلسے میں ایک پیپر پڑھوں یعنی پہلے ایک مضمون لکھوں اور پھر اسے پڑھوں"۔

میری بیوی نے پوچھا "لیکن لکھنے کے بعد پڑھنے کی کیا ضرورت ہے"؟

میں نے کہا "تم نہیں جانتیں۔ یہ ریسرچ ہے ریسرچ۔ اس میں پہلے مضمون لکھا جاتا ہے پھر پڑھا جاتا ہے میں اگر جا کر غالب کے متعلق یونہی مضمون پڑھ دوں تو قیامت برپا ہو جائے نہیں۔ ہرگز نہیں میں پہلے مضمون لکھوں گا پھر پڑھوں گا"۔

یہ کہہ کر میں نے فوراً ماتھے پر بل ڈال لئے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ پاؤں سمیٹ لئے۔ ہاتھوں کی مٹھیاں کس لیں۔ پاؤں کے انگوٹھے بھینچ لئے۔ سر کے بال کھڑے کرلئے اور الہام نثری میں غرق ہو کر دنیا و مافیہا سے غافل ہوگیا ——

تھوڑی دیر کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ میری بیوی موجود نہ تھی۔

میں اٹھا۔ فلسکیپ کاغذ کا ایک دستہ، نصف درجن پن ہولڈر، ایک درجن دواتیں، دو پکیٹ روشنائی کے میز پر رکھ لئے اور بحر فکر میں غوطہ زن ہوگیا۔

ایک گھنٹہ کامل غور و خوض کے بعد میں اپنے مضمون کا عنوان سوچ چکا تھا۔

"اردو ادب پر برطانوی فنِ تعمیر کے رومانوی اثرات"

عنوان لکھ کر میں نے انسائیکلوپیڈیا "حفظ العلوم" کی تمام جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔ عنوان کے نیچے لکھا:۔

سید صاحب کا وہ فاضلانہ مضمون جو مجلسِ ادبا کے سالانہ جلسہ کے لئے لکھا گیا اور پھر پڑھا گیا۔

اب میں نے اپنا مضمون یہاں تک لکھ لیا تھا

اردو ادب پر برطانوی فن تعمیر کے رومانوی اثرات

سید صاحب کا وہ فاضلانہ مضمون جو مجلسِ ادبا کے سالانہ جلسے کے لئے لکھا گیا اور پھر پڑھا گیا ——

حضرات!

ابھی یہاں تک لکھ پایا تھا کہ میری بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔

اس نے پوچھا "کہاں تک پہنچے ہیں آپ؟"

میں نے مضمون دکھا دیا۔ اس نے کہا "لیکن مضمون تو یوں شروع ہوا کرتا ہے "جنابِ صدر خواتین اور حضرات!"

میں نے کہا "واہ۔ تم یہ بھی نہیں جانتیں۔ اس مجلس کا نہ کوئی صدر ہوگا۔ نہ اس میں خواتین ہونگی نہ ...... اہم —— میری رائے یہ ہے کہ صدر اس مجلس کا کوئی نہیں ہوگا"

اس نے کہا "بہتر" اور چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے مضمون میں مناسب ترمیم کی اور "جناب صدر محترم خواتین اور حضرات" کے نقط لکھ کر پھر بحرِ فکر میں غوطہ زن ہوگیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد خیال آیا کہ آج کل گرمیوں میں اس قدر سنجیدہ اور خشک اور ادق مضمون کوئی نہیں سمجھیگا۔ سب دنیا پہاڑ پر ہونگے وہی اس قسم کے خشک مضامین لکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ کوئی لطیف و نفیس مضمون ہونا چاہیئے۔ یہ سوچ کر عنوان بدل دیا۔ اب میرے مضمون کی یہ حالت تھی:۔

"طربیہ ڈراموں میں شہد کا استعمال"

سید صاحب کا وہ فاضلانہ .... وغیرہ

جنابِ صدر .... وغیرہ

پندرہ منٹ کے غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا پیپر بہت لطیف ہے ایک پروفیسری پبلک ایسے نازک مضامین کی توقع نہیں رکھتی۔ میرا مضمون سنجیدہ مگر پرلطف متین لیکن دلچسپ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ عنوان بدل دیا۔ اب میرے مضمون کی یہ حالت تھی۔

"قانون کے ادبی پہلوؤں کا سیاسی تذکرہ"

وہ فاضلانہ مضمون جو سید . . . . . وغیرہ

جنابِ صدر ——— وغیرہ

ابھی یہاں تک لکھ پایا تھا کہ میری بیوی کمرے میں داخل ہوئی اور مضمون کا عنوان دیکھ کر بولی "کتنا دلچسپ عنوان ہے"۔

میں نے فخر سے کہا "قیامت برپا ہو جائے گی قیامت"

اس نے پوچھا۔ "دوپہر کو کیا کھائیے گا؟"

میں نے جواب دیا "کچھ نہیں۔ میں اپنا مضمون لکھنے میں مصروف ہوں گا"۔

وہ چلی گئی۔

دوپہر ڈھل گئی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ سہ پہر کی چائے کے وقت تک میں نے مضمون کا عنوان پھر بدل دیا تھا اور اب مضمون کا کافی حصہ لکھا جا چکا تھا۔ اب میرے مضمون کی یہ حالت تھی۔

افریقہ کی حبشی اقوام میں امتیازِ رنگ ونسل کا عمرانی آغاز

وہ فاضلانہ مضمون جو سید صاحب ——— وغیرہ

جنابِ صدر ——— وغیرہ

یہاں تک لکھ پایا تھا کہ ایک خیال بجلی کی تیزی سے میرے دماغ میں دوڑ گیا۔ میں نے اپنی بیوی کو بلا کر اس سے پوچھا:۔

"تم نے حصے بجلی گھر میں خریدے ہیں نا؟

اس نے کہا۔ "ہاں"۔

میں نے کہا "تو تم اتنی قربانی کر سکتی ہو؟"

بیوی نے حیران ہو کر پوچھا "کیسی قربانی؟"

میں نے کہا "تم سمجھیں نہیں۔ ذرا سوچو مجلس ادبا کے جلسے میں شہر کے تمام معزز شرفا جمع ہونگے اور میرا نام سن کر تو سارا لاہور ٹوٹ پڑیگا۔ مجھے رات کو پیپر پڑھنا ہے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ جس وقت تک لوگ میرا پیپر سننے میں مصروف رہیں گے۔ اس وقت تک ان کے گھروں میں بجلی نہیں خرچ ہوگی۔ بجلی کم خرچ ہونے سے بجلی گھر کو آمدنی کم ہوگی اور اس کی آمدنی کم ہونے سے تمہارے حصّے کی آمدنی بھی کم ہوگی۔ اب بتاؤ تم اتنی قربانی کر سکتی ہو"

میری بیوی کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے منت کہا "تو آپ پیپر نہ پڑھیئے۔ پھر تو یہ جلسہ نہیں ہو سکیگا۔ اور اگر ہوگا بھی تو آپکے شریک نہ ہونے کی خبر سُن کر بہت کم لوگ جائیں گے؟"

میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر کہا "تو تمہاری خاطر میں پیپر نہیں پڑھتا"۔

یہ ہے میرے پہلے مضمون کی عدمِ اشاعت کی وجہ!

عابد علی

غزل

سرگشتۂ طلب کو مقامِ فنا نصیب
رہگیرِ جاں بلب کو دوامِ بقا نصیب

تم اور چارۂ غمِ فرقت - خوشا نصیب!
دُکھ کو دوا نصیب، مرض کو شفا نصیب

اس خوبیٔ نصیب کے قربان جائیے
حسرت ستم نصیب، تمنّا بلا نصیب

میں بے نصیب تھا مرے سر منڈھ دیا گیا
غم آشنا نصیب، ستم آشنا نصیب

آزاد! کیا گزارشِ حالِ تبہ کروں
میں اور قیدِ غم - مری قسمت مرا نصیب

آزاد انصاری

ظرافت
کی
حقیقت و ماہیّت
(۳)

جب ہمارے شعرا واعظ، ناصح، زاہد یا شیخ کا مضحکہ اڑاتے ہیں تو لوگ اس سے صرف اس لئے محظوظ و لطف اندوز ہوتے ہیں کہ اس کی ریاکاری کا پردہ چاک ہو کر اس کا اصلی اور سچا کردار ان کے پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔ ظرافت کا سب سے اہم کام یہی ہے کہ وہ انسان کے قول اور فعل۔ دعویٰ اور عمل۔ ظاہرداری اور حقیقت کا فرق دکھائے اور اصلیت و صداقت کو نمایاں کرے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو بات ظریفانہ انداز میں کہی جائے وہ فلسفیانہ اصول اور منطقی استدلال کی رو سے صحیح ہو بلکہ صرف اس قدر کافی ہے کہ عوام اسے سچ باور کرتے ہوں۔ جو استہزا خیالات عامّہ کے خلاف ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی بطلِ قومی یا قائدِ اعظم یا محبِ وطن کے ساتھ ٹھٹھا کیا جائے یا اس کی نسبت کوئی ایسی بات کہی جائے جو حقیقت میں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو لیکن عوام کے یقین و عقیدہ کے منافی ہو تو ایسی صورت میں لوگوں کے دلوں میں انبساطی کیفیت پیدا ہونے کے بجائے غیظ و غضب اور رنج و غصّہ کے جذبات رونما ہوں گے۔ مہاتما گاندھی کے متعلق ایک "ج حضوری" جریدہ نے لکھا تھا کہ

شرر کی فتنہ کی پڑیا ہے گاندھی ‏ ‏ ‏ جدھر جاتا ہے وہ اٹھتی ہے آندھی

لیکن عوام جن کے دلوں پر مہاتما جی کے اعلیٰ کردار اور دیوتائی خصائل کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اس قول کو سراسر جھوٹ۔ لغو اور غلط سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس ظرافت میں ان کے نزدیک صداقت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اس لئے وہ اس سے محظوظ و مسرور ہونے کے بجائے متالم اور رنجیدہ ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ جس بات کی صداقت ذہن نشین کرانے میں بلند آہنگ منطقی

دلائل و براہین بے سود ثابت ہوتے ہیں اس کا عوام کو یقین دلانے کے لئے محض ایک مذاقیہ جملہ یا طنز آمیز اشارہ کافی ہوتا ہے۔ مثلاً پردہ نشینی کی حمایت اور آزادی کی مخالفت میں سیکڑوں علمی و منطقی دلائل و براہین پیش کئے جاتے ہیں لیکن سامع پر ان کا اتنا زبردست اثر نہیں پڑتا جتنا اکبر کے اس ایک ظرافت آمیز شعر کا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی　　　اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

شمع انجمن پر چراغ خانہ کو ترجیح دینا اور مخالف و موافق دونوں گروہوں سے اس کی سچائی تسلیم کرانا اکبر ہی جیسے باکمال ظرافت نگار کا کام ہے۔ بالعموم لوگوں کو ایسی ہی باتوں پر ہنسی آتی ہے جن کی لغویت و نامعقولیت پر وہ پہلے سے یقین رکھتے ہیں۔ ہیزلٹ رقمطراز ہے کہ "استہزا کی بنیاد چند ایسے مفروضہ واقعات پر قائم کی جاتی ہے جو بعض مقبول ضوابط کے نامطابق ہوں۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ واقعات حقیقتہً سچے ہیں یا جھوٹے یا یہ ضوابط دراصل صحیح ہیں یا غلط۔ اس لئے استہزا اگر فلسفیانہ یا مطلق صداقت کی جانچ نہ سہی لیکن وہ ایسی صداقت کی جانچ تو ضرور ہے جس پر عوام یقین رکھتے ہیں۔ استہزا انہیں نقائص کو نمایاں کرتا ہے جنہیں رائے عامہ مردود ٹھہراتی ہے۔ بہرحال اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ استہزا اگر صداقتِ کُلی کی نہیں تو کم از کم اس مقدارِ صداقت کی جانچ ہے جو ہمارے مرغوب تعصبات و مزعومات میں پائی جاتی ہے۔"

ظرافت و بذلہ سنجی کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ شاعرانہ تخیل کے ساتھ اُس کا مقابلہ کیا جائے تخیل کا درجہ بذلہ سنجی سے بہت بلند ہے۔ شاعرانہ تخیل کے لئے محض الفاظ کا گورکھ دھندھا یا اصوات کی شعبدہ بازی کافی نہیں ہے بلکہ جذبات میں لطافت، اور خیالات میں رفعت پیدا کرنے کے لئے ٹھوس اور سنجیدہ مواد کی ضرورت ہے تخیل ایسی چیزوں میں جو بظاہر یکساں ہوں یا جن کے ساتھ ایک ہی قسم کے جذبات وابستہ ہوں مشابہت و مطابقت دریافت کرتا ہے۔ اس کے برعکس بذلہ سنجی مخالف و متضاد اشیا میں مماثلت یا مشابہت کا سراغ لگاتی ہے جو عارضی۔ اتفاقی اور غیر متوقع ہو۔ بذلہ سنجی و ظرافت دماغ کا ایک علیحدہ و آزادانہ فعل ہے اور اس کا مقصد اشیا و خیالات میں محض جزئی۔ اتفاقی اور نام نہاد مشابہت کی دریافت سے پورا ہوجاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ظریفانہ و مذاقیہ شاعری کا کام کسی شے کی عظمت و اہمیت کو کم کرنا ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ کسی شے کو بنانا۔ بڑھانا۔ بلند کرنا اور قوی بنانا مشکل کام ہے لیکن اس کو بگاڑنا۔ گھٹانا پست کرنا اور کمزور بنانا بالکل آسان امر ہے۔ ہماری ہمدردی و دلچسپی حاصل کرنے کے لئے ایک خاص قابلیت کی ضرورت ہے لیکن ایک ادنیٰ آدمی بھی ہماری دلچسپی اور توجہ کو کسی چیز کی جانب سے ہٹانے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ ایک معمولی مسخرہ بھی بے ربط۔ بے جوڑ۔ بھونڈی اور احمقانہ باتوں سے ہمارے جذبۂ حمالیاتی اور احساسِ نفاست پسندی

کو گزند پہنچا سکتا ہے لیکن دیرپا تلازمات اور سچی تمثیلات کے ذریعے سے ہمارے خیالات وجذبات میں وسعت۔ رفعت اور تنو
پیدا کرنا ہر کس وناکس کا کام نہیں خفیف اثر پیدا کرنے کے لئے کمزور سبب کافی ہے۔ بےحسی اور تشکیک کے لئے زیا
سعی ومحنت کی ضرورت نہیں لیکن بغیر کسی زبردست ہیجان یا قوی تحریک کے سرگرمی۔ اولوالعزمی اور یقین محکم پیدا نہیں ہو
ظرافت و بذلہ سنجی بالعموم ہمارے عُجب و پندار۔ خامی و کمزوری اور بےحسی وسطحیت کو مخاطب ومتاثر کرتی ہے لیکن سنجیدہ
جذباتی شاعری ہماری کرداری توانائی۔ اخلاقی استواری۔ بلندہمتی۔ نیکی اور شرافت کو روبکار لاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی
روشن سے روشن کارنامہ میں اگر دو چار حقیقی یا فرضی نقائص دکھا دیئے جائیں تو عوام اس سے نفرت و بیزاری کا
اظہار کرنے لگتے ہیں۔ معمولی تنقیص وتعریض سے کسی عظیم الشان ادبی شاہکار کی وقعت لوگوں کی نگاہ میں کم ہو جاتی ہے
آج کل کے کم سواد و پیشہ ور نقاد فطرت بشری کی اس کمزوری سے خوب واقف ہیں اور رسائل وجرائد میں اس سے پورا
اٹھاتے ہیں۔ تمسخر واستہزا کی جنگ کے لئے اوچھے سے اوچھا اوزار کام دے سکتا ہے اور اسے کمزور سے کمزور ہاتھ استعمال کر سکتا
حقیقت یہ ہے کہ استہزا کو ہر قسم کی غذا تقویت پہنچاتی ہے۔ کسی ادبی شاہکار میں ایک جملہ کی بے ربطی۔ ایک لفظ کا غلط
استعمال۔ ایک خیال کی تشکیک ہمارے احساسِ قدردانی اور جذبۂ احترام کو متزلزل کرنے کے لئے کافی ہے۔ استہزا
کا ایک آسان قاعدہ یہ ہے کہ جو صفات کسی اعلیٰ شے کے لئے مخصوص ہوں اُن کا انتساب کسی ادنیٰ اور فروتر چیز کے سا
کیا جائے۔ کسی ادبی یا فنی "اختراعِ فائقہ" کی نقل اتارنے یا اس کا مذاق اڑانے میں یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے
فی الحقیقت عظیم الشان اور مضحکہ خیز کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ خیالات میں وحدت ویکسانیت کی ذرا سی کم
بھی پُرعظمت شاعری کے نقوشِ تاثیر کو مٹا دیتی ہے۔ کسی جملہ کی معمولی بے ربطی سے بھی وہ استہزا کے لئے زرخیز زمین ثا
ہوجاتی ہے۔ سنجیدہ ومتین شاعری میں فن عروض کی ادنیٰ خلاف ورزی بھی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ ایک معمولی نحوی سقم
شعر کی ساری سحرکاریوں کو باطل کر دیتا ہے۔ یقیناً خیالات کی نزاکت۔ جذبات کی لطافت۔ اور تخیل کی بلند پروازی کو
قائم رکھنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس کے برعکس کسی اعلیٰ درجہ کے شعر کی ہنسی اُڑانا۔ اس کی نقل اتارنا۔ اس کے معنی کو
خبط کر دینا۔ اس کی مضحکہ خیز تشریح کرنا اور اس طرح لوگوں کو تفریح وتفنن کا موقعہ بہم پہنچانا نہایت آسان کام ہے۔
باوجود ان تمام باتوں کے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہر حال میں کسی سنجیدہ و اعلیٰ مضمون کی نقل اتارنے یا اس کی بد
تقلید کرنے سے وہ اپنے بلند منصب سے نیچے گر جاتا ہے یا قابلِ ملامت اور مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ بلکہ اکثر موقعوں پر کسی اعلیٰ
درجہ کے مضمون یا شعر کی ظرافت آمیز نقل اصل مضمون یا شعر کی متانت۔ بلندی اور عظمت کو اور نمایاں کر دیتی ہے مثلاً
حافظ علیہ الرحمۃ کا ایک شعر ہے کہ ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید ٭ کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

اس شعر میں یہ صوفیانہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے رہروان راہِ طریقت کا اولین فرض ہے کہ وہ اپنے رہنما و مرشد کی ہدایات پر بلا چون و چرا عمل کریں۔ اکبر الہ آبادی نے ایک فرد تر مضمون ادا کرنے کے لئے اپنے مخصوص مذاقیہ رنگ میں اس شعر کا یوں چربہ اتارا ہے ؎

بہ پائے خویش تزئیں کن بہ بوٹ ڈاسن پتلوں ٭ کہ سرسید خبر دارد ز راہ و رسم منزلہا

لیکن اکبر کے ظریفانہ انداز نے حافظ علیہ الرحمۃ کے شعر کے مضمون کو پست نہیں بنایا بلکہ اس کی حقیقت کو اور اُجاگر اور اس کی صداقت و اہمیت کو اور واضح و نمایاں کر دیا۔ سامع کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ سرسید کی ہدایتوں کی کورانہ پیروی اور انگریزی وضع کی اندھی تقلید جتنی گمراہ کن اور نقصان دہ ہے اتنی ہی ارشاداتِ مرشد کی بلا چون چرا تعمیل منزلِ مقصود تک رسائی کے لئے مفید و ضروری ہے۔ غرض کہ اصل اور نقل کے مقابلے سے اصل کی شان دوبالا ہو جاتی ہے اور اس کی عظمت و صداقت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ نقالی جتنی زیادہ تمسخر انگیز ہوگی اصل اتنی ہی زیادہ شاندار۔ پُر عظمت اور قابلِ احترام ہوگی۔

جھوٹی اور سچی بذلہ سنجی کے علاوہ اڈیسن نے ظرافت کی تیسری قسم بھی قرار دی جس کو اس نے "مخلوط بذلہ سنجی" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہاں خیالات تو نہایت کار آمد۔ دانشمندانہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں لیکن اسلوبِ بیان مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ وہ اشعار جو بظاہر ہزل معلوم ہوں لیکن ان کی تہ میں کوئی مفید خیال یا نصیحت پوشیدہ ہو اسی زمرہ میں شمار ہونے کے لائق ہیں مثلاً

(۱) کچھ اس کا اعتبار نہیں بے وفا ہے یہ ٭ نازاں نہ ہو جیئے زنِ دُنیا کی چاہ پر

(۲) دنیا سی خانگی کوئی ہوگی نہ بیسوا ٭ شوہر سے اپنے رہتی نہ دیکھی یہ زن درست

(۳) مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا ٭ اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اکبر الہ آبادی کے کلام میں اس قسم کی بذلہ سنجی کے وافر شواہد ملتے ہیں۔ ابتداءً ان کا ظریفانہ کلام صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے تھا لیکن آخر عمر میں وہ ظرافت کے پردہ میں بہت سے مفید مضامین ادا کرنے لگے۔ اس زمانہ میں انہوں نے ظرافت و بذلہ سنجی کو مذہبی و اخلاقی اصول اور سیاسی و معاشرتی مسائل کے ادائے مطلب کا ایک موثر ذریعہ بنا لیا تھا۔ عام طور پر وہ کلام نہایت پھیکا۔ بدمزہ اور بیزار کن سمجھا جاتا ہے جو پند و موعظت پر مشتمل ہو۔ لیکن اکبر نے پند و نصائح کی کڑوی کسیلی گولیوں پر ظرافت و خوش طبعی کی ایسی دبیز تہ چڑھا دی ہے کہ وہ خود بخود حلق کے نیچے اتری جاتی ہیں۔ ہر شخص خواہ وہ

ان کے خیالات کا موید ہو یا مخالف مزے لے لے کر ان کے اشعار پڑھتا اور سر دھنتا ہے۔ اکبر کا رنگِ ظرافت بے نظیر ہے۔ بہتوں نے ان کی تقلید کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ چند عنوانات پر اُن کے ظریفانہ کلام کے نمونے ناظرین کے نہ صرف تفننِ طبع کے لئے بلکہ درس و عبرت کے لئے بھی درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) مذہب و اخلاق

بجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبر
یہاں تو شیخ کو دھن ہے بگل بجانے کی

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

(۲) سیاسیات

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا جہلم اُن کا
پائنیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

سرفرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹئے اُن کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیضِ ارتقا کہیئے

کامیابی کا سدیشی پر ہر اک در بستہ ہے
چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

وصل کا اس بُتِ خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں
صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

(۳) جدید تعلیم و تہذیب

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سویّوں کا مزا بھول گئے

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں ‖ کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

شوقِ لیلائے سول سروس نے اس مجنوں کو ‖ اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

(۴) پردہ اور آزادیٔ نسواں

پردہ اٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں ‖ حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں

بے حجابی مری ہمسایہ کی خاطر سے نہیں ‖ صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر ‖ خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں ‖ میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

ہمارے ملک میں ہوتا ہے کیا تعلیمِ نسواں سے ‖ بجز اس کے کہ بابا اور بھی گھبرائیں اماں سے

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں ‖ حجاب اُن کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

(۵) طنزیات

آنر اگر ملے جو ہے نام و نمود میں ‖ کیا حرج زندگی ہو اگر حالِ زشت میں

دوزخ کے داخلہ میں نہیں ان کو عذر کچھ ‖ فوٹو کوئی لگا دے جو اُن کا بہشت میں

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے ‖ تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں ‖ بزِ اخفش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

(۶) دوسروں کے کلام کی نقل اور چربہ

کریما بہ بخشائے برحالِ بندہ ‖ کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

رشتۂ در گردنم افگندہ بیٹ ‖ میبرد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پائنیر ‖ کرزن چہ گفت و مل چہ شنید و ملر چہ کرد

عمر گزری ہے اسی دشت کی طراری میں ‖ دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں

درپسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست ‖ بعدِ ہر اسپیچ آخر چندہ ایست

یاد دار ایں قولِ مولانائے روم ‖ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

طربیہ ڈراموں میں کثرت سے اخلاقی ملفوظات۔ عملی مقولات۔ حیاتِ انسانی کے متعلق مفید ہدایتیں، نصیحتیں اور کام کی باتیں پائی جاتی ہیں لیکن اندازِ بیان اور طرزِ ادا کے لحاظ سے وہ بادی النظر میں محض مذاق اور تفنن کی چیزیں

معلوم ہوتی ہیں۔ قدیم فلسفیوں اور ادیبوں نے بھی حقائقِ زندگی کو ظرافت کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس معنی میں ایسوپ یعنی حکیم لقمان سب سے بڑا معلمِ اخلاق گزرا ہے۔ اور ایسوپ فیبل (حکایاتِ لقمان) ظرافت آمیز پند و نصائح کی بہترین کتاب خیال کی جاتی ہے۔ لقمان نے انسانی خامیوں اور خوبیوں کو جانوروں سے منسوب کر کے ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے صرف لطف و دلچسپی کا بلکہ درس و حکمت کا بھی وافر سامان مہیا کر دیا ہے۔ اشیائے محسوسہ کی طرح نیکی اور بدی اس کے نزدیک مجسم و متجسّد چیزیں تھیں۔ اس کی نظر میں انسان مکاری۔ کذب۔ ریا۔ ضد۔ تکبر۔ چرب زبانی۔ لغویت۔ غصہ وغیرہ کا عجیب معجون مرکب ہے۔ اس لئے اس نے ان صفات مجردہ کو اُن کی مناسبت کے لحاظ سے ڈینے۔ چونچ۔ چنگل۔ پنجے۔ ڈنک سینگ۔ دُم۔ لمبے کان۔ کوتہ گردن وغیرہ کی شکل میں نمایاں کیا ہے۔ فی الحقیقت اس کا فلسفہ ایک قسم کی طبعی تاریخ ہے جب ہم اس کے عجائب خانہ میں داخل ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ کہیں گدھا حکمت فلسفہ کے نکات بیان کر رہا ہے۔ کہیں مینڈک حیاتِ انسانی پر خطبہ گا رہا ہے کہیں بلبل آمدِ بہار کی تقریب میں دلکش ترانے سنا رہی ہے کہیں لومڑی حکمتِ عملی پر درس دے رہی ہے کہیں مدکھیاں محنت و مشقت کے مضمون پر تقریر کر رہی ہیں۔ غرض اس نے اخلاقی تعلیم کا نرالا طریقہ اختیار کیا ہے کہ مرد۔ عورت۔ بچے۔ جوان۔ بوڑھے سب اس سے یکساں طور پر محظوظ و لطف اندوز ہوتے ہیں اور پند و نصائح کے موتی رولتے ہیں۔ یقیناً اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ جانوروں کی دلچسپ و نصیحت آمیز حکایتوں کا موجد کتنا بڑا صاحبِ کمال ہوگا۔

کٹھ پتلیوں کے تماشے کی لطف بخشی و انبساط خیزی بھی اسی اصول کی رہینِ منت ہے جس کی کارفرمائی جانوروں کی کہانیوں میں پائی جاتی ہے۔ حکایاتِ لقمان کی ساری دلچسپی حیواناتِ مطلق کو انسانی اوصاف سے متصف کرنے پر موقوف ہے لیکن اگر بیجان چیزوں کو انسانی خوبیوں اور خامیوں کا حامل بنایا جائے تو ظرافت میں تیزی اور شدت کا پیدا ہو جانا ایک فطری و یقینی امر ہے۔ فی الحقیقت تار اور چرخیاں صرف کٹھ پتلیوں ہی کے اعضا و جوارح کو نہیں بلکہ ہمارے دلوں کو بھی متحرک کرتی ہیں۔ کون ایسا مردہ دل ہوگا جو بالشت بھر کر کٹھ پتلیوں کو اُچھلتے کودتے۔ ناچتے گاتے۔ سوال جواب کرتے۔ لڑتے جھگڑتے اور تمام انسانی حرکات و سکنات کی نقل کرتے دیکھے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ نہ ہو جائے۔ ایک نقاد کا قول ہے کہ طربیہ ڈرامے کے موجد سے کہیں بڑھ کر کٹھ پتلیوں کے تماشے کا موجد ہیئتِ اجتماعیہ کا محسن تھا۔

ظرافت و بذلہ سنجی کے متعلق مسٹر بیرو (Barrow) کا بیان نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ انہوں نے مختصر الفاظ میں ظرافت کی تمام خصوصیات کا اس خوبی سے استقصا کیا ہے کہ گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص سوال کرے کہ ظرافت کیا ہے تو میں اس کو وہی جواب دوں گا جو ڈیموکریٹس نے انسان کی

ماہیت دریافت کرنے والے کو دیا تھا کہ انسان وہ ہے جسے ہم دیکھتے، جانتے اور پہچانتے ہیں اس لئے اگر انسان کی منطقی تعریف جنس و فصل کے حوالہ سے بیان کی جائے تو اس سے عوام کی واقفیت میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ ظرافت و بذلہ سنجی کی نوعیت و ماہیت سے بھی ہر شخص واقف ہے اس لئے وہ توضیح و تشریح کی محتاج نہیں۔ اس کے اقسام بے شمار ہیں۔ وہ اتنی صورتوں اور لباسوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور اس کے معنی و مفہوم میں اس قدر تنوع پایا جاتا ہے کہ اسے منطقی تعریف میں محدود و معین کرنا ویسا ہی دشوار ہے جیسا غیر مرئی اور مجرد اشیا کی رنگ و بو قلم سے تصویر کھینچنا۔ ظرافت کبھی کسی مضحک واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے کبھی کوئی مذاقیہ قول نقل کرنے سے کبھی کوئی دلچسپ لطیفہ یا حکایات بیان کرنے سے کبھی ذو معنی یا متحد الصوت الفاظ کی بازیگری سے پیدا ہوتی ہے۔ ظرافت و بذلہ سنجی کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں مثلاً دو یا زیادہ اشیا میں کسی حیرت انگیز مشابہت یا فرق کی دریافت۔ سوال و جواب کی نوک جھونک کسی واقعہ کی مضحکہ خیز توجیہہ و تشریح۔ مبالغہ کی بے اعتدالی۔ غیر متناسب تشبیہ و استعارہ۔ رمز و کنایہ۔ طنز و تعریض، طعن و تشنیع نقلی گفتگو۔ دیہاتی بول چال کسی کے حرکات و سکنات کی نقالی۔ فرضی اور بناوٹی سادگی و معصومیت۔ کوئی کام کر کے انجان بن جانا۔ تجاہلِ عارفانہ۔ خود اپنی یا دوسروں کی حماقتیں بیان کرنا وغیرہ۔ لیکن ظرافت کے بس اتنے ہی طریقے نہیں ہیں بلکہ اور بھی کتنی صورتیں ہیں جن کی ماہیت وجہ گونگی سے کوئی شخص واقف نہیں جس طرح خیال آرائی کے طریقے اور زبان کی بھول بھلیاں یا توڑ مروڑ بے شمار ہیں اسی طرح ظرافت و بذلہ سنجی کے ذرائع حیطۂ احصا سے باہر ہیں۔ بسا اوقات ہنسی کی وجہ سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ چنانچہ بعض نامی ظریف ایکٹروں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ تماشا گاہ میں ان کے آتے ہی قبل اس کے کہ وہ کوئی بات کہیں یا کوئی حرکت کریں تماشائی زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں اور سارا منڈوا ان کے قہقہہ کی آواز سے گونج اٹھتا ہے۔ بہر حال ظرافت کا اقتضا ہے کہ جو بات کہی جائے وہ اس قدر سادہ اور آسان پیرایہ میں ہو کہ سننے والا اسے فوراً سمجھ جائے۔ ظریفانہ کلام کو منطقی قیاس و استقرا یا حجت و استدلال کے بکھیڑوں سے پاک ہونا چاہیئے البتہ خیال یا طرز ادا میں کوئی خلاف معمول بات ضرور موجود ہونی چاہیئے جس سے سامع کے دل میں تعجب اور خوشی کا احساس پیدا ہو کیونکہ حیرت اور مسرت ظرافت کا لازمہ ہیں۔ بذلہ سنجی ایک لطیف فن کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کو ابتذال و سوقیت سے بالاتر اور تکلفات و تصنعات سے مبرا ہونا چاہیئے۔ ایک قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ جس بات پر یقین دلانے کے لئے منطقی دلائل و براہین سے کام نہیں چلتا وہ ایک معمولی ظرافت آمیز شعر یا جملہ کے ذریعے سے لوگوں کے ذہن نشین کرائی جا سکتی ہے۔ بذلہ سنجی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نفسِ بشری کو وزنی و سنجیدہ خیالات کی راہ سے ہٹا کر اسے شگفتگی اور تر و تازگی کے راستہ پر لگا دیتی ہے۔ وہ افسردگی اور بیزاری پیدا کرنے والے معاملات و واقعات میں بھی

ندرت اور عجب کا پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے اور دماغ کو اسی پہلو کی جانب منعطف کر کے مسرت و انبساط کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔

اگرچہ اکبر الہ آبادی جیسے باکمال شاعر نے ظرافت نگاری کو مذہبی و اخلاقی تعلیم اور سیاسی و معاشری اصلاح کا زبردست آلہ بنا لیا تھا لیکن عام طور پر مزاح و بذلہ سنجی محض ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ تصور کی جاتی ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ہنسی مذاق یا خندہ و قہقہہ کے متعلق حکما کا خیال کیا ہے۔ زمانۂ قدیم سے فلسفیوں کے دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک "لذتیین" کی جماعت جو فلسفۂ ابتہاج کی حامی ہے اور جس کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ "کھاؤ پیو اور موج کرو"۔ ابیقورس اور عمر خیام اس جماعت کے امام ہیں لیکن فلسفیوں کی کثیر التعداد جماعت الم دوست اور قنوطی واقع ہوئی ہے۔ اس جماعت کے لوگ تضحیک و استہزا اور ہجو و تمسخر کے سخت مخالف ہیں۔ وہ خندہ و ظرافت کو اصولِ دانشمندی کے منافی خیال کرتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر ینگ (Young) کا قول ہے کہ "قہقہہ اگر گناہ نہیں تو نیم بداخلاقی ضرور ہے۔ زور زور سے ہنسنے والا کسی شخص کا تحقیر آمیز استہزا کرتا ہے۔ چونکہ ہجو و استہزا میں نفرت، حقارت، دل آزاری، تلخی اور زہرناکی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ ایک مجرمانہ فعل ہے۔ علاوہ بریں قہقہہ لگانے والے یا ٹھٹھا کرنے والے میں سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کے احمق ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس پر طبل بلند بانگ در باطن ہیچ کی مثل صادق آتی ہے۔ اگر تم کو سچی مسرت کی تلاش ہے تو انجیل پڑھا کرو۔ اگرچہ یہ نصیحت تم کو عجیب معلوم ہوگی لیکن یقین جانو کہ یہ روحانی خوشی اور قلبی اطمینان حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے"۔

ہوبس (Hobbes) رقمطراز ہے کہ ہنسی کی تہ میں جذبۂ تفاخر کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ بالعموم انسان اپنے ہم جنسوں میں کوئی عیب و نقص یا خامی و کمزوری دیکھ کر ہنستا ہے۔ وہ جس پر ہنستا ہے اسے اپنے مقابلہ میں بیوقوف اور فرد تر تصور کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اچھالنا چاہتا ہے جب تم کسی کو قہقہہ لگاتے دیکھو تو یہ نہ خیال کرو کہ وہ بہت خوش ہے بلکہ سمجھ لو کہ وہ حد درجہ مغرور و متکبر ہے اور اس کو بنی نوعِ انسان سے کچھ بھی محبت و ہمدردی نہیں ہے۔

ارسطو کا خیال ہے کہ ہر ڈراما نویس معلم کی حیثیت رکھتا ہے۔ طربیہ و المیہ دونوں کا مقصد یکساں ہے۔ دونوں کو سبق آموز و عبرت خیز ہونا چاہیئے۔ طربیہ ڈراموں میں نقالی یا مسخرگی کے ذریعہ سے حاضرین کو جو ہنسانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ طربیہ نگار کے لئے کوئی خوبی کی نہیں بلکہ سخت عیب کی بات ہے۔ کوئی صحیح المذاق شخص اس قسم کی بیہودگی اور مسخرے پن کو پسند نہیں کر سکتا۔

بن جانسن کہتا ہے کہ سرکہ اس وقت تک تیار نہیں ہوتا جب تک شراب سڑ نہ جائے۔ بگڑ نہ جائے اور خراب نہ ہو جائے۔

اسی طرح عوام کالانعام کے ہنسنے اور خوش ہونے کے موقعے پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ جب تک مذاقِ لطیف اور وجدانِ سلیم کا خون نہ ہو جائے۔ عوام الناس کو ہنسانے کے لئے طربیہ ڈراموں میں کبھی کبھی کبڑے جادوگر یا بدہیئت و لاغر فلسفی یا عورتوں کا لباس پہنے ہوئے مسخرے کو منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ نقال آپس میں فحش کلامی کرتے ہیں۔ ڈوم اور بھانڈ کسی پر پھبتی کستے ہیں، کسی کی ہجو کرتے ہیں۔ بھلے مانسوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بیحیائی کی باتیں کرتے ہیں۔ شریف لوگ تو کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں لیکن تیسرے درجہ کے تماشائی انہیں پھکڑ بازیوں اور ہزل سرائیوں پر خوش ہوتے۔ ٹوپیاں اچھالتے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ اسی بنا پر قدیم حکما خندہ و قہقہہ کو دانشمند آدمی کے منصب کے منافی سمجھتے تھے۔

"فلسفۂ خندہ" کا مصنف برگسان (Burgeson) اپنی کتاب کے اختتام پر لکھتا ہے کہ "سمندر کی سطح پر موجوں میں رقص اور ارتعاش پایا جاتا ہے لیکن عمقِ قلزم میں ہمیشہ امن و سکون ہوتا ہے۔ بالائے آب لہریں آپس میں ٹکراتی اور لے آتی ہیں۔ بچے کفِ دریا کو نشان جان کر ساحل سے اٹھا لیتے ہیں لیکن جب ہاتھ کھول کر دیکھتے ہیں تو بجز پانی کے کچھ بھی نہیں پاتے۔ یہی حال قہقہہ کا ہے۔ وہ زندگی کے سمندر کا محض کف ہے۔ جو شخص اس کے رقص کو فاصلہ سے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے اور آفتاب سے اس کا مساماتِ جسم روشن ہو کر طلسم نور نظر آتا ہے لیکن جو قریب جاتا ہے محض فریب پاتا ہے اور تلخ کام ہوتا ہے"۔

دوسرے مغربی حکما نے بھی اسی قسم کے متشائم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کوئی قہقہہ کو غلبۂ نفس دور کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے کوئی اسے اخلاط کی زیادتی اور مرض کی علامت تصور کرتا ہے۔ نااہلوں کے نزدیک خندہ زندہ دلی کے مترادف ہے لیکن اہلِ دل خندہ کو خواب و غفلت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ شیرخوار اطفال سوتے میں ہنستے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو روتے ہیں جب تک انسان حقائقِ زندگی سے ناآشنا رہتا ہے اس وقت تک ہنستا ہے لیکن جب اس پر حقیقت و معرفت کا انکشاف ہوتا ہے تو بجز غم کے اس کا کوئی رفیق نہیں رہتا۔

اردو کے فلسفی شاعر مرزا غالب باوجود اپنی فطری شوخی و شوخ نگاری کے خندہ کے باب میں برگسان کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے　　دعوئ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل　　یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام　　ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں　　دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

ان خیالات کے مدنظر کیا ظرافت بالکل بیکار اور ہنسنا ہنسانا ایک لایعنی سی چیز ہے؟ ہرگز نہیں۔ ظرافت اپنے جائز حدود کے اندر بُری چیز نہیں ہے البتہ اس میں بے اعتدالی معیوب ہے لیکن ظرافت ہی پر کیا موقوف ہے زیادتی و بے اعتدالی تو ہر چیز میں مضر ہوتی ہے ظرافت کے بیسیوں مدارج ہیں کثیف اور لطیف ظرافت میں امتیاز قائم کرنا ہو تو اودھ پنچ کا مقابلہ رقعاتِ غالب سے کرو۔ چنانچہ ان دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے پنڈت برج نرائن چکبست فرماتے ہیں کہ "قوموں کے مذاقِ سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیتِ مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے لطیف ظرافت و بذلہ سنجی اور استہزا و تمسخر میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہو تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوط پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طراز طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے رو رہا ہے اور دیکھنے والے اس کی بیکسی پر روتے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔"

غرض کہ نامرغوب و ناپسندیدہ ظرافت وہی ہے جو تمسخر، استہزاء، ہجو، پھکڑ وغیرہ پر مشتمل ہو۔ بدمذاق لوگ انہیں باتوں پر بے ہنگام قہقہے لگاتے ہیں۔ ایک قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ بے تکلف قہقہہ لگانا یا محض تبسم زیر لبی پر اکتفا کرنا ظرافت کی نوعیت پر اتنا منحصر نہیں ہے جتنا خود سامع کے معیارِ تہذیب و شائستگی پر۔ ایک صاحبِ ذوق کسی پُر لطف و معنی خیز ظریفانہ فقرہ سے اس طرح لطف اندوز ہوگا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی لیکن ایک بدمذاق اسی فقرہ پر ایسا بے ہنگام قہقہہ لگائے گا کہ ہمسایوں کی نیند خراب ہو جائے گی۔ بہرحال زور زور سے قہقہہ لگانا بدمذاقی و بدتہذیبی کی دلیل ہے۔ مہذب و شائستہ انسان صرف کلی کی طرح متبسم یا گلاب کی طرح شگفتہ ہونے پر اکتفا کرتا ہے۔ گل خند یا شکر خند انسان کا ایک فطری فعل ہے اور روح و دماغ کی تر و تازگی صحت اور قوت کے لئے ضروری چیز ہے۔ لاول کہتا ہے کہ اگر تم کسی باغِ وحوش میں جاؤ تو بعض ایسے عجیب الخلقت جانور نظر آئیں گے جن کا بے ڈول جسم، بھونڈی کاٹھی اور بھدی چال دیکھ کر تم اپنی ہنسی ضبط نہیں کرسکتے۔ اور تم کو ماننا پڑیگا کہ خود کارکنانِ قضا و قدر بھی ظرافت کا خاصا مذاق رکھتے ہیں۔ غرض کہ انسان کے لئے ہنسی مقتضائے فطرت ہے۔ طربیہ ڈرامے کے مضحک عناصر کے متعلق ارسطو اور بن جانسن کے خیالات کچھ بھی ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب المیہ واقعات کا نظارہ ہمارے قلب کو حزن و ملال کے جذبات سے گرانبار کر دے تو طبیعت کی افسردگی، گرانی اور بیزاری دور کرنے کے لئے ہمیں لامحالہ طربناکی کی جانب مائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ اگر ظرافت و بذلہ سنجی اپنے مقررہ حدود سے تجاوز نہ کرے تو ہمارے دل و دماغ پر اس کا نہایت مفید و صحت بخش اثر پڑے گا۔ البتہ اگر ہنسی بلا وجہ ہو تو کوئی شے اس سے بڑھ کر لغو [illegible] نہیں ہوسکتی۔

انسان کو کسی چیز سے اتنی تکلیف اور بیزاری نہیں ہوتی جتنی پیشہ ور بھانڈوں اور مسخروں سے مصنوعی ظرافت اور بناوٹی ہنسی دونوں قابلِ ملامت ہوتی ہیں۔ پیشہ ور نقال ہمیشہ اِس دُھن میں لگا رہتا ہے کہ ہنسنے ہنسانے کا کوئی نہ کوئی موقعہ زبردستی پیدا کیا جائے۔ اور بناوٹی ہنسی ہنسنے والا بغیر موقعہ ومحل کا لحاظ کئے ہوئے بات بات پر ہنستا رہتا ہے۔

تعجب کا احساس ظرافت کا لازمہ ہے لیکن اگر کوئی شخص ہر چیز کو جو نظر کے سامنے آئے دیکھ کر حیران اور بھونچکا ہو جایا کرے تو اس سے زیادہ جاہل اور خر دماغ کون ہوگا؟ اسی طرح وہ آدمی بھی نرا بیوقوف ہے جو توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص ہمیشہ اسی جیسا سنجیدہ و خشک مزاج بنا رہے۔ بھانڈ اور مسخرے ہر موقعہ پر ہنستے ہیں اور اپنے بے ہنگام قہقہوں سے لوگوں کو بیزار اور متنفر کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی چیز میں بھونڈاپن یا کسی خیال میں بے ربطی کی دریافت محرکِ خندہ ہوتی ہے لیکن ہر بری بھلی شے میں عیب ونقص نکالنا احساس وادراک کی تیزی کی دلیل نہیں ہے بلکہ اختلالِ دماغی کی علامت ہے۔ ایسے شخص میں دو یا زیادہ خیالات کے درمیان ربط وتسلسل اور مناسبت ومشابہت قائم کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ جو لوگ ہمیشہ ہنستے رہتے ہیں وہ اپنے ہم چشموں اور ہم جلیسوں کی ہمدردی کھو بیٹھتے ہیں کیونکہ ہنسنے میں ان کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ مجمع میں کسی شخص کی تنہا ہنسی لطف ودلچسپی سے خالی ہوتی ہے۔ اسی طرح مصنوعی ظرافت انسان کے احساسِ جمالیاتی اور جذبۂ نفاست بندی کو کند بنا دیتی ہے متعلم کو جاننا چاہیئے کہ مزاحیہ تصنیفات اور ظریفانہ کلام ہمیشہ پڑھتے رہنے سے سنجیدہ ودقت طلب مضامین کے مطالعہ سے طبیعت ابا کرنے لگتی ہے سعی وتلاش اور غور وفکر کا مادہ کمزور ہو جاتا ہے اور ادبی وعلمی مہمات سر کرنے کی ہمت باقی نہیں رہتی جس طرح چٹپٹی چیزیں صرف تبدیلِ ذائقہ کے لئے کھائی جاتی ہیں اسی طرح ذہنی کاوش وکاہش کے بعد محض تفریحِ طبع کی خاطر مزاحیہ مضمون یا ظرافت آمیز کلام کا مطالعہ کر لینا چاہیئے۔ ظرافت ذہنی غذا نہیں بلکہ محض چاشنی ہے۔ نہ صرف مطالعہ کی چیزوں میں بلکہ گفتگو میں بھی ظرافت کا جُز اتنا ہی رہنا چاہیئے جتنا آٹے میں نمک کا ورنہ اس کی زیادتی خوش ذائقگی کے بجائے بدمزگی کا باعث ہوگی۔

محمد حسین ادیب

"کہیئے! وہ گھڑی کیسی نکلی جو آپ نے سرکس سے انعام میں پائی تھی؟"

"نہایت نفیس! پچاس ہی منٹ میں تو پورا گھنٹہ ختم کر لیتی ہے"۔

بھجن

بنسی دھر مہراج ہمارے ہردے کنج میں بنسی بجاؤ
سب بھگتوں کے راجہ ہو تم پریم بھجن سے من کو رجھاؤ
تم سب پیاروں کے پیارے ہو آؤ پریت کی ریت سکھاؤ
جگ نرگن ہے تم گن والے پربھو گن کی بات بتاؤ

رادھا سوامی اَنتَریامی
پریم آنند کی راہ سجھاؤ

تم سے آس لگا کر آئے بپت بناشن[1] تم سرکارا
کون سنے فریاد دکھی کی اس جگ میں ہے کون ہمارا
تم سے مَن کی ڈور لگی ہے چھوڑو اب آنند کا دھارا
دَرشن دو مقبول کو اپنے ہردے واکے دھیان تمہارا

رادھا سوامی اَنتَریامی
دو اب مایا سے چھٹکارا

مقبول

---

[1] یعنی مشکل کشا

سوال جواب

کیا کہیئے! جس کام سے انسان بھاگے اُدہر اکرو ہی ہوتا ہے، میں بحث بحثی اور تُو تُو میں میں سے سخت گھبراتا ہوں۔ سوال جواب سے میری روح قبض ہوتی ہے، دھڑے بندی اور فرقے بازی سے کچھ ایسا دہلا ہوں کہ ہر شخص سے بات کرتے جی ڈرتا ہے، جب ہی تو سوائے دو چار دوستوں کے کسی عزیز قریب سے بھی میری دانت کاٹی روٹی نہیں، بقول شخصے :-

چاہت اچھی ہے کسی سے، نہ عداوت اچھی ∴ گھر بھلا، آپ بھلے، سب سے قناعت اچھی

اکثر صحبتوں سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشین ہو گیا ہوں، جس شخص کو اپنی ہی کھینچ تان سے سر کھجانے کی مہلت نہ ملتی ہو، اُسے کسی اور کی بُرائی بھلائی سے کیا کام، کیا میں کوئی خدائی فوجدار ہوں کہ ایک جان کو ہزار عذاب لگائے رکھوں۔

مگر نہیں جناب! اس کا نام ہے "دنیا" یہاں چوہے کے بل میں بھی پناہ نہیں ملتی، کوئی غریب کیسی مصیبت میں ہو، یار لوگوں کو اپنی دل لگی سے کام، دُبلا، موٹا، کالا، گورا، سیتلا منہ، داغ، خوبصورت، بدصورت، ڈاڑھی، مونچھ، قطع، وضع، رفتار، گفتار، غرض کیا شے ہے جو ان کی خوش مذاقیوں سے محفوظ رہ جائے۔

اس درجہ بے لاگ ہونے پر بھی لوگوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے، میں کچھ کروں کسی کو تعلق ہو یا نہ ہو، بے سبب بے واسطہ راہ چلتے میری جان کو آجاتے ہیں، اب بتایئے جیتے جی کہاں مروں، جو مخلوق کے سوال جواب سے بچوں۔

ہر خوش نما چیز پر عام اس سے کہ وہ انسان ہو یا حیوان، جاندار ہو خواہ بیجان یہ کمبخت دل لٹو ہو جاتا ہے، اس خبط میں ایک بار آئے جو شامت میری تو میں نے کانچ کے ایک بڑے سے مرتبان میں قسم قسم کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پال لیں، صاحب سنبھال بڑی چیز ہے نہیں مریں، انہیں روا یا ڈبل روٹی کا چورا ڈال دیا کرتا تھا، دو چار ہفتے میں اچھی طرح ہل گئیں، وہ مرتبان انہیں اپنا گھر معلوم ہونے لگا، چارہ پاکر خوب کُلیلیں کیا کرتی تھیں اور اگر مرتبان میں اُنگلی ڈبو کر آہستہ آہستہ ہلاتیں تو جیسے کسی نے ڈوری سی کھینچ دی ایکدم اوپر آکر انگلی کترنے لگتی تھیں، دانت وانت تو ان کے منہ میں تھے نہیں، اس واسطے بجائے تکلیف کے بڑا مزا آتا تھا۔

وہ ننھی ننھی سی جانیں دو تین مہینے میں شاید دو چار ماشے چارہ کھاتی ہونگی، اور اگر ہفتہ عشرہ کچھ نہ ڈالو تو صرف پانی ہی

پر مگن رہتی تھیں، بلّی کیسی ظالم ہے کہ کبوتر سوتے جاگتے اُسے کوستے رہتے ہیں، لیکن جناب وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھی، کتنی ہی بار دیکھنے میں آیا کہ حریص بلّی انہیں دیکھ دیکھ کر بلبلا رہی ہے، ہائے کس طرح میرے قابو میں آئیں اور میں انہیں ہڑپ کر جاؤں، مگر نہ تو وہ اس بھاری مرتبان کو اُلٹ سکی، اور نہ پانی میں اس کا بس چلا، بس یوں ہی ترس ترسا کر رہ گئی۔ ان مچھلیوں سے کمرے کی زینت اور میز کی آرائش تھی، وہ مرتبان کیا تھا گویا کوزے میں دریا بند تھا کیسا ہی دل پریشان ہو ذرا مرتبان سامنے رکھ لیجئے، پھر دیکھئے تماشا کوئی مچھلی بلبلا لینے آہستہ آہستہ اوپر آ رہی ہے چند مچھلیاں موج موج میں ادھر اُدھر تیرتی پھرتی ہیں، دو میں لڑائی ہو گئی ایک کا ایک پیچھا کر رہی ہے بعض مچھلیاں مرتبان کی دیوار سے منہ لگا کر کبھی لہراتی ہوئی اوپر آتی ہیں کبھی نیچے جاتی ہیں، اب کہاں تک عرض کروں اتنے سے مرتبان میں خدا کی قدرت کا طلسم نظر آتا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایک مرتبان میں قید مچھلیاں سوائے تفریحی مشغلے کے مجھے کیا نقصان پہنچاتیں، یا ان کی نگہداشت میں میرا کونسا ہرج ہو سکتا تھا، مگر بدقسمتی میری کہ ان بے ضرر مچھلیوں کی وجہ سے آنے جانے والوں نے میرا ناطقہ بند کر دیا، دل آزار سوالوں کا ایک سلسلہ جاری ہوا جو ایک لمبی میعاد تک قائم رہا۔

تین چار نوجوان جن سے کچھ جان نہ پہچان اچانک نمودار ہوئے اور بیٹھنے سے پہلے اُن میں سے ایک صاحب فرمانے لگے۔

"خوب! یہ تو بڑا مزا کر رکھا ہے۔۔۔۔ آپ نے۔۔۔ واہ جناب کمال کر دیا۔۔۔ آہا۔۔۔ کیا ذرا ایک پکڑ لوں"؟

دوسرے صاحب۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں خبردار ہاتھ نہ لگانا، صاف مر جائیگی!

تیسرے۔ ارے بھئی چھونے چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے بس دور سے دیکھتے جاؤ۔

چوتھے۔ (جو ابھی تک مرتبان پر ٹکٹکی لگائے گم سم سے بیٹھے تھے) میں بھی پالوں گا، خدا نے چاہا تو۔

دوسرے۔ مگر آئینگی کہاں سے ایسی مچھلیاں۔

پہلے صاحب۔ اجی جناب تُل چکیں اِن سے، جس کا کام اُسی کو ساجے (گویا میرے باپ دادا مچھلیاں پالنے کا ہی دھندا کرتے چلے آئے ہیں)

چوتھے۔ (لمبی سانس لے کر) خیر کچھ بھی ہو، میں تو چلتے وقت ایسا ہی ایک مرتبان ضرور لیتا جاؤنگا۔

تیسرے۔ اور جو کہیں راستے میں ٹوٹ گیا تو کیا کرو گے!

ان حضرات میں بات بات پر بحث ہو رہی ہے، اور میں صورتیں دیکھ دیکھ کر گھٹ رہا ہوں کہ الٰہی یہ بلا کہاں سے نازل

ہوئی، مجھ غریب پر کیوں کرم فرمایا گیا، یہ کون ہیں، کیا ہیں اور کس غرض سے وارد ہوئے جب نہ رہا گیا تو مجبوراً پوچھنا پڑا
صاحب! کیسے تشریف آوری ہوئی۔

اس پر وہ کان کھڑے کر کرکے چونکے، اور بولے :۔

معاف کیجئے گا، ایک مشاعرہ ہونے والا ہے، ایس۔پی۔ایس کے ہال میں۔

میں۔ تو پھر کیا کروں ؟

اب ہنسے اور بیک وقت چاروں نے کہا :۔

لیجئے ۔ ۔ ۔ خوب ۔ ۔ ۔ ۔ اجی صاحب آپکے ہی دم کا تو ظہور ہے، فلاں تاریخ ماہ حال یعنی کل سات بجے شام مع دوست احباب کے تشریف لائیے، ایگزیکٹ ٹائم ہے، دیر نہ لگائیے گا !

توبہ ہے مچھلیوں کی بحث سے چھٹکارا ہوا تو یہ شاخ نکلی مشاعرے میں جانے کی ٹھن گئی اور اس معذرت پر کہ اتنی جلدی مشاعرے کی تیاری نہ کرسکوں گا جرح شروع ہوگئی، ان کے سوالات سے تنگ آکر ہامی بھرنی پڑی۔ کہ اچھا صاحب دیکھا جائے گا، تو کہنے لگے دیکھا جائیگا نہیں، ہم آپ کو زبردستی پکڑ کر لے جائیں گے مشاعرے میں۔

مچھلیوں کا مرتبان میز پر رکھے کچھ لکھ رہا ہوں، اُس محویت میں کہ چڑیا بولے تو دھیان اچٹ جائے ایک گرج سنائی دیتی ہے:۔

"واہ کیا کہنا ۔ ۔ ۔ ۔ بہت اچھے رہے، کیوں صاحب یہ کیا ہے"؟

اس زلزلہ خیز گرج سے چونک کر جو سر اٹھایا، تو نہ جانے کون بزرگ فرماتے ہیں :۔

کیوں صاحب! یہ کیا ہے ؟ السلام علیکم !

وعلیکم السلام کہ کر میں نے سر نیچا کر لیا، اور لکھنے لگا، ادھر وہ صاحب دھم دھم پیر پٹکتے ہوئے لپکے :۔

کیوں صاحب یہ مچھلیاں ہیں کیا، مچھلیاں ہی ہیں نا ۔ ۔ ۔ ۔ جنے کہاں سے آئی ہوں گی، (خود بخود قہقہہ لگا کر)

آہا ۔ ۔ ۔ مچھلیاں ۔ ۔ ۔ جیتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تیر رہی ہیں۔

پھر میز پر توند ٹکا کر آپ نے مرتبان کے اوپر چٹکی بجائی، اور خوب زور سے چیخے :۔

ارے! وہ تو نیچے چلی گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں صاحب مول لی ہیں، یہ کیا کھاتی ہونگی۔ کیوں صاحب!

میں۔ ردا یا ڈبل روٹی کا چورا۔

وہ۔ اچھا اور گوشت۔

میں ۔ شاید گوشت بھی کھاتی ہوں گی ۔

وہ ۔ شاید کیا، گوشت ہی تو ان کا اصلی کھاجا ہے، دریا میں رہ کون کھلاتا ہوگا اِن کو ۔

میں ۔ جی ہاں ایسا ہی ہوگا ۔

وہ ۔ وہ ہوگا نہیں، بلکہ ہے ۔ ۔ ۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کبھی گوشت کھلا کر ۔

میں ۔ اتفاق نہیں ہوا ۔

وہ ۔ کیوں ۔ ۔ ۔ خیر اب سہی، مگر بہت باریک قیمہ کر کے کھلائیں تو شاید کھا سکیں، خدا کے واسطے کہیں بڑی بڑی بوٹیاں نہ ڈال دیجئے گا، ہرگز نہ کھائیں گی، پر گوشت کھلایئے ضرور ہمارے کہنے سے ۔ ۔ ۔ کب سے ہیں یہ آپ کے پاس ۔

میں ۔ مہینوں ہو گئے ۔

وہ ۔ اور مریں نہیں بالکل ؟

میں ۔ جی کچھ مر بھی گئیں ۔

وہ ۔ ارے مر گئیں، افسوس! کیوں صاحب کیسے مریں ؟

میں ۔ یوں ہی بے احتیاطی سے ۔

وہ ۔ آپ نے بے احتیاطی کیوں کی ۔

میں ۔ ہو گئی ۔

وہ ۔ کیوں ہو گئی ۔ ۔ ۔ ایسی بے احتیاطی آپ سے کہ وہ مر گئیں، ۔ ۔ ۔ لیکن اب تو قطعی پل گئی ہیں، یہ نہیں مریں گی ۔ ۔ ۔ کہ مر جائیں گی؟ اور کیوں صاحب ان کا پانی روز بدلنا پڑتا ہے کیا ؟

میں ۔ جی ہاں ۔

وہ ۔ روز! اچھا دن میں کے دفعہ ؟

میں ۔ دو ایک بار ۔

وہ ۔ اور اگر تین چار روز نہ بدلیں تو ؟

میں ۔ گدلا ہو جائے ۔

وہ ۔ گدلا ہو جائے تو کیا مچھلیاں مر جائیں ؟

میں ۔ (منت سے) مکرم بندہ معاف کیجئے، میں کچھ لکھ رہا ہوں، باتوں میں خیال بٹتا ہے، ذرا لکھنے دیجئے ۔

وہ ۔ (کڑک کر) تو مکھئے شوق سے۔۔۔ کون منع کرتا ہے۔۔۔ بلکن کیوں صاحب یہ بچے بھی دیں گی کیا۔۔۔۔۔ کہ نہیں۔۔۔ بہت ذرا ذرا سے دیتی ہوں گی؟

میں ۔ (خون کا سا گھونٹ پی کر) جناب مچھلیاں بچے نہیں دیتیں۔

وہ ۔ (ہکا بکا سے ہو کر مجھے دیکھا پھر قہقہہ لگا کر) لو بھئی ہم بھول گئے' ہاں ہاں ٹھیک ہے مچھلیاں تو انڈے دیتی ہیں۔۔۔۔ اچھا خیر۔۔۔ تو یہ انڈے دیں گی۔۔۔ اس مرتبان میں۔۔۔ مگر جگہ ذرا کم ہے۔۔۔ کیوں صاحب اُن انڈوں سے بچے نکل آئیں گے کیا' لیکن اگر پانی بدلا گیا تو کیا ہوگا؟

ابھی وہ صاحب ہٹنے پائے تھے' کہ ایک اور حلق پھاڑتے آموجود ہوئے:۔

"کیوں صاحب! یہ کیا ہے۔۔۔ اچھا مچھلیاں ہیں۔۔۔ رنگ برنگی۔۔۔ کیا جیتی ہیں۔ کہاں سے منگوائیں آپ نے یہ مچھلیاں بڑی ہو کر کیا کریں گی؟"

صبح سے لے کر رات کے بارہ بجے تک یہی آفت رہتی تھی' کہ ایک آیا لکچر دینے لگا' دوسرا بے سُری الاپتا آیا' اور تلے اُوپر سوالوں کی بھرمار کر دی' کیا مجال جو لگاتار گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بھی یکسوئی نصیب ہو۔

ہزاروں دفعہ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمیوں نے منع کرتے کرتے میرے سامنے مرتبان گھنگول دیا' اور پنسل یا انگلی سے مچھلیوں کو پریشان کرنے کی تو گنتی ہی نہیں۔

اگر میں ان لوگوں سے دق ہو کر مرتبان چھپا کر رکھ دیتا تھا' تو یہ صاحبان کمرے کے باہر سے ہی سوال کرتے آتے تھے:۔ کیوں صاحب! آج مچھلیاں کہاں ہیں۔۔۔ ذرا ادھر تو لائیے' کہیں مر تو نہیں گئیں' کیوں صاحب مچھلیاں مری تو نہیں ہیں؟

مجھے جواب دینا پڑتا کہ جی نہیں مریں۔ پھر خوش ہو کر فرماتے:۔

تو کہاں ہیں' اور آڑے' ترچھے ہو ہو کر کہتے:۔

صاحب ہمیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ کہاں ہیں!

میں ۔ ادھر آڑ میں رکھ دی تھیں۔

وہ ۔ کیوں!

میں ۔ لوگوں کی پوچھ گچھ اور سوال جواب کے ڈر سے۔

اتنا سنتے ہی وہ ناخواندہ مہمان کمرے میں آدھمکتے اور کیا کہتے:۔

کہاں ہیں، واہ چھپانے کی کیا ضرورت، یہاں رکھیئے میز پر، ہمیں بتایئے، ہم اٹھائے لاتے ہیں، ابھی ابھی۔

اس خوف سے کہ کہیں یہ ظالم اٹھاتے دھرتے مرتبان توڑ نہ ڈالے، میں کہتا ہوا اٹھا کہ نہیں جناب آپ تکلیف نہ کریں میں خود اٹھائے لاتا ہوں، کرسی پر تشریف رکھیئے!

وہ ۔کیوں کیا ہوا، کیا ہمارے ہاتھ نہیں ہیں۔

میں ۔کہیں آپ کے ہاتھ سے گر نہ جائے۔

وہ ۔ کیوں گرے گا۔

انہیں بات کرتے چھوڑ کر میں نے مرتبان میز پر لا رکھا، اور وہ تھے کہ فوراً اس پر جھک پڑتے وہ زمین پکڑی ہلنے کا نام نہیں لیتے، رہ رہ کر ایک نہ ایک شوشہ چھوڑتے ہیں، فرفر زبان چل رہی ہے۔

خدا خدا کرکے وہ ٹلے اور اس خیال سے کہ اب کوئی گڑبڑ نہ مچے، میں تجنیر کا مارا دوبارہ مرتبان چھپا کر پڑ رہا، رات کی جگار سے آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، ذرا میں خراٹے لینے لگا۔

عین دوپہر میں کہ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے، مجھے تن بدن کا ہوش نہیں، مردوں سے شرط باندھ کر سو رہا ہوں معلوم ہوا کوئی صاحب سرہانے کھڑے آوازیں دے رہے ہیں، آنکھ جو کھولی ایک جنٹلمین بغل میں ٹوپ مارے سلام کرتے ہوئے نظر آئے اور چھوٹتے ہی کیا کہتے ہیں:۔

کیوں صاحب! وہ مچھلیاں کیا ہوئیں؟

اوہو! کس قدر صدمہ ہوا ہے، میں نے اس شخص کا کیا بگاڑا تھا، اس نے اپنے مزے کے لئے ناحق مجھے ستایا، سوتے سے جگا مارا، خیر اس کی جان کو صبر کرکے میں نے کہا:۔

جی...مہربانی کیجئے...تھکا ماندہ پڑا ہوں...پھر کسی وقت قدم رنجہ فرمایئے گا۔

مجھے جواب دیتا دیکھ کر کھسائے کہ اٹھ بیٹھا اور کیوں کیوں کیسی طبیعت ہے، کہتے ہوئے دھچ سے چارپائی پر دھک گئی۔

طرح طرح کی صورت بنا کر مزاج پرسی کرنے لگے، بہتیرا ٹالا ذرا نہ سرکے بلکہ گھما گھما کر وہی سوال کیا:۔

معاف کیجئے گا جناب آپ کو تکلیف تو ہوئی، مگر میں ایک دوست کو آپ کی مچھلیاں دکھانے لایا ہوں، وہ باہر کھڑے ہیں انہیں بلا لوں، ذرا آپ سے ملنا بھی چاہتے ہیں، آجایئے صاحب اندر میرزا صاحب جاگ رہے ہیں۔

دوسرے جنٹلمین بھی صدائے بازگشت کی طرح آ ہی تو گئے، اب سخت مجبوری تھی ایک آہ کے سہارے اٹھا، الٹ پٹے بیر

ڈالتا ہوا مرتبان کے پاس پہنچا۔ مارے تکلف (تکلف نہیں شوق) کے مرتبان میرے ہاتھوں سے چھینے لیتے تھے۔ بمشکل تمام میز پر مچھلیاں لا سکا۔

اب گویا مجھ سے کوئی تعلق ہی نہ تھا، دونوں مرتبان پر ٹوٹ پڑے اور چیخ چیخ کر کمرہ سر پر اٹھا لیا، اتنے ہی پر صبر نہیں، وہی تو سوالات بھی شروع کر دیئے جن سے میں پناہ مانگتا ہوں، اس خیال سے کہ جلد ٹلیں، میں چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا مگر وہ صاحبان برابر، یہ کہاں سے منگوائی ہیں، کیوں صاحب انہیں کتنا عرصہ ہو گیا آپ کے پاس، کیا کھاتی ہیں، انہوں نے کبھی انڈے بھی دیئے کہ نہیں، کیا ان کا رنگ قدرتی ہے کی کچھ کچھ سے میری جان اجیرن کرتے رہے، یہاں تک کہ دن کے ڈھائی کا عمل ہو گیا۔

مدعا یہ کہ ان مچھلیوں کے سبب سے تقریباً دو سال تک سوالات کی بلا لگی رہی، ہر وقت مصیبت نازل تھی، کہ کیوں صاحب کیا ہے بھلا کیا مچھلیاں ہیں، اس مرتبان میں انہیں تکلیف نہیں ہوتی، ذرا سی مٹی بھی ڈال دیا کیجئے، کیوں صاحب کسی بڑے حوض میں کیوں نہیں رکھتے مٹی چاٹ کر مچھلیاں بہت خوش ہوتی ہیں یہ بڑی ہو کر کہاں جائیں گی وغیرہ وغیرہ۔

یہاں تک کہ ۲۸ء میں اجرائے اخبار "اصلاح سرحد" کے لئے میری طلبی ہوئی اور میں ایک دوست کو مچھلیوں کا مرتبان سونپ کر پشاور چلا گیا۔

پشاور کا مستقل آب و دانہ میری قسمت میں نہ تھا، ڈھائی تین مہینے میں میرا دل وہاں سے اکھڑا اور چھٹی کے بہانے میں لاہور واپس آیا، خاطر خواہ داشت نہ ہونے کی وجہ سے اس اثنا میں مچھلیاں انتقال کر چکی تھیں۔

گو مچھلیاں مر کھپ گئیں، لیکن سوال جواب کا معاملہ اب بھی وہاں کا وہیں رہا، جو صاحب تشریف لاتے یا کہیں چلتے پھرتے مل جاتے، مجھ سے پہلے مچھلیوں کی خیریت پوچھتے، پھر اُن کے مرنے کا حال سُن کر جس طرح کسی مرحوم انسان کی موت پر اظہار تاسف کیا جاتا ہے، عزاداروں کی طرح پرسا دیتے تھے۔

رفتہ رفتہ یہ حادثہ کہ مچھلیاں غریق رحمت ہو گئیں جن جن قدردانوں کے علم میں آتا گیا، وہ سوال جواب سے میری روح قبض کرتے گئے :-

ہائے مر گئیں، وہ مچھلیاں، بچاری بہت اچھی تھیں، کیوں صاحب کیسے مر گئیں، کن صاحب کے پاس چھوڑ گئے تھے، انہوں نے کچھ پروا نہ کی ہو گی، ورنہ کاہے کو مرتیں، اس سے تو ہمیں دے جاتے تو آپ کا احسان ہوتا اور مرتیں بھی نہیں، . . . . انہوں نے پانی نہ بدلا ہو گا، کیوں کچھ کھانے کو بھی ڈالتے تھے وہ۔

حد ہے کہ اب بھی کبھی کبھی کوئی نہ کوئی مہربان ان مچھلیوں کی نسبت پوچھ ہی بیٹھتا ہے، اور میں سوال جواب کے خوف سے

لرز جاتا ہوں۔

جاڑے کا زمانہ تھا، میں چلتے وقت پشاور سے ایک اونی چغہ لیتا آیا، بس جناب پھر کیا تھا، آگئی شامت، اس وقت لوگوں کے حُلیے قابلِ ملاحظہ تھے، کئی کئی سال کے دوست ذرا نگاہیں چار ہونے کی دیر ہے، لگا رہے ہیں قہقہے پر قہقہہ۔

ارے بھئی یہ کیا ہوا!

مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوئے جاتے ہیں، بات کا جواب نہیں دیتے، ویسے میں سمجھ تو گیا، مگر چندرا چندرا کے پوچھ رہا ہوں، کیوں صاحب کیا ہوا؟ خیر تو ہے!

فرماتے ہیں :۔

یہ اٹھیک اب ہوئی شان پیدا، واللہ فوٹو کھنچوائیے، فوٹو۔

کیوں صاحب! یہ کہاں سے مارا . . . مگر سچا خوب . . . . اچھے خاصے عوج بن عوق بن گئے۔

انارکلی میں جا رہا ہوں، کوئی صاحب چیختے چلاتے چلے آتے ہیں :۔

"اجی جناب! اجی صاحب!! میں نے کہا آداب عرض ہے، بھئی بہت اچھے رہے، صاف بات ہے میں تو پہچانا بھی نہیں، واہ کیا بہروپ بھرا ہے، بالکل پرانی تصویروں سے نقشہ ملا دیا، یہ ہے کس ولایت کا، کیا کہیں سے منگوایا ہے؟

میں ۔ جی منگوایا تو نہیں، پشاور گیا تھا وہاں سے لایا ہوں۔

وہ ۔ کیا نیا؟

میں ۔ جی نیا نہیں تو کیا پُرانا۔

وہ ۔ (ہنس کر) میں تو ذرا دل لگی سے کہتا تھا، بیشک ہے تو نیا ہی . . . اچھا کیوں صاحب اِسے کیا کہتے ہیں؟

میں ۔ چغہ۔

وہ ۔ ٹھیک ہے تو چغہ ہی، اب سردی تو آپ کے پاس نہ پھٹکتی ہوگی، (ہاتھ سے ٹٹول کر) واقعی ہوگا تو بڑا گرم، کیوں صاحب آپ کو لحاف کی کیا ضرورت . . . . مگر اس میں بٹن تو ہیں ہی نہیں۔

میں ۔ چغہ میں بٹن نہیں ہوتے۔

وہ ۔ کیوں؟

میں۔ یوں ہی۔

وہ۔ یہی تو پوچھتا ہوں کہ بٹن کیوں نہیں ہوتے، . . . . اور جو کوئی لگالے تو!

میں۔ (جان چھڑانے کے لئے) لگالے اس کی خوشی۔

وہ۔ پھر آپ نے کیوں نہیں لگائے۔

میں۔ اسی طرح رواج چلا آتا ہے۔

وہ۔ لیکن اس رواج سے کیا فائدہ، جب لباس میں بٹن نہ ہوں گے تو ہوا کیسے رُکے گی، ہوا رکنے سے سردی دبتی ہے، ورنہ ضرور جاڑا لگے گا (ادھر اُدھر دیکھ کر) ہم تو جانیں آپ بٹن ضرور لگائیے۔ چاہے رواج ہو یا نہ ہو، کیوں ہے نا ٹھیک؟

ان کے فضول سوالوں سے علاوہ وقت ضائع ہونے کے کام کا ہرج ہو رہا ہے، مگر وہ ہیں کہ راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، جونک کی طرح خون چوس رہے ہیں . . . . "اچھا اور کیوں صاحب اس کی آستینیں اتنی لمبی کیوں ہیں (ایک آستین اٹھا کر) اس قدر لمبی آستینوں کی کیا ضرورت، کہ ہاتھوں میں پہن لیں تو دونوں طرف سونڈیں سی لٹکیں"۔

میں۔ جی بجا ہے۔

وہ ہم تو جانیں تھوڑی سی کٹوائی جائیں تو کیسا ہے، کٹوا ڈالئے آپ۔

میں۔ بدنما ہو جائے گا۔

وہ۔ کیوں؟

میں۔ کیا بتاؤں۔

اب میں سلام کر کے چلنا چاہتا تھا، کہ وہ ایک قدم بڑھا کر سامنے آ گئے اور بولے نہیں صاحب کچھ تو بتائیے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اتنی لمبی لمبی آستینیں کس کام آتی ہوں گی؟

قصہ ختم کرنے کے لئے میں نے جواب دیا:۔ بات یہ ہے کہ کبھی کبھی ان آستینوں میں ٹانگیں ڈال کر اُلٹا اوڑھ لیا کرتا ہوں۔

اس پر انہوں نے اچھل کر قہقہہ لگایا، کہ واہ یار اچھی غپ چھوڑی۔

ایک بار دیال سنگھ کالج کے مشاعرے میں جو میری باری آئی اور جناب علامہ تاجور نجیب آبادی حاضرین سے مجھے روشناس کرانے لگے تو فرماتے کیا ہیں:۔

لیجئے صاحب! یہ میرزا غالب صاحب کی روح آ گئی، ذرا سکون سے آپ کا کلام سماعت فرمائیے گا!

طلبہ کو خدا ایسا موقع دے، میری صورت اور جبہ دیکھ دیکھ کر دُہرے ہونے لگے، کرسیاں پٹک پٹک دیں، اس زور سے تالیاں

بجائیں وہ چیخے کہ ٹھنڈی سڑک تک لوگوں کے کان کھڑے ہوئے ہوں گے۔

مشاعرے کے دوسرے روز مسٹر ساگر چند صاحب گورکھانے باوجود اس احترام کے جو میرے متعلق ان کے دل میں ہے اخبار کیسری میں ایک پھڑکتا ہوا فقرہ لکھ ہی تو مارا:۔

"اس کے بعد میرزا فہیم صاحب حضرت نوح علیہ السلام کے وقت کا چغہ پہن کر اسٹیج پر تشریف لائے اور ایک چیز پڑھ کر کرسی پر جا کر پھر سو گئے (چغہ اور چیز تک تو خیر ہوا لیکن سونا غلط ہے میں اخیر مشاعرے تک بالکل جاگتا رہا تھا)

چغہ نہ ہوا مصیبت ہو گئی جس نے شہر میں میری ناکہ بندی کر رکھی تھی، جس طرف جاتا انگلیاں اٹھتیں کہ بسم اللہ وہ نازل ہوئے آپ کو ادب سے سلام کیجئے (بیوقوف بنانے کے لئے)

پندرہ پندرہ سیر کا موٹا ڈھٹ اونی چیسٹر لادے ہوئے جنٹلمین چغے پر ایسے ایسے مضحکہ انگیز سوالات کرتے تھے کہ میں کھسیانا ہو ہو جاتا تھا۔

مدتوں سے میرا معدہ ٹھیک حالت میں نہیں، جب دیکھو کوئی نہ کوئی عارضہ لگا رہتا ہے، اس لئے ثقیل چیزوں سے سخت گھبراتا ہوں کہ پچتیں نہیں، سننے میں آیا کہ خراسیوں والی گلی میں کھٹیا گیہوؤں کا دلیا ملتا ہے، وہاں سے کچھ دلیا لے آیا اور بجائے الم غلم کے اس سے ناشتہ کرنے لگا، اتنی سی بات تھی، یاروں کے ہاتھ شگوفہ آیا۔ دوست احباب مارے سوالوں کے میرا خون خشک کرنے لگے۔

صبح ہی صبح ایک صاحب تشریف لائے تو دس قدم اُدھر ہی سے سوال کرتے ہیں:۔

کیوں صاحب! یہ کیا پک رہا ہے؟

میں۔ جناب دلیا۔

وہ۔ ہائیں دلیا، دلیا کیسا، کیا چائے چھوڑ دی!

میں۔ چائے بھی پیتا ہوں۔

وہ۔ اور دلیا بھی!

میں۔ دلیا پیا نہیں جاتا۔

وہ۔ (ہنس کر) اچھا صاحب کھایا جاتا ہے یوں سہی... مگر آپ دلیا کھاتے کیوں ہیں!

میں۔ یوں ہی ناشتے کے طور پر۔

وہ ۔ تو کیا دلیا چائے سے زیادہ مفید ہے ۔

میں ۔ جی ہاں زود ہضم بتاتے ہیں ۔

وہ ۔ زود ہضم، اچھا تو کیا میں بھی دلیئے کا ہی ناشتہ کیا کروں !

میں ۔ کیا کیجئے، کون منع کرتا ہے، شوق سے دلیئے کا ناشتہ کیجئے ۔

وہ ۔ مجھے شوق ذوق تو کچھ نہیں، اگر آپ کہیں تو خیر کر لیا کروں ناشتہ دلیئے کا، مگر کیوں صاحب کہیں یہ آنتوں میں گچھ تو نہیں بٹھا دے گا ۔

میں ۔ گچھ کیوں بٹھانے لگا، دلیا ثقیل غذا نہیں ہے ہماری طرف تو کمزور مریضوں کو کھلاتے ہیں ۔

وہ ۔ اجی مگر میں کچھ مریض تھوڑا ہی ہوں، البتہ یہاں کی آب و ہوا موافق نہ ہونے کے سبب ایسی ویسی چیزیں ہضم نہیں ہوتیں پیٹ میں گڑبڑ رہا کرتی ہے ۔

میں جواب دیتے دیتے اُکتا یا جاتا ہوں، مگر وہ برابر قینچی سی زبان چلا رہے ہیں، سوائے دلیئے کے کوئی مضمون نہیں سوجھتا، معلوم ہوتا ہے دنیا جہاں کے دھندوں سے فارغ ہیں آج دلیئے کی پوری پوری تحقیقات کئے بغیر ہٹنے والے نہیں۔ بڑی سخت مشکل اٹھوں تو بد اخلاقی، بیٹھے رہنے میں ہنڈیا بگڑنے کا خوف، ادھر ان کے سوالوں کا تانا نہیں ٹوٹتا، ذرا دم لیں تو کچھ کہا جائے۔

بدقت تمام جب معاف کیجئے گا کہہ کر اٹھا تو کوئلے تیز ہو جانے کے سبب سے ہنڈیا کا تلا لگ چکا تھا، ان سے بھی نہ رہا گیا، انگیٹھی تک میرے ساتھ چلے آئے جس وقت تلا لگنے کا علم ہوا تو مجھ پر برس پڑے ۔ فوراً جرح شروع کر دی :۔

کیوں صاحب یہ کیا ہوا، جب آپ کو آگ پانی کا اندازہ نہیں تو رزق بگاڑنے سے کیا فائدہ، پانی زیادہ رکھنا چاہیئے تھا، ذرا اٹھ کر دیکھ کیوں نہیں لیا، ہم سے کہا ہوتا تو ہم پکا دیتے، آپ روز اسی طرح دلیئے کا ستیاناس کر لیا کرتے ہوں گے ۔

میں نے کہا جناب عالی ان باتوں کی کیا ضرورت، جو کچھ ہونا تھا ہو ہوا گیا، تو تڑپ کر بولے :۔

اجی جناب ضرورت کیوں نہیں، آپ کی اتنی محنت اکارت گئی، ہر کام کو سلیقہ چاہیئے، کیوں صاحب اب کیا یہ بالکل کام ہی کا نہ رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ہم تو جائیں آپ دلیئے کا ناشتہ ہی نہ کیا کیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ بڑا کھڑاگ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ شاعر ہو کر یہی آفت کیوں پال رکھی ہے ۔ اچھا اب میں جاتا ہوں، آپ کو فرصت ہی نہیں جاؤں ۔ ۔ ۔ آداب عرض ہے ۔

ان کے چلے جانے پر اگر کچھ تھوڑا بہت کھرچ کھرچا کر کھا بھی لیا، تو بختا بخشی کے صدمے سے کیا خاک انگ لگتا، کیسا زود ہضم، وہ تو میرے حق میں سم قاتل ہو گیا ۔

میں چلتا ہوں کسی قدر تیز، خلافِ عادت اگر قدم روک کر چلوں تو کچھ اُلجھن سی ہونے لگتی ہے اور جلد تھک جاتا ہوں، ادھر نئی تانتی کا عمل ہوا" آہستہ خرام بلکہ مخرام پر "میران کا کیا ساتھ ہزار کوشش کرتا ہوں کہ زمین پرُ اتو کردوں پھوا چال چلوں، مگر بہکے ہوئے قدم نہیں رُکتے، جوں ہی بھول میں آگے بڑھا کہ لے دے مچی:-

ارے بھئی کیا مصیبت ہے، ذرا ٹھہریئے . . . ہم تو تھک گئے، ایسا تھا تو پہلے کہہ دیا ہوتا، باز آئے بابا اس سرپٹ دوڑ سے۔

روزمرہ یہی ہوا کرتا ہے، کہ میں دُھن باندھے چلا جا رہا ہوں، سامنے سے ایک شخص کہتا ہے، اجی جناب کوئی صاحب آپ کو آواز دیتے چلے آرہے ہیں، پلٹ کر جو دیکھا تو واقعی ایک کرم فرما پسینے میں نہائے ہوئے پنجوں کے بل اُچکتے نظر آئے اور ہانپ کر بولے:-

کیا آپ اونچا سنتے ہیں . . . . کتنی دور سے چیختا چلا آرہا ہوں۔

بعض دوستوں کی آہستہ خرامی پر مجھے بڑا تعجب ہوا کرتا ہے، کہ ہٹے کٹے جوان ہونے کے باوجود میری معمولی سی چال میں گزوں نہیں فرلانگوں پیچھے رہ رہ جاتے ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تونددا بھارے، ٹانگیں چوڑائے خوب زور زور سے ہاتھ ہلاتے تڑاتڑ چلے آرہے ہیں، مگر خدا کے فضل سے ہیں وہاں کے وہیں۔

کونسا دن منحوس جاتا ہوگا، کہ میرے احباب تیز چلنے پر میری گت نہ بنائیں، ہر وقت یہی چیخ پکار رہتی ہے:-

ارے صاحب ذرا ٹھہریئے، کیا ریل نکلی جاتی ہے، اجی صاحب ہم بھی آرہے ہیں، اس قدر مارا مارا چلنے کی کیا ضرورت . . . . ہمارے ساتھ ساتھ رہیئے . . . . الو آپ تو بھاگے جاتے ہیں . . . ہمیں چھوڑ کر۔

کچھ منہ پر ہی نہیں، پیٹھ پیچھے بھی برا فضیحتا ہوتا رہتا ہے، چنانچہ میری غیبت میں کسی روز حکیم میرزا حیدر بیگ صاحب حیدر کے یہاں میری تیز چال کا تذکرہ چھڑا ہوا تھا، اس دوران میں کوئی صاحب پوچھ بیٹھے کہ کیوں صاحب آپ کو بھی نعیم سے تعارف حاصل ہے، تو حکیم صاحب کی سنیئے، فرماتے ہیں:-

جی ہاں میں اُنہیں خوب جانتا ہوں سالہا سال سے، واقعی بہت تیز چلتے ہیں، وہ تو گوالیار سے پیدل آئے تھے۔

جب بال کھچڑی ہونے لگے تو ایک بار میں نے سر، ڈاڑھی اور مونچھوں میں مہندی لگائی، گرمیوں کا موسم تھا، یہ مزا آیا جیسے کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی رَو دماغ سے چل کر دل کو گدگداتی ہوئی رگ و پے میں تیر کر مزے مزے سے پیروں کے انگوٹھوں

تک جا رہی ہے' واللہ رونگٹا رونگٹا سکھ پانے لگا جنت کا لطف آنے لگا' پھر کچھ اس خیال سے کہ ابھی بال تل چانولے ہیں' بیقاعدہ طور پر کہیں کہیں سفید اچھے نہیں معلوم ہوتے مہندی سے ذرا ملتے جلتے سے ہو جائیں گے اور کچھ مزا بھی آتا تھا بس اکثر میں مہندی لگانے لگا۔

اب ملاحظہ فرمائیے کیا مصیبت آتی ہے' پہلے ہی پہل جو مہندی لگا کر گھر سے نکلا' تو گویا سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے' علاوہ ہر سلام دعا کے اس سرے سے اس سرے تک میری جانچ پڑتال ہوئی' کہ دیکھنا یہ وہی ہے یا کوئی اور۔

ایک مہربان دور سے بے طرح گھورتے چلے آتے ہیں' نزدیک پہنچتے پہنچتے دھاڑے :۔

واہ بھئی وا' حد کردی' ارے بھائی خدا کی قسم ہم نے تو پہچانا بھی نہیں' یہ کیا ہوا' کیا مہندی لگائی ہے' کب سے لگنے لگی؟ اب ہمیشہ لگا کرے گی ؟

ان سے نبٹ کر چار قدم چلا تھا کہ آواز آئی :۔

آداب بجا لاتا ہوں۔۔۔ جناب عالی!۔۔۔ میں بڑی دیر سے دکان پر بیٹھا تاڑ رہا تھا' اچھی دھجا بنائی۔۔۔ آج تو معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا۔۔۔ مگر رہی ٹھیک' صورت پر نور برس رہا ہے۔

ابھی کچھ زیادہ دور نہ گیا تھا' یکایک ایک ایڈیٹر صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی اور انہوں نے چھوٹتے حملہ کر دیا :۔

کیوں صاحب! یہ کیا سوجھی۔۔۔ بھئی خوب رنگ آیا۔۔۔ اور کیا آپ بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔

غرض انارکلی کے چوراہے تک پہنچتے پہنچتے آدھی جان رہ گئی' لوگوں نے مجھے خوب خوب بنایا۔

مہندی لگائے اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں' تین چار احباب آدھمکے اور لگے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے :۔

لیجئے صاحب وہ یہ ہے۔۔۔ آئیے ذرا شان ملاحظہ فرمائیے۔۔۔ ہر وقت مہندی ہی لگا کرتی ہے۔

دوسرے۔ کیوں جناب آپ روزانہ مہندی لگاتے ہیں ؟

تیسرے۔ ارے بھئی مہندی نہ لگائیں' تو کیا کریں' انہیں اور کام ہی کیا ہے۔

چوتھے۔ کیوں صاحب کیا واقعی روزانہ ہی آپ مہندی لگاتے ہیں۔

میں۔ جی نہیں۔

پہلے۔ جی نہیں کے کیا معنی ہم تو جب آتے ہیں آپ کا یہی حال ہوتا ہے۔

چوتھے۔ کیا آپ کو کچھ مزا آتا ہے' اس میں۔

میں۔ مزا وزا کاہے کا۔

"ہی ہی ہی مزا نہیں آتا تو یہ حرکت کیوں جاتی ہے؟"

میں ۔ خوب! جناب دنیا میں بے شمار انسان مہندی لگاتے ہیں میں نے لگائی تو کیا ستم ڈھایا کیا یہ کوئی ناشائستہ فعل ہے جو آپ فرماتے ہیں "حرکت"۔

وہ ۔ حرکت سے ہمارا یہ مطلب نہیں تھا، غرض یہ ہے کہ آپ مہندی بہت لگاتے ہیں۔

میں ۔ تو آپ کا کیا ہرج ہے،

وہ ۔ اجی ہرج درج کسی کا کیا ہو سکتا ہے ہم تو آپ کی ہمدردی سے کہہ رہے ہیں کہ فضول وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ، اتنی دیر کوئی کام کی بات کیجئے۔

تیسرے ۔ مہندی سے کچھ بال سیاہ بھی تو نہیں ہوتے، پھر آپ اتنی کھٹ پٹ کیوں کرتے ہیں۔

میں ۔ کسی قدر ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔

چوتھے ۔ ٹھیک آج معلوم ہوا اُن لوگوں کی بیوقوفی ہے جو شربت ٹھنڈائی وغیرہ میں پیسہ برباد کرتے ہیں مہندی ہی لگا لیا کریں طبیعت تر ہو جایا کرے گی۔

تیسرے ۔ اور چاہے پانی میں گھول کر پی ہی نہ لیا کریں۔

پہلے ۔ کیوں صاحب آپ کا یہی منشا ہے!

میں ۔ خدا کے واسطے کوئی اور ذکر کیجئے، اس بک جھک سے کیا فائدہ، مگر میری منتوں پر وہ کب باز آنے والے تھے جب تک بیٹھے اینڈے بینڈے سوالوں سے مجھ پر عرصۂ زیست تنگ رکھا۔

کسی کے بُرے بھلے میں نہیں گھر بیٹھے دنیا چین لینے نہیں دیتی کوئی کہتا ہے اس قدر مہندی نہ لگایا کرو کہیں رُوپی مارکہ خضاب کی تحریک کی جاتی ہے بعض فرماتے ہیں ڈھاٹا برا معلوم ہوتا ہے کتنے ہی مہربان روغن استعمال کرنے پر مصر ہیں سو پچاس نے کھانے کے خضاب پر زور ڈالا اکثر کرمفرما مہندی لگائی ہوئی حالت میں ناراض ہو ہو کر کہا کرتے ہیں، ہم نہیں جانتے ابھی ابھی منہ دھو کر ہمارے ساتھ سیر سپاٹے کو چلو ایک اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین نے سب کے کان کاٹے نہایت دھڑلے سے فرمایا، کچھ نہیں ترقی کا زمانہ ہے ہماری رائے میں ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر ڈالنا اچھا کہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، نہ جانے کتنے دوستوں کے دلوں میں اس مہندی کی وجہ سے کچھ ایسی گانٹھیں بیٹھیں کہ انہوں نے آنا جانا ہی چھوڑ سا دیا۔

گو پرانی وضع کے مطابق مجھے تلوار باندھنے کا شوق تو گوایا ہیں بھی کبھی نہیں رہا، جہاں بنئے بقال تک اوچی بنے پھرتے ہیں، لیکن کبھی نہ کسی قسم کی لکڑی یا چوب دستی ہمیشہ سے ہاتھ میں رکھتا ہوں، اور یہ امر موجودہ تہذیب کے قطعی خلاف ہے کہ ایک شاعر لٹھ باندھ کر مشاعرے میں جائے لہذا جب دیکھو میری لکڑی پر بحث ہوا کرتی ہے، وہ وہ مزیدار سوالات کئے جاتے ہیں کہ کیا کہوں۔

کیوں صاحب! تو یہ ڈنڈا ہے.... آپ کا.... ڈنڈا ہے یہ... کیوں!

میں۔ جی ہاں ہے تو ڈنڈا ہی۔

وہ۔ (قہقہہ لگا کر) وہی تو میں بھی کہتا ہوں.... کہ ڈنڈا ہے... کیوں صاحب میں نے کہا کتنا ہوگا... وزن میں!

میں۔ ہوگا کوئی سیر تین پاؤ کا۔

وہ۔ اچھا (ہاتھوں پر تول کر) بڑا بوجھل ہے... کیوں صاحب اس سے آپ کے ہاتھ نہیں تھکتے!

میں۔ جی نہیں۔

وہ۔ آپ کب سے باندھتے ہیں یہ ڈنڈا؟

میں۔ برسوں ہوگئے۔

وہ۔ (زمین پر ٹھونک کر) لکڑی کا ہے مگر ہے عجیب، کیوں جناب یہ ہاتھ پھر پھر کر چکنا ہوگیا ہوگا شاید... کہ نہیں!

میں۔ جی ہاں۔

وہ۔ اگر یہ کھو جائے تو؟

میں۔ دوسرا لے لوں۔

وہ۔ واہ وا معلوم ہوتا ہے جیسے روغن پھرا ہو (دوبارہ ہاتھ پھیر کر) مگر روغن تو نہیں ہے شاید اس پر... کیوں صاحب؟

میں۔ جی نہیں۔

وہ۔ کیوں صاحب کیا میں بھی ایسا ہی ڈنڈا باندھا کروں کیا؟

میں۔ باندھا کیجئے میرا کیا نقصان ہے۔

وہ۔ آپ کا تو کچھ نقصان نہیں ہے۔ مگر میں ہرگز ایسا نہ کروں گا۔

میں۔ اچھا۔

وہ۔ نہیں صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ یہ تو اس کی عقل ماری گئی ہے، جو ڈنڈا باندھنے لگا... بس آپ کو ہی مبارک رہے، اور کیوں صاحب اگر کسی کے ایک آدھ رسید کر دیا جائے تو کیا ہو!

میں۔ رسید ہی کیوں کیا جائے خواہ مخواہ۔

وہ۔ خواہ مخواہ کیوں، لڑائی بھڑائی میں ایسا موقع آسکتا ہے، پھر بس ہے تو مزا میرے خیال میں آدمی پانی نہ مانگے، ایک ہی میں ڈھیر ہو

جائے ... (زمین پر ٹھونک کر) مگر پڑے بھرپور۔

ڈنڈا ڈنڈا۔ڈنڈا نہ ہوا وبال جان ہوگیا' جہاں جاتا ہوں ڈنڈے پر سوالوں کی بھرمار کردی جاتی ہے' کہاں تک چوطرفی لڑوں اور تو اور بعض حضرات مجھے ڈنڈے والا بابا مشہور کرتے پھرتے ہیں' گویا ڈنڈا میرا جزوِ لاینفک ہوگیا ہے۔

بیڑی سُلگاتے سُلگاتے کسی صاحب نے دروازے سے جھانک کر کہا:-

کیا اندر آسکتا ہوں کیا ... ہے اجازت؟

پھر جواب کا انتظار کئے بغیر یہ کہتے ہوئے تشریف لے آئے:-

اچھا آپ بیڑی اُڑا رہے ہیں! مزاج شریف (یعنی سلام ندارد) کیوں صاحب بیڑی پی جارہی ہے آپ بیڑیاں بہت پیتے ہیں۔

میں۔ جی تسلیمات عرض' پیتا تو ہوں۔

وہ۔ (ہاتھ ہلاتے ہلاتے) کیوں پیتے ہیں' اس میں کیا مزا آتا ہے آپ کو؟

میں۔ کچھ نہیں۔

وہ۔ (کڑک کر) تو پھر پیتے کا ہے کو ہیں۔

میں۔ یوں ہی طلب ہوگئی ہے۔

وہ۔ کیوں ہوگئی ہے۔

میں۔ بدقسمتی میری۔

وہ۔ نہیں بدقسمتی ودقسمتی ہم نہیں جانتے' آپ بیڑی نہ پیا کریں! بہت نقصان کرتی ہے' خاص کر پھیپھڑوں کو۔

میں۔ جی ہاں کرتی تو ہے۔

وہ۔ چلو شکر ہے ... مان تو گئے ... مگر فضول ... ہم تو جب جانیں کہ آپ چھوڑ دیں۔

میں۔ مجبور ہوں۔ نہیں چھوٹتی۔

وہ۔ واہ چھوٹتی کیسے نہیں' آپ خود نہیں چھوڑنا چاہتے' ورنہ جناب انسان دل پر رکھے تو سب کچھ ہوسکتا ہے' لوگ تو شراب اور افیون تک چھوڑ دیتے ہیں

میں۔ بیشک چھوڑ تو دیتے ہیں۔

وہ۔ تو بس آپ بھی فوراً بیڑی چھوڑ دیجئے' اور پختہ عہد کیجئے ہمارے سامنے کہ آج سے بیڑی کو ہرگز ہرگز منہ نہ لگائیں گے۔

میں۔ اُفوہ اس قدر جلد۔

وہ۔ جلد نہیں تو اور کیا۔

میں۔ اچھا دیکھا جائے گا۔

وہ۔ دیکھا دیکھا ہم نہیں جانتے' اسی وقت سے لعنت بھیج دینی چاہیئے

میں ۔ بیڑی کچھ ایسی زیادہ مضر تو نہیں' یوں ہی ایک شغل ہے ۔

وہ ۔ تو مضر ہی نہیں اجی جناب آپ جانتے نہیں ہم سے پوچھئے' تمباکو میں نکوٹین ہوتا ہے مہلک زہر جس کے ایک قطرہ سے سانپ مرجائے' بیڑی پینے ہی سے میرے فادر کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا ۔

توجناب جیسا کہ پیشتر عرض کرچکا ہوں' اس سوال جواب کی تکا فضیحتی کے بارے میں کسی سے خلا ملا نہیں رکھنا چاہتا لیکن آخر انسان ہوں کیا کروں دو چار دوست ہیں ہی ایسے جن میں مل بیٹھ کر وقت کاٹ لیا کرتا ہوں ۔

ان ہی ان گنے گنے احباب میں میرے ایک کرم فرما ہیں پروفیسر واقف صاحب' ان کی مہربانیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ تنہا تو ہوں ہی ہفتوں اپنے گھر کی خبر نہیں لیتا' اکثر اُن ہی کے گھر سوتا ہوں کسی سے زیادہ مینگیں بڑھائی نہیں ہیں' نہ نشست و برخاست کے دس میں ٹھکانے کہ وہاں آؤں جاؤں' دن بھر ادھر اُدھر کے جھگڑے نہیں چھوڑتے' شام کو ہم چند احباب ممتاز محل ہوٹل جا بیٹھا کرتے ہیں۔ وہیں رات کے گیارہ بارہ بجے تک مجلس گرم رہتی ہے ۔

ابھی کوئی دس پندرہ دن کا ذکر ہے' ایک روز واقف صاحب کی طبیعت کسی قدر تھی ناساز' اس واسطے وہ تو قبل از وقت اٹھ کر چلے آئے میں وہاں بیٹھا رہ گیا' باتوں باتوں میں رات کے بارہ بج گئے جب میں واپس آیا تو وہ چھت پر جاکر سو چکے تھے' اس واسطے کہ کہیں جاگ نہ پڑیں میں دبے پاؤں چھت پر پہنچا' اور گرمی کے سبب سے کرتہ اتار کر جنگلے پر ڈال رہا تھا' اتنے میں اٹھی جو کھانسی تو ان کی نیند اُچٹ گئی' مگر کیونکہ نیند کا غلبہ تھا' یہ کہہ کر کہ" تشریف لے آئے کیا؟ انہوں نے آنکھیں بند کرلیں ۔

دو ایک منٹ بعد مجھے خیال آیا کہ اس وقت تو پسینے پسینے ہو رہا ہوں مگر شاید رات کو سردی لگے اور ٹھنڈی ہوا نقصان پہنچائے لہٰذا جنگلے سے اتار کرتہ پہن لیا' اب بیڑی بجھ چکی تھی' جوں ہی میں نے دیا سلائی رگڑی اس کی چمک سے دوبارہ ان کی آنکھ کھل گئی' آپ نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز سے فرماتے کیا ہیں :-

"یہ کرتہ کیوں اُترا اور کیوں پہنا گیا"۔

پھر کیا تھا مجھ پر ہنسی کا ایک سخت دورہ پڑا' لوٹیاں کاٹ کاٹ لیں' مگر ہنسی تھی کہ روکے نہ رکی' اس کھل کھل سے واقف صاحب بھی مکمل بیدار ہو گئے' اور :-

"کیوں صاحب! کیا ہے کیا ہوا' یا اللہ خیریت وغیرہ وغیرہ کہہ کہہ کر خود بھی میری بیوقوفی پر ہنسنے لگے ۔ وہ بار بار ہنسی کا سبب پوچھتے تھے اور مجھے رہ رہ کر ہنسی چلی آتی تھی' بہتیری کوشش کی مگر بجائے کمی کے ان کے سوالوں سے میری ہنسی میں زیادتی ہو گئی کتنی ہی دفعہ جواب دینا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا' جب اس دورے میں کسی قدر تخفیف ہوئی تو میں نے دم لے کر کہا :-

کیا بتاؤں ۔ ۔ ۔ آپ کی بڑی ۔ ۔ ۔ مہربانی ۔ ۔ ۔ ہوئی' آپ کے ایک فقرے ۔ ۔ سے ہزاروں مناظر میری ۔ ۔ ۔ آنکھوں میں پھر گئے' اب مجھے ایک چٹپٹا مضمون لکھنا پڑا ۔

یہ سنکر انہوں نے تعجب سے دریافت کیا :-

کیا مضمون ؟

تو مجھے پھر ہنسی آگئی، وہ کیوں؟ اسی خیال سے کہ خدا خیر کرے، لیجئے سوال جواب شروع ہوگئے مگر وہ کب خاموش رہنے والے تھے فوراً سوال کیا:-

کیوں ہنسی آرہی ہے کیا مضمون سوجھا!

میں نے کہا کچھ نہ پوچھئے طبیعت کسلمند، غنودگی کا غلبہ، بدن ہٹی ہو رہا ہے، منہ سے بات نہیں نکلتی، زبردستی نیند سے لڑ لڑ کر دیدے پھاڑے جا رہے ہیں مگر اس تحقیقات کی اشد ضرورت ہے کہ "کرتہ کیوں اُترا اور کیوں پہنا گیا" گویا یہ مسئلہ اس درجہ اہم ہے کہ آدھی رات کو فیصلہ ہو جانا چاہیئے، ورنہ نظامِ عالم درہم و برہم ہو جانے کا احتمال ہے، شاید مرغے کی اذان سے پہلے صور پھنک جائے،

اب خیال فرمایئے کہ جب ایسے ایسے صاحبانِ علم و فضل سوال جواب کے بہانے دن رات میرا دماغ چاٹنے میں منہمک ہیں تو بیچارے عوام کس شمار و قطار میں۔

سچ کہوں اب مجھے تو یقین ہوگیا ہے کہ اس سوال جواب کی بلا سے زندگی بھر جان نہ چھوٹے گی۔

خیر بہت سی کٹ گئی ہے تھوڑی سی رہ گئی، ستالیں، جیتے جی نہ سہی مرنے کے بعد تو نجات ملے گی ہی۔

لیکن نہیں صاحب! رسولؐ اللہ کا فرمان ہے کہ پہلی منزل میں اُترتے ہی دو فرشتے منکر نکیر نازل ہو کر سوال کریں گے:-

کس کا بندہ ہے کس کا اُمتی ہے، اور کیا ہے دین تیرا؟

پھر ٹھیک ٹھیک جواب ملنے پر جنت کی کھڑکی کھل جائے گی ورنہ انسان جہنم واصل کر دیا جائے گا۔

اچھا! چلو یہ بھی غنیمت ہے، یوں ہی اس دن ٹونک فیصلہ کے بعد تو ہمیشہ کے لئے سوال جواب سے فرصت ہے۔

مگر نہیں میں بھولتا ہوں، تو یہ فرصت کیسی، قرآن پاک کہتا ہے کہ اُس قیامت میں جبکہ ہر طرف نفسی نفسی کا حشر برپا ہوگا خاص الخاص اللہ میاں تختِ عدالت پر جلوہ افروز ہو کر یہی کام شروع کر دیں گے، میزانِ عدالت کھڑی کر دی جائیگی، ہاتھ میں اعمال نامہ ہوگا کہ "کراماً کاتبین کا لکھا ہوا" بہی کھاتے کھول دیئے جائینگے، اور دوست دشمن کی موجودگی میں بھوکے پیاسے انسان سے ایک ایک قطرہ کا حساب لیا جائیگا سختی سے سوالات ہونگے اتنا پانی کیوں لنڈھایا زیادہ کھانا کیوں کھاتا تھا بہت سی بحوہن کیوں کی اندھا دھند چل کر اتنی چیونٹیاں کیوں مار ڈالیں خواہ مخواہ جاگ جاگ کر بیمار کیوں پڑا، کئی کئی گھنٹے جھوٹے سچے لیکچر دینے کی کیا ضرورت تھی، تانگے والے سے کیوں لڑ مرا، طوطا کیوں پالا، گدھے کو کیوں مارا کرتا تھا، اپنے گھر کے چوہے پکڑ پکڑ کر پڑوسیوں کے گھروں میں کیوں چھوڑے، پرائے کھیتوں سے مکا کے بھٹے چرا چرا کر کیوں کھائے، جنگلی کبوتروں کے انڈے کیوں اٹھائے، روتا بچہ چھوڑ کر یار دوستوں کے ساتھ سینما کیوں چلا گیا، رات کے وقت گا گا کر محلے والوں کی نیند کیوں حرام کی، دانیال پر سے جوتوں سمیت کیوں نکلا چلا گیا، گھر کی بھنگن کو برا بھلا کیوں کہا، محلے کے ملا جی کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ سوال جواب کے عذاب سے حشر تک چھٹکارا نہیں ؏

فہیم بیگ چغتائی

احسن الکلام

مخلوق کی نمائشِ حسن و ادا کے بعد
کلمہ بتوں کا پڑھنے لگے سب خدا کے بعد

آسان اُن کی چاہ تھی، دشوار ہے نباہ
ہے انتہا کی فکر مجھے ابتدا کے بعد

چاہا تھا آپ ہی کو حصولِ طلب سے قبل
چاہیں گے آپ ہی کو قبولِ دُعا کے بعد

دونوں نے حُسن و عشق کی توقیر کی، مگر
تم نے جفا سے قبل تو ہم نے وفا کے بعد

خیر اپنی جان کی نظر آتی نہیں ہمیں
وہ بھی پھنسی بلا میں دلِ مبتلا کے بعد

اس شوق میں کہ مجھ کو بلائیں وہ بار بار
کرتا ہوں اک قصور نیا ہر سزا کے بعد

محرابِ کعبہ، گوشۂ مسجد، درِ حرم
ہیں سب یہ سجدہ گاہ ترے نقشِ پا کے بعد

احسن یہی جہاں کی ہے رفتارِ گرم و سرد
چلتی ہیں آندھیاں بھی نسیم و صبا کے بعد

احسن مارہروی

گونڈ

گونڈوں کی ابتدائی تاریخ افسانوں کے پردے میں گم ہے' یہ دراوڑی نسل سے ہیں اور صوبجات متوسط کے سب سے قدیم باشندے تصور کیے جاتے ہیں. منڈلہ جبل پور سیونی اور بالا گھاٹ اضلاع میں جا بجا ایسے کھنڈر اور عمارات کہنہ نظر آتی ہیں' جو یاد دلاتی ہیں کہ کبھی اس صحرا نشین اور بادیہ پیما قوم کا ستارہ اوج پر تھا اور اس سرزمین پر ان لوگوں نے بھی کسی وقت حکمرانی کی تھی جبل پور سے دو میل کے فاصلے پر صرف ایک پتھر پر ایک بلند عمارت تعمیر کی گئی تھی' جو آج تک مدن محل کے نام سے موسوم ہے اور سیاحوں کی دلچسپی کا موجب ہے' گونڈ راجاؤں کے قلعے محلات شکار گاہیں اب تک موجود ہیں اور ارباب بصیرت کو دعوت دے رہی ہیں کہ ہمیں دیکھو' ہم ایک پامال قوم کے ایام عروج کی یادگار ہیں۔

آج گونڈ من حیث المجموع زراعت پیشہ ہیں لیکن ان کی زرخیز اراضی دوسری قوموں نے اپنی چالبازیوں سے حاصل کر لی ہیں اور حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں چنانچہ صوبجات متوسط کی حکومت نے اب یہ قانون منظور کیا ہے کہ گونڈی جائداد بغیر حکومت کی منظوری کے بیع و رہن نہیں ہو سکتی۔

گونڈ کی غذا بہت سادہ ہوتی ہے۔ کودوں کا دلیہ اور چاول کا پیچ. جڑیں اور پتیاں نہیں سربفلک عمارتیں درکار نہیں دور جنگل میں دو دو چار چار خس پوش جھونپڑیاں ہوتی ہیں' انہی میں اپنے بال بچوں کے ساتھ یہ لوگ بےفکری اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں گیہوں اور دوسری پیداوار مہاجنوں کے ہاں چلی جاتی ہے' ان کا لباس بہت سادہ ہوتا ہے۔ ایک فتوحی' ایک اونچی دھوتی اور ایک صافہ مردوں کے لئے چاہیے اور عورتیں سفید یا رنگین موٹی ساڑھی باندھتی ہیں' عورتوں کو کانسے اور پیتل کے زیور کا بڑا شوق ہوتا ہے اور ٹیسو کے پھول اور دوسرے صحرائی پھول اپنی چوٹی کے جوڑے میں گوندھتی ہیں۔

سردی کے دنوں میں جب کڑاکے کا جاڑا پڑتا ہے تو اپنے جھونپڑے کے سامنے خوب آگ جلاتے ہیں' کودوں کا پیال چاروں طرف پھیلا دیتے ہیں اور سب بال بچے آگ کے اردگرد ننگے بدن سو جاتے ہیں' جب ایک کروٹ آگ میں سینک لیتے ہیں تو پھر دوسری کروٹ بدل لیتے ہیں۔ اس طرح رات کٹ جاتی ہے۔

انہیں سول سرجن یا کسی معالج خصوصی کی حاجت نہیں ہوتی' ہر ایک گاؤں میں ایک خس پوش جھونپڑا ہوتا ہے جسے کڑھیا کہتے ہیں۔ اس میں ان کے دیوی دیوتاؤں کے بت رکھے رہتے ہیں۔ ترسول رکھے رہتے ہیں اور ایک سفید پھریرا جھونپڑی کے سامنے ہوا میں لہراتا ہے۔ اس مڑھیا کا جو مجاور ہوتا ہے' اسے ان کی زبان میں پنڈا کہتے ہیں' جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو پنڈا اس کے لئے اپنے دیوتاؤں سے استصواب کر کے دوا بتا دیتا ہے یا دعا کر دیتا ہے اگر دیرینہ مرض ہو تو مہینوں پنڈے کی خدمت میں حاضری دینی پڑتی ہے' اگر پنڈے کے دیوتا بگڑ گئیں تو بعض کو

بکرا قربان کرنا پڑتا ہے۔ پنڈا مذہبی پیشوا سمجھا جاتا ہے۔

منڈلہ سے دس میل کے فاصلے پر رام نگر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے وہاں ایک پنڈا رہتا ہے جسے گونڈ لکھمی مائی کا پنڈا کہتے ہیں۔ وہ پیری مریدی کرتا ہے۔ اس کے ہاں میں ہزار مرید ہیں! جو شخص اس کا مرید ہو جاتا ہے اسے پنڈے کے حکم سے تانبے کی زنجیر اپنی گلے میں پہننی پڑتی ہے۔ ایک مرتبہ ۱۹۲۸ء میں اس پنڈے نے ایک ہزار روپے کی لاگت سے سو فٹ کی لوہے کی ایک سیڑھی بنوائی تھی اور اپنے گھر کے سامنے اسے نصب کیا تھا جتنے معتقدین آتے اس سیڑھی پر ضرور چڑھتے اور اُسے سورگ نسینی (بہشت کا زینہ) کہتے تھے! رام نگر کے متذکرہ پنڈے کی سو عورتیں ہیں۔ مرید از راہِ ارادت اپنی خوبصورت کنواری لڑکیوں کو پنڈے کی نذر کر دیتے ہیں اور پھر وہ لڑکیاں پنڈے کی بیوی ہونے کا فخر حاصل کر لیتی ہیں۔

گونڈوں میں سب سے دلچسپ شادی کی رسم ہے۔ اگر کسی کنواری لڑکی پر کوئی شخص خواہ وہ کسی قوم سے ہو ہلدی چھڑک دے تو گویا نکاح ہو گیا۔ اب وہ لڑکی کسی دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی بلکہ اسی شخص کے ساتھ اسے زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ البتہ اگر لڑکی یا اس کے ورثا کو اس حرکت پر اعتراض ہوا تو فوراً لڑکی کی ذات خراب کرنے کے جرم میں فوجداری نالش کر دی جاتی ہے۔ عدالتوں میں اس قسم کے دلچسپ مقدمات پیش ہوتے رہتے ہیں۔ مگر زیادہ تر یہ لوگ خود ہی انتقام لے لیتے ہیں۔ جو شادیاں فریقین کے الدین کی رضامندی سے ہوتی ہیں۔ ان کی رسوم بہت سادہ مگر دلچسپ ہوتی ہیں بیٹے والے بیٹی والوں کے ہاں علم نما کو پینے جاتے ہیں اور باتوں باتوں میں پوچھ لیتے ہیں کہ کتنا غلہ خرچ ہوگا؟ پھر اس حساب سے کودوں گڑ اور گھی کی رسد بیٹی والے کے ہاں پیشگی بھیج دیتے ہیں تاکہ بیٹی والا ان کے اور اپنے مہمانوں کی اس گڑ گھی اور کودوں سے مدارات کر سکے پھر برات پہنچتی ہے پنڈا رسم عقد انجام دیتا ہے جھاڑوں کی چھاؤں میں ساگوں کے پتوں پر تمام براتیوں اور مہمانوں کو کھانا کھلا دیا جاتا ہے اور دلہن کے ساس سسر اسے اپنی پیٹھ پر لاد کر پوری برات کے ساتھ اپنے گھر روانہ ہو جاتے ہیں نہ وہاں پان سپاری سے تواضع کی جاتی ہے نہ بہترین اہتمام اور میزبانی کے باوجود نام رکھائی ہوتی ہے۔

ان کے ہاں طلاق بڑی دلچسپ ہوتی ہے عورت رات کے سناٹے میں فرار ہو جاتی ہے جب تک وہ کسی دوسرے سے تعلق نہ رکھے مرد خاموش رہتا ہے اور جونہی وہ کسی اور کے رشتۂ زوجیت میں منسلک ہوئی اس کا پرانا شوہر اس کی لاگت کا دعویدار ہو گیا۔ جسے اِن کی زبان میں گُلگت کہتے ہیں۔ جدید شوہر کو قدیم شوہر کی شادی کے مصارف قانوناً اور اخلاقاً دینے پڑتے ہیں۔

چند باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قوم بالکل یورپین معلوم ہوتی ہے۔ بازار میں شہر میں جنگل میں جہاں کہیں اعزہ و اقارب ایک دوسرے سے ملے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ایک دوسرے کے گال چومتے ہیں عورتیں برہنہ سر رہتی ہیں۔ ان کا ناچ بالکل یورپین فیشن کا ہوتا ہے ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں بالالتزام بشرطیکہ کوئی حادثہ نہ رونما ہوا ہو عورتیں اور مرد مل کر ایک حلقہ باندھ لیتے ہیں اور لکڑی بجا بجا کر گاتے اور ناچتے ہیں ان کے ہاں سب سے مقبول گانا دَدریا ہوتا ہے۔ دَدریا تقریباً ہر بچہ، بوڑھا جوان عورت مرد گاتا ہے قدرتی آبشاروں پر بیٹھ کر

نہاتے جاتے ہیں اور گاتے جاتے ہیں ہل اور بیل چلاتے وقت گاتے ہیں فصل کاٹتے وقت گاتے ہیں غرضکہ گانا ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ دَدَریا عشقیہ گانے ہوتے ہیں گانے کے علاوہ ہر ایک نوجوان مرد اور عورت دَدریا کہنا بھی جانتا ہے، یہ گویا نیچرل شاعر ہوتے ہیں!

جس وقت یہ ددریا گاتے ہیں ناممکن ہے کہ ان کی قدرتی پرسوز لے ہر رستہ چلنے والے کو ٹھہر کر سننے پر مجبور نہ کردے۔

ان کی زبان بڑی میٹھی ہوتی ہے۔ گونڈی صرف بولی جاتی ہے لکھی نہیں جاتی نہ حکومت نے اس طرف توجہ کی ہے البتہ مسیحی مشنریوں نے چند کتابیں گونڈی زبان میں لکھی ہیں۔ اور وہ بھی اپنے دینی پروپیگنڈا سے متعلق کیونکہ یہ سادہ لوح قوم بہت جلد اثر قبول کر لیتی ہے۔

ان کی زبان کے چند جملے ذیل میں درج ہیں:-

نیا بنی پرول آنند	تمہارا کیا نام ہے؟	سینئن	لو
بدناتے مندا تنی ایما	تم کونسے گاؤں میں رہتے ہو؟	ہلے	نہیں
ہکے ورا	یہاں آؤ	انگو	ہاں
تراہ	لاؤ	جیم	مارو
ہرسی	دیکھو		

یہ گوشت کے بڑے شوقین ہوتے ہیں کسی نے نہیں سوراج کا مفہوم ہی یہ سمجھا دیا تھا کہ گوشت ترک کر دیا جائے چنانچہ ہر ایک گونڈ نے مرغیاں پالنی بند کر دیں اور گوشت چھوڑ دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ اثر زائل ہو رہا ہے۔

سوراج کا انہوں نے یہ مفہوم سمجھ لیا تھا کہ سرکاری جنگلوں سے لکڑی کاٹ لو سرکاری جنگلوں میں بغیر لائسنس مویشی چراؤ، گورنمنٹ کو مالیہ ادا نہ دو، چنانچہ ۲۹ء میں بڑی شورش بپا ہو گئی تھی مگر بعد میں انہیں سمجھ آ گئی۔ اور اب وہ بات باقی نہیں رہی۔

گونڈ بڑے پیدل چلنے والے ہوتے ہیں۔ ہفتے کے دن بیس بیس میل دور جو بازار لگتے ہیں وہاں اپنی ضروریات خریدنے اپنا مال فروخت کرنے پیادہ پا عورتیں اور مرد جاتے ہیں، گھر سے روانہ ہوتے وقت ڈھاک کے ہرے پتے بطور قلغی کے اپنے صافے میں اور عورتیں کان میں کھونس لیتی ہیں جب پتے مرجھا جائیں تو ان کا ایک کوس ختم ہوا!

گونڈ دیوی دیوتاؤں کے معتقد ہوں لیکن وہ خدا کی ہستی کے قائل بھی ہیں اور اسے بڑا دیو کہتے ہیں ؛

حسن عزیز جاوید

صبُوحی

گجر دم جب مرے بالیں پہ شاما چھپاتی ہے — یکایک میرے کانوں میں تری آواز آتی ہے

صدا کے دائرے آفاق تک جب پھیل جاتے ہیں — مرے دل تک بھی اک موجِ جنوں انگیز آتی ہے

ہوائے سرد کے جھونکے ترا پیغام لاتے ہیں — نسیمِ صبح تیرے خواب کا قصہ سناتی ہے

ستارے کیا کنول کیا گلستاں کیا اور بہاریں کیا — دو عالم مسکرا پڑتے ہیں جب تو مسکراتی ہے

حریمِ حُسن میں ہوتی ہے آب و رنگ کی پوجا — جبینِ عشق پر پہلی تڑپ سجدے کو آتی ہے

در و دیوار و خشت و سنگ ہو جاتے ہیں آئینہ — اٹھاتا ہوں نگاہیں جس طرف تو مسکراتی ہے

مسلسل نغمۂ اُلفت نگاہوں سے سنائے جا — تری آواز میں میری محبّت گنگناتی ہے

کہاں گنجائشِ ہجر و فراق اس کی محبت میں — خدا بن کر مری ہستی پہ ظالم چھائے جاتی ہے

گناہِ عشق کا معراجِ ایماں دوسرا رخ ہے — مرے باطل میں بھی گہری حقیقت پائی جاتی ہے

نگاہوں سے نگاہیں جب ملی تھیں ایک دن ساغر
مجھے رہ رہ کے وہ پرکیف ساعت یاد آتی ہے

ساغر نظامی

اصلاحِ ادب

(۷)

بہ سلسلہ اشاعت جولائی ۱۹۳۳ء

نثر

فقرہ۔ محمد الرّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید المرسلین ہیں۔

اصلاح۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید المرسلین ہیں۔

وجہ۔ اس مقام پر "الرّسول" لکھنا عربی قواعد کے رُو سے غلط ہے۔

فقرہ۔ یورپ کی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی تھی۔

اصلاح۔ یورپ کی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی۔

وجہ۔ سنہ کے بعد "کو" کے بجائے "میں" لکھنا چاہیئے لیکن اگر اس سے پہلے تاریخ درج کرنی ہو۔ تو "کو" صحیح اور "میں" غلط ہے

فقرہ۔ یہ بُڑھیا عورت کیا چاہتی ہے؟

اصلاح۔ یہ بُڑھیا (یا بوڑھی عورت) کیا چاہتی ہے؟

وجہ۔ "بُڑھیا" کے بعد "عورت" لکھنے کی ضرورت نہیں۔

فقرہ۔ آسمان پر کئی تارے نکلے ہوئے ہیں۔

اصلاح۔ آسمان پر بہت سے تارے نکلے ہوئے ہیں۔

وجہ۔ "کئی" "چند" کا مترادف ہے جو دس سے کم تعداد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

فقرہ۔ علامہ شبلی صاحب مرحوم ایک جامع الکمالات بزرگ تھے۔

اصلاح۔ علّامہ شبلی مرحوم ایک جامع الکمالات بزرگ تھے۔

وجہ۔ "مرحوم" سے پہلے "صاحب" نہیں لکھنا چاہیئے۔

فقرہ۔ شیشم کی لکڑی خوب جلتی ہے۔ نیز اس سے میز کرسی وغیرہ بھی بناتے ہیں۔

اصلاح۔ شیشم کی لکڑی خوب جلتی ہے۔ نیز اس سے میز کرسی وغیرہ بناتے ہیں۔

وجہ۔ "نیز" کے بعد "بھی" لکھنا غلط ہے۔

نظم

شعر۔ انجم بیدار تھوڑی دیر تک سو جائینگے ∴ گُل چراغانِ سحر کی طرح سب ہو جائینگے

اصلاح۔ انجم بیدار تھوڑی دیر تک سو جائینگے ∴ در مانندِ چراغِ صبح گُل ہو جائیں گے

وجہ۔ (۱) چراغِ سحر۔ چراغِ سحری۔ شمعِ سحری اور چراغِ صبح محاورہ ہے۔ "چراغانِ سحر" فصیح نہیں۔

(۲) دوسرے مصرع میں تعقیدِ ناجائز ہے یعنی "گُل" اور "ہو جائیں گے" میں زیادہ بُعد ہوگیا ہے۔ نیز "طرح" سے "میں" "سب" حشو ہے۔

شعر۔ جیتے جی کوئی ہمارا پوچھنے والا نہ تھا ∴ بعدِ مُردن سب کہیں گے۔ ہاں کوئی دیوانہ تھا

اصلاح۔ جیتے جی کوئی ہمارا پوچھنے والا نہیں ∴ مر گئے پر سب کہیں گے ہاں کوئی دیوانہ تھا

وجہ۔ (۱) پہلے مصرع میں "نہ تھا" صرف شعر کو مطلع بنانے کے لئے کہا گیا ہے۔ ورنہ معنی کے اعتبار سے "نہیں" درست ہے۔

(۲) "بعدِ مُردن" جیسی فارسی مصدر کی تراکیب بالاتفاق متروک ہیں۔

شعر۔ سر پر دوپٹہ نورانی ∴ اوڑھ کے نکلی صبح کی رانی

غلطی۔ "دوپٹہ" میں "واؤ" کا اظہار غلط ہے۔

شعر۔ موجِ حُسن جا رہی ہے ان کے جسمِ رنگیں سے ∴ نورِ بادہ ظاہر ہے ساغرِ بلوریں سے

غلطی۔ "رنگیں" اور "بلوریں" میں ایطائے جلی ہے۔

شعر۔ وہ طفلی میں بھی اکثر محویت میں ڈوب جاتی تھی ∴ تصوّر میں سما جاتا تھا اس کے عکسِ یوسف کا

خامی۔ (۱) "محویت" کو بلا تشدید یا استعمال نہیں کرنا چاہیئے (۲) "محویت میں ڈوبنا" لغو ہے

(۳) دوسرے مصرع میں تعقیدِ ناجائز ہے یعنی "تصور" اور "اس کے" میں تقدیم و تاخیر کے نقص کے علاوہ بُعد بھی زیادہ ہے

نشتر جالندھری

؟

نالۂ جانِ ناتواں، عرشِ بریں پہ جائے کیوں
میرے لئے زمین پر، صاحبِ عرش آئے کیوں

نورِ زمین و آسماں، دیدہ و دل میں آئے کیوں
میرے سیاہ خانے میں کوئی دیا جلائے کیوں

دیکھے تجھے جو اک نظر ہوش میں پھر وہ آئے کیوں
جس کو ترے قدم ملیں سجدے سے سر اٹھائے کیوں

بخشنے والا جب مرا عفو پہ ہے تُلا ہُوا،
مجھ سا گناہ گار پھر جُرم سے باز آئے کیوں

زخم کو گھاؤ کیوں بناؤ۔ درد کو اور کیوں بڑھاؤ
نسبتِ ھُو کو توڑ کر کیجئے ہائے ہائے کیوں

جس نے چڑھائیں تیوریاں نام سے میرے عمر بھر
اب وہ مرے مزار پر پھول چڑھانے آئے کیوں

امجدِ خستہ حال کی پوری ہو کیوں کر آرزو،
دل ہی نہیں جب اُس کے پاس مطلبِ دل بر آئے کیوں

سید احمد حسین امجد

پہاڑ کی سیل

کارخانے کے ایک کاریگر کی زبانی

ذیل کی عبارت پڑھتے وقت زیر و زبر اور الفاظ کی عجیب غریب تبدیلیوں کو ضرور ملحوظِ خاطر رکھیے

ایک دن ہیں اور منتیاز بیٹھے وے گپیں لڑا رہے تھے کہ اِتنے میں بابو مشتیاخ میرے کنے چان چک آن نکلے اور بولے خلیفہ کدھی تم نے پہاڑ بھی دیکھا ہے میں نے کیا دیکھا کیوں نہیں لیکن میں تو دِس سے کبھی آگو گیا ہوں وہ بولے تم نے کونسا پہاڑ دیکھا ہے۔ میں نے کیا وہ ہی نہیں کالا پہاڑ قرول باغ کے پیچھو۔ بابو جی میرے جواب پہ بڑے بھنانے اور بولے خلیفہ تعریف کرنی تو ہے خوشامد مگر سچی پوچھو تو تم ہو بڑے جانگلو میں نے تو یہ دریافت کیا تھا کہ تم کدھی کوہِ شملہ کے پہاڑ پر یا منصوری یا نینی تال گئے ہو اور تم اپنے کالے پہاڑ کو لے کر بیٹھ گئے میں نے کیا مگر بابو جی تمہارا مطلب کیا ہے وہ بولے بات دراصل میں ہے یہ کہ میں کل شملہ جا رہا ہوں۔ اگر تم کو واں کی سیل کرنی ہے تو تم بھی باشوخ میرے ساتھ چلو منتیاز بولا ہاں چلیں گے ذرا دل لگی ہی رہیگی۔ وہ بولے مگر واں جا کر جلالی پنا نہ مچانا ورنہ یہ سمجھ لو کہ وہ کوہِ شملہ کا پہاڑ ہے واں لاٹ صاحب اور بڑے بڑے آدمی رہتے ہیں ذرا سی دیر میں پلس والے پکڑ کر بند کر دینگے خیر دوسرے دن ہم تینوں کے تینوں روانہ باشد ہو گئے۔ کالکا تو ڈی تو خیریت رہی مگر جد کالکا سے ریل میں بیٹھے تو بری حالیت ایک طرف تو بابو جی اپنا سر پکڑے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف منتیاز کھڑکی سے منہ باہر نکالے اُدادُ کرتا جاتا تھا اور چپکے چپکے بابو جی کو گالیاں دے رہا تھا کہ کاں لے آئے میں نے بابو جی سے کیا کہ موٹر کاٹ میں ہی چلے چلتے وہ بولے دِس میں بھی یہی حالت ہوتی منتیاز بولا سرکار نے سیدھی سڑک کیوں نہیں نکال دی وہ بولے پہاڑ کے رستے اِسی طریوں کے ہوتے ہیں خیر جد شملہ پہنچے تو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کوہی کہیں سے پٹا کٹا آتا ہے ؛

خیر اب سٹیشن سے جو چلے تو چڑھتے چڑھتے آندھا آ گئی۔ کاٹ روڈ تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگے۔ خدا خدا کر کے سیدھی سڑک آئی اور ہم سب بابو جی کے ایک دوست کیاں جا کر ٹھیرے دِن بچاروں نے بڑی آؤ بھگت کی مگر جتنگہ دِن کے مکان میں کچھ زیادہ نہیں تھی اس لئے ہم تینوں ایک ہی چرپائی پر راز ہو گئے۔ ابھی پوری طریوں میری آنکھ بھی نہیں لگی تھی کہ اِتنے میں غل شور کی آواز نے مجھے جگا دیا کیا دیکھتا ہوں کہ منتیاز اور بابو مشتیاخ میں لپکا ڈپکی ہو رہی ہے بابو جی کے یار بھی یہ ہڑ بونگ دیکھ کر آگئے تھے اور بیچ بچاؤ کرا رہے تھے میں بھی ذلدی سے اٹھا اور دونوں کو الگ کیا منتیاز بولا خلیفہ بس تم نہ بولنا بگاں کی مخر بازی ہے کہ سوتے آدمی کے انگل بیت کی جاتی ہے میں تو سو رہا تھا کہ بابو جی نے میرے اِتے زور سے چٹکی لی کہ میرے نیل پڑ گیا میں نے بھی دِن کے ایک ہاتھ رسید کر دیا بابو جی بولے یہ جھونٹ بولتا ہے بلکن اس نے میرے بے ناحق میں تھپڑ مارا ہے جب بابو جی کے یار تھے وہ سوچ کے ایک دم بولے دہو میں سمجھ گیا کسی کا بھی یہ قصور نہیں اصل میں منتیاز کو کھٹمل نے کاٹا ہے اور دِن نے یہ سمجھ کے کہ بابو جی نے چٹکی لی ہے دِن کے ایک ہاتھ جڑ دیا۔ خیر اب جو

چرپائی پہ غور سے دیکھا تو تکیہ کے نیچو اور چدّر کے اِدھر اُدھر آٹھ دس موٹے موٹے کھٹمل چل رہے تھے ہم نے زلدی سے وِن کو ماما اور منتیاز اور بابوجی کا ملاپ کرا دیا۔

دوسرے دن شام کو منتیاز بولا بابوجی اب طبیعت کچھ ٹھکانے سر ہوئی ہے چلو یاں سیل کرنے کو کونسی جگو اچھی ہے۔ وہ بولے مال روڈ چلو خیر چلے اور پھر وہی چڑھائی۔ منتیاز بولا بابوجی مال روڈ کِتّی دور رہے وِنہوں نے کہا وہ دیکھو اوپر جو عمارت نظر آرہی ہے۔ وہ بولا مار دیا وئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے قطب صاب کی تین چار لاٹھیں اوپر تلے رکھ دی گئی ہیں۔ خیر اب جو واں پہنچے تو منتیاز تو پھولا نہ سمایا بولا بابوجی تم تو مجھے جنت میں لے آئے۔ مال روڈ پہ تو بڑے زوروں کے مال نظر آرہے ہیں۔ اِتّے میں ایک خوبصورت لڑکی وِس کے پاس سے گذری تو بولا "مرتا ہوں ترے ہجر میں اے یار خبر لے"۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور لڑکی سبز ساڑھی باندھے وِس کے برابر سے نکل گئی کہنے لگا ابے یہ اِچّھا اندر کے اکھاڑے کی سبز پری یاں کاں سے آ گئی۔ میں نے اور بابوجی نے وِسے بتیرا سمجھایا کہ یاں حلالی پنا نہ کر مگر وہ کد باز آنے والا تھا وِسے تو کچھ ایسی ہوا لگی کہ آپے سے باہر ہی ہوتے جا رہا تھا ہم دونوں نے وِس سے کہا کہ اچھا بھئی جو تیرا جیسا مجاز چاہے کر مگر ہم تیرے ساتھ نہیں چلیں گے۔ وہ بولا میں تو اپنا دل خوش کرتا چلوں گا۔ خیر ہم وِس کے پیچھو پیچھو ہو لئے اِتّے میں ایک عورت بُرقع پہنے ہوئے سامنے سے آئی وہ کدھی تو منہ کھول لیتی تھی اور کدھی ڈھنک لیتی تھی اور تھی ذرا اچھے ناک نقشے کی۔ منتیاز وِسے دیکھ کر ریشہ خطمی ہو گیا۔ اور وِس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:۔

ارے پردہ نشیں یہ بھی کوئی پردے میں پردہ ہے ... کدھی بے پردہ ہو جانا کدھی روپوش ہو جانا

وِس عورت کا مرد بھی ساتھ تھا وِس نے جو سنا تو وِس کے آگ ہی تو لگ گئی اور آگو بڑھ کر منتیاز کے جابڑے پر ایک جمتول ہاتھ ایسا رسید کیا کہ منتیاز کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ منتیاز بھی تم جانو بلوانی کرتا ہے وہ بھی سنبھل کے وِس کو لپٹ گیا۔ اب کدھی تو وہ آدمی اوپر اور کدھی منتیاز۔ سیلوں لوگ باگ جمع ہو گئے۔ پلس بھی آگئی اور وِس نے دونوں کو ہٹایا۔ وِس آدمی نے ایک گورے سی کچھ گٹ پٹ گٹ پٹ کی اور وہ منتیاز کی گردن پکڑ وِسے کتوالی میں لے گیا۔ بابوجی اور ہم واں سے کھسک گئے دوسرے دن ہمارے پاس ایک پلس والا آیا۔ ہمیں بابوجی نے پہلے ہی سکھا دیا تھا ہم بالکل انجان بن گئے ہم نے کیا ہم تو وِس کو جانتے بھی نہیں۔ دو تین دن بعد معلوم ہوا کہ وہ جو ایم اے مغنی ہماری داستان لکھتا ہے وِس نے پلس والوں سے کہہ سن کر وِس کو چھٹوا دیا اور وہ دِلّی چلا گیا۔ سات آٹھ دن بعد ہم بھی دِلّی پہنچے جد ہم اسٹیشن سے گھر جا رئے تھے تو رستہ میں منتیاز مل گیا ہمیں دیکھ کر وِس نے منہ پھیر لیا میں نے ہنس کر کیا کیوں بئی منتیاز پچھنے کا یارانہ بالکل ہی بھلا دئے گے وہ بولا اگر اصل کے ہو گے تو آئندہ مجھ سے کلام مت کرنا میں نے کیا اچھا یہ تو بتا اب کونسے پہاڑ کی سیل کو چلیگا وہ بولا "مجھ سے مخریز بازی مت کرنا نہیں تو میں"۔۔ میں نے کیا ابے جازادہ بدلغامی مت کر ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ اِتّے میں بابوجی بیچ میں گھستے وے اگاڑ وے لے گئے اور بات آئی گئی ہو گئی ؎

ایم۔ اے مغنی دہلوی

رات کے دو منظر

(۱)

یہ فضا تھی اک بہشتِ مختصر کل رات کو
کس قدر آسودہ تھی میری نظر کل رات کو

ہے تصور میں ابھی تک جلوہ افگن ہمنشیں!
خطِ جامِ مے کہ تھا موجِ گہر کل رات کو

دید کے قابل تھیں میرے غمکدے کی زینتیں
غیرتِ فردوس تھے دیوار و در کل رات کو

محتسب بھی سرخوشی میں تھا شریکِ دورِ جام
پی رہے تھے رند بے خوف و خطر کل رات کو

دامنِ فردوس میں خوابیدہ تھا پیکِ خیال
تھی یہ دنیا حلقۂ بیرونِ در کل رات کو

وہ ہجومِ نور تھا گویا چراغوں کے عوض
جل رہے تھے بزم میں شمس و قمر کل رات کو

آ رہی تھی کان میں زہرا کے نغموں کی صدا
یا کھنکتے تھے پیاپے جامِ زر کل رات کو

حسن کی فطرت نے چہرے سے اٹھا دی تھی نقاب
شام ہی سے مسکراتی تھی سحر کل رات کو

خواب کا سا اک سماں تھا، کیا کہوں، کیونکر کہوں'
کون اختر میہماں تھا میرے گھر کل رات کو

علی اختر

(۲)

ہائے جی بھر کے تڑپنا نہ ملا رات کی رات
ہجر کی رات ہوئی مرگِ مفاجات کی رات

ختم ہو جاتی ہے اک خوابِ تخیل بن کر
زندگی کیا ہے — کسی بیخودیِ جذبات کی رات

وہ سجود، اور وہ دامانِ قبائے ساقی
ہائے کیا رات تھی اک مستِ خرابات کی رات

یاد آتی ہیں وہ تاروں سے سحر تک باتیں
جب ہر اک رات تھی خاموش بیانات کی رات

یاد آتا ہے وہ اندازِ پشیمانیٔ حسن!
بھولتی ہی نہیں وہ اُن سے شکایات کی رات

نوحہ گر یاس ہی کیا کیا مری تنہائی پر
ہائے یہ کیف میں ڈوبی ہوئی برسات کی رات

اب بھی آنکھوں میں پھرا کرتی ہے تا صبح روش!
وہ کسی کافرِ گیسو سے ملاقات کی رات

روش صدیقی

جھوٹ کے خطرات

موجودہ صدی کی اصلی پیداوار شاعری نہیں بلکہ فلسفہ ہے بیسویں صدی کا متمدن دماغ تخیل کے دھندلکے میں رہنے کے بجائے عقل کی روشنی میں عمل کرنا زیادہ پسند کرتا ہے شاید یہ غلط نہیں کہ بیسویں صدی کا فلسفہ اس خفیف سے شعری عنصر کو بھی جو انیسویں صدی کے فلسفہ میں غیر معلوم طور پر محلول تھا نکال دینے کے درپے ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کوشش میں کامیاب ہو جانے کے بعد کیا نتائج پیدا ہونگے اور مذہب پر جو حقیقت میں نام ہے آسمانی شاعری کا یہ ذہنیت کس طرح اثر انداز ہو گی لیکن فی الحال جو منظر اس ذہنی کشمکش نے پیدا کر دیا ہے اس کی دلچسپیوں سے انکار نہیں کیا سکتا۔

اس فلسفے کا اثر اگر "اخلاق" پر نہیں۔ تو کم از کم "اخلاقیات" پر نہایت گہرا پڑا ہے یہ اخلاقیاتی انقلاب ایک ایسی حقیقت ہے جس پر قدیم خیال کے لوگ غم و غصہ اور جدید خیال کے لوگ مسرت و اطمینان کا اظہار کچھ ایسی غلو کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ عملی اخلاق کا معیار آج گذشتہ زمانے سے بیحد مختلف ہے یا نظری اخلاق کے فروعی مسائل نے بیسویں صدی میں کوئی نئی شکل اختیار کر لی ہے واقعہ اگر صرف اس قدر ہوتا تو غالباً اس قدر شدت کے ساتھ ماتم کرنے یا اس قدر وارفتگی جوش کے ساتھ جشن منانے کی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ صورت یہ ہے کہ نظریات اور متنازعات سے گذر کر ترمیم و تنسیخ کی یہ موج بدیہیات تک پہنچ چکی ہے۔ وہ مسائل اولیں جن پر قدیم علمِ اخلاق کی بنیادیں استوار کی گئی تھیں وہ مبادیات جن کی صداقت پر ایمان رکھنا کل تک سلامتِ طبع کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ آج اسی نئی قوت کے سامنے لرز رہے ہیں۔

راست گوئی۔ ہمدردی محبت ایثار اور ہر قسم کی وہ سب "صفاتِ حسنہ" جو اجتماعی نظام کے لئے بے انتہا ضروری سمجھی جاتی تھیں آج معرضِ بحث میں ہیں۔ اخلاقیات کے عالم میں اک ہیجان بپا ہے۔ جو چیزیں اب تک نیکیاں شمار ہوتی تھیں وہ برائیاں بن رہی ہیں اور وہ چیزیں جن کو پچھلے لوگوں نے ہمیشہ گناہ اور آلودگیٔ نفس سے تعبیر کیا اب محاسن کی شکل اختیار کرتی جاتی ہیں۔

گزشتہ زمانے کا فلسفۂ اخلاق محبت ہمدردی اور ایثار کو جو شاید ایک ہی چیز کے تین عنوان ہیں۔ صرف محاسن میں جگہ دینے کے لئے جو استدلال پیش کیا کرتا تھا۔ اس کا بلاواسطہ خطاب ممکن ہے۔ کہ ہمارے دماغ سے ہوا کرتا ہو لیکن بالواسطہ جس چیز پر اس کی قوتِ جذب اثر کرتی تھی۔ وہ ہمارا دل تھا۔ اس عنصر کو میں نے شعریت سے تعبیر کیا ہے اور یہی وہ عنصر ہے جس سے بیسویں صدی کا فلسفہ بیزار نظر آتا ہے مثلاً "ایثار" آج کوئی اخلاقی خوبی نہیں۔ اس دلیل کی بنا پر کہ چونکہ ایثار کرنے والا بھی سوسائٹی کا ایک فرد ہے اس لئے اس کا دوسرے کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے، اپنا نقصان کرنا فلسفے کی نگاہ میں اتنا ہی سخت جرم ہے جس قدر کسی دوسرے کو نقصان

پہنچانا۔ ہمدردی اس بنا پر لغو قرار دے دی گئی ہے کہ اول تو حقیقی معنی میں اس کا وجود متعذر ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو چونکہ سوسائٹی کو اس سے کوئی قابلِ لحاظ مادی فائدہ نہیں پہنچتا اس لئے ایک لاطائل اور غیر مفید جذبہ کی پرورش کر کے دل کا خون خشک کرنا کوئی عقلمندی نہیں رہی محبت تو وہ بیالوجی، سائیکالوجی، فزیالوجی اور نہ معلوم اور کتنی "آلوجیوں" کے ہاتھوں موت کے قریب آلگی ہے۔ جدید دماغ کو محبت کے وجود میں شک ہے، اس کے "فوائد" سے انکار ہے اور اس کی غیر روحانیت کا یقین۔

ان "صفاتِ حسنہ" میں سے سب سے زیادہ جس پر اس انقلابی ذہنیت نے اثر ڈالا ہے وہ راست گوئی ہے۔ اگر آج بارہویں صدی کا کوئی انسان اس دنیا میں آنکلے اور اس سے موجودہ صدی کا کوئی فلسفی بصد متانت و سنجیدگی یہ پوچھے کہ "حضرت اس نظریۂ راست گوئی سے متعلق جناب کا کیا خیال ہے" تو پھر کم از کم مجھے تو یقین ہے کہ یا تو وہ اس سوال کا مفہوم نہ سمجھ سکے گا اور کچھ سمجھ سکا تو خواستہ یا ناخواستہ اُسے دوبارہ اس دنیا سے سدھارنا پڑیگا شاید جاتے وقت وہ جذباتِ غیظ سے مغلوب ہو کر کہے "یا اللہ! یہ لوگ کافر تو نہیں ہیں"؟

یہ ہے وہ ذہنیت جو مذہب نے اپنی شعریت سے صدیوں میں تعمیر کی تھی اور جسے بیسویں صدی کے فلسفی اپنے "براہین و استدلال" سے شکست دینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ سچ دنیا میں اب بھی کافی بولا جاتا ہے اور اگر دنیا کے اختتام تک نہیں تو کم از کم بیسویں صدی کے اختتام تک تو ضرور بولا جاتا رہیگا لیکن اب اس کی وجہ یہ نہیں رہی کہ سچ بولنا ثواب ہے۔ "جھوٹ سے لوگ اب بھی گریز کرتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے" "ثواب و گناہ" کی روحانیت تباہ ہو چکی اب تو دنیا کا ایک معیار صرف ایک کسوٹی ہے منفعت جوئی! (*Utilitarianism*) اس معیار کے مطابق جھوٹ اگر کم بولا جاتا ہے تو اس لئے کہ اُس سے جو نقصان پہنچتے ہیں وہ "خطرناک ہیں"۔

جھوٹ ہے کیا چیز؟ کسی واقعہ کا اظہار اس طرح کرنا کہ مخاطب کے ذہن میں اس واقعے کی غلط تصویر منقوش ہو جائے سہل تر لفظوں میں جھوٹ نام ہے غلط بیان کا جس طرح کفر نام ہے غلط رائے کا جھوٹ اور کفر[1] میں فرق ہے مگر صرف اتنا کہ ایک متعلق ہے بیان سے اور دوسرا معتقدات سے۔ اسی اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں ہمیشہ "گپ" (*Paradox*) کی منطقی تعریف غیر معتدل بیان اور بدعت[2] کی تعریف غیر معتدل رائے کیا کرتا ہوں۔ میرے نزدیک جھوٹ اور گپ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اول الذکر غلط بیانی ہوتی ہے لیکن معتدل اور قابل یقین اور ثانی الذکر غلط بیانی ہوتی ہے غیر معتدل اور ناقابلِ یقین۔ اسی طرح کفر اور بدعت کا اصولی اختلاف یہی ہے کہ ایک غلط رائے ہوتی ہے مگر ایک خاص حد تک سنجیدہ اور لائق وثوق، دوسری غلط رائے ہوتی ہے لیکن یکسر لغو اور دور از کار۔ دو لفظوں میں بدعت اعتقادی گپ ہے اور جھوٹ بیانی کفر!

اس تفصیل سے مدعا یہ تھا کہ جھوٹ اور گپ، کفر اور بدعت کے متعلق جدا جدا بیسویں صدی کے اخلاقی نظریوں کی توضیح نسبتہً سہل ہو جائے۔ گپ اور بدعت کے متعلق جدید اخلاقیات کا فیصلہ یہ ہے کہ چونکہ ان سے کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچتا اس لئے وہ لغو ہیں۔ مبالغہ آمیز بیان یا مبالغہ آمیز رائے مادی نقطۂ نظر سے بیکار ہے۔ اس لئے کہ سننے والا فوراً سمجھ لیتا ہے کہ وہ حقیقت جس پر یہ گوشت اور پوست چڑھایا گیا ہے کیا "اندازِ قدر" رکھتی ہے اور وہ مقصد جس کو سامنے رکھ کر متکلم نے یہ غلط بیانی یا غلط رائے اختیار کی تھی، فوت ہو جاتا ہے منفعت جو فلسفہ اسی بنا پر گپ اور بدعت کو لائقِ اعتبا

---

[1] اس سے مراد مذہبی کفر یا بدعت نہیں [2] شاید یہ ترجمہ صحیح نہیں لیکن اس خاص محل پر مناسب ہے۔

قرار نہیں دیتا البتہ اگر غرض اور مقصد سے الگ ہٹ کر صرف فنی ذوق کی تشنگی فرو کرنے کے لئے گپ اور بدعت کا استعمال کیا جائے تو اس میں شبہ نہیں کہ نتائج حد درجہ قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو انہی بے وجہ اور غیر ضروری گپوں اور بدعتوں نے دنیا میں گلکاریاں کی ہیں صناعی کی روح جب کسی گپ یا بدعت میں حلول کر جاتی ہے تو شعر عالم وجود میں آتا ہے!

"کفر" کے متعلق جدید اخلاقیات یکسر خاموش ہے۔ لا ادریت اور تشکالیت (Scepticism) نے موجودہ دماغ کو بے انتہا محتاط یا بیحد ڈرپوک بنا دیا ہے فلسفی غلط رائے (کفر) کو برا سمجھتا ہے مگر ڈرتا ہے اُس وقت سے کہ خود اُس کی رائے غلط ثابت ہوجائے اور بربنائے احتیاط اپنے تیروں کا نشانہ کفر (غلط رائے) کو نہیں بلکہ غیر معتدل رائے کو بناتا ہے:۔

مگر اس وقت مجھے گپ اور بدعت کی لذتوں یا کفر کی نسبتی حفاظت سے سروکار نہیں دیکھنا یہ ہے۔ کہ جھوٹ کے خطرناک ہونے سے کیا مراد ہے میرا خیال ہے کہ جب ہم کسی چیز کو خطرناک کہتے ہیں تو گویا بالواسطہ اس کی غیر معمولی حیثیت کا اعتراف کرتے ہیں زندگی کی عام مصروفیات کو خطرناک نہیں کہا جاتا، روٹی کھانا، پانی پینا، چلنا پھرنا اور رات کو سونا یقیناً کسی قوم میں خطرناک شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن جب کوئی چیز، کوئی شخص، کوئی عمل، کوئی خیال عامیت کی حدود سے خارج ہو جائے۔ تو ایک خاص کیفیت کی موجودگی کو دیکھتے ہوئے ہم بعض حالات میں اسے خطرناک کہتے ہیں اس سے مراد یہ نہیں ہوا کرتی کہ وہ فرد جس سے یہ خطرہ وابستہ ہے قابلِ تحقیر یا قابلِ ملامت ہے بلکہ مقصود یہ اظہار کرنا ہے کہ وہ فرد چند خصوصیات کی بنا پر ایک بالکل عجیب قوت اپنے میں رکھتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ اور سب سے زیادہ یہ کہ مناسب حدود کے اندر برتا جائے۔ مثلاً عام گفتگو میں آپ اکثر کہتے اور سنتے ہیں کہ "وہ شخص نہایت خطرناک ہے" اس جملہ کے ساتھ فوراً ہی آپکے ذہن میں اس شخص کی غیر معمولی انفرادیت کا ایک عکس آجاتا ہے۔ آپ فطری طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اس شخص کے ساتھ نہایت محتاط سلوک کرنا چاہیئے ورنہ اذیت پہنچ جانے کا احتمال ہے۔ ان حالات میں حقیقت یہ ہوا کرتی ہے کہ ایک شخص کسی خاص باب میں غیر معمولی قوت کا مالک ہوتا ہے اس سے بحث نہیں کہ وہ خاص قوت اپنے صرف کے اعتبار سے مذموم ہے یا پسندیدہ۔ بحث صرف اس قدر ہوتی ہے کہ وہ زمین پر بسنے والے عام آدمیوں سے ممتاز ہے۔ اس کی طبیعت بیرنگ نہیں۔ وہ اپنی ایک مستقل انفرادی شخصیت رکھتا ہے اور اس کی اسی انفرادیت نے اسے خطرناک بنا دیا ہے لیکن اگر آپ کو اس کے برتنے کا راز معلوم ہے اگر آپ جانتے ہیں کہ اس کی کون سی رگ سب سے زیادہ حساس ہے تو پھر آپ اسی خطرناک شخص سے بے اندازہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں قاتل، چور، پیشہ ور فریب باز ایک طرف مولوی، مرشد اور سیاسی لیڈر دوسری طرف ایسے حضرات ہیں جن کی انوکھی ذہنیت نے انہیں ساری دنیا سے الگ ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے پھر عوام میں سے وہ لوگ جو نوع بشر کی ان صنفوں کو صحیح معنوں میں برتنا نہیں جانتے اکثر ان سے نقصان اٹھاتے ہیں لیکن اگر آپ کوشش کرکے ان لوگوں کے کمزور مقامات سے واقف ہوجائیں تو پھر ذہنی اور مادی "فتوحات" کی ایک دولت گرانمایہ آپ کا حصہ ہے۔ اس سے زیادہ کھلی ہوئی مثالیں لیجئے۔ سرجری کے بیش قیمت آلات ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ ہر شخص ان کے استعمال کی نزاکتوں سے

واقف نہیں ہو سکتا۔ کوئی انجان بربنائے استعجاب انہیں چھو بھی لے تو شاید اس کو تکلیف پہنچ جائے لیکن ان کے استعمال اور مصرف سے آگاہی حاصل کرلینے کے بعد ایک سرجن انسانوں کی کتنی خدمت کر سکتا ہے۔ زہر جس کا نام لینا ہی بعض جسموں میں ایک ناخوشگوار سنسی پیدا کر دیتا ہے مناسب اور محتاط استعمال کے بعد نہیں جسموں کے لئے کتنا سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ آگ جو غالباً خطرہ کا مجسمہ ہے مخصوص حالات کے ماتحت کس قدر فائدہ پہنچانے کی اہلیت رکھتی ہے۔

یہی بنیاد ہے منفعتی فلسفہ کی۔ دنیا میں کوئی چیز نہ اچھی ہے نہ بری۔ اگر فائدہ بخش ہے تو یقیناً اُس کو موجود رہنے کا حق حاصل ہے اور اگر نہیں تو اسے فنا ہو جانا چاہیئے لیکن ان تمام خطرناک اشیا میں ایک صفت مشترک ہے یعنی اُن کا بے محل اور غیر ضروری استعمال ضرر پہنچاتا ہے۔ ایک مخصوص حد کے بعد اُن کی ضرر رسانی اپنا کرشمہ دکھاتی ہے۔ کفایت شعاری یوں تو زندگی کے ہر شعبہ میں مستحسن ہے لیکن جہاں سوال ہو خطرہ کا وہاں یہ لابدی اور ناگریز بن جاتی ہے۔

"خطرناکی" کا یہ تجزیہ ایک اصولی بحث تھی۔ اب دروغ گوئی کے مسئلہ پر اس کو آزما کر دیکھیئے:-

میرے نزدیک جھوٹ کے مادی فوائد سے کسی سنجیدہ انسان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ جھوٹ ہی وہ طلسم ہے جو مختلف شکلوں اور مختلف حیثیتوں میں بیک وقت ناخوشگوار بھی ہے اور بے انتہا دلکش بھی۔ جھوٹ کے متعلق یہ خیال بیسویں صدی کی خصوصیت نہیں ہے۔ آج سے بہت پہلے ایک مرد بزرگ جھوٹ کی فضیلت کا (ایک خاص حالت میں) اعتراف کر چکا ہے۔ ان لفظوں میں "دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز"۔

"مصلحت آمیزی" اگر دروغ کی اخلاقی تعزیر پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ تو پھر مصلحت آمیزی کی تعیین و تحدید کے علاوہ اور کوئی صورت اس طبقہ کے لئے باقی نہیں رہتی جو کذب و صدق سے متعلق اُن احکام کو جو کبھی مذہبی قوت کے ماتحت ضبط کئے گئے تھے آج بھی اُسی قدر شدت کے ساتھ لائق عمل قرار دیتا ہے جتنا کہ ماضی بعید میں منفعتی فلسفہ کے مطابق یہ طے ہو چکا ہے کہ اگر جھوٹ کسی کیسی حیثیت سے بھی مفید ہو سکتا ہو تو اُسے "حقِ وجود" حاصل ہے اور جھوٹ کی افادیت مسلّم۔ لہٰذا اس کا منطقی نتیجہ ظاہر ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ جھوٹ کا وجود ان اشیا کے وجود کا سا تو نہیں ہے جو یا یکسر غیر مضر ہیں یا اُن کی مضرت اُن کے مفاد کے مقابلہ میں بہت مضمحل ہے۔ بہت کم غور سے یہ حقیقت آپ پر منکشف ہو جائیگی کہ جھوٹ قطعاً اُن اشیا میں سے نہیں ہے بلکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے وہ اُس فہرست میں ہے جو مذکورہ صدر تعریف کے مطابق خطرناک اشیا پر مشتمل ہے۔ اس لئے کہ اول تو اس کا استعمال ہر شخص نہیں کر سکتا۔ ایک خاص مدت تعلیم یا صلاحیتِ خداداد کے بغیر تکمیل کے ساتھ جھوٹ نہیں بولا جا سکتا۔ اس کے علاوہ خطرناک اشیا کی طرح جھوٹ کا استعمال نہایت کفایت اور اقتضا کے ساتھ کیا جاتا ہے ورنہ گزند پہنچ جانے کا توی امکان ہے۔ ان دونوں خصوصیات کی تفصیل بہت دلچسپ ہوتی اگر مجھے اس بات کا موقع حاصل ہوتا کہ دونوں کی متعدد مثالیں دے کر ان کی نزاکتوں اور باریکیوں کی توضیح کروں۔ بہرحال بہت مختصر اور سادہ طریقہ پر یوں سمجھئے کہ جھوٹ بولنا فطرت نہیں بلکہ فن ہے اور اسی لئے محتاج ہے مشق کا یا شاذ حالات میں اس مخصوص دماغی ترکیب کا جو پیدائشی جھوٹوں کی ذمہ دار ہے۔ جھوٹ فنی اعتبار سے اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک جھوٹ بولنے والا

سچ کی پوری نقل نہ اتار دے جس طرح آرٹ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فطرت کا صحیح چربہ نہ ہو۔ پھر اس کے لئے ضروری ہے کہ جھوٹ بولنے والا فن تمثیل (acting) کا ماہر ہو۔ ایک ایسے فن تمثیل کا جس کا مقصد فنی مغالطہ پیدا کرنا نہیں بلکہ حقیقی مغالطہ پیدا کرنا ہے اور یہ بے انتہا دشوار ہے۔ اس لئے کہ فنی مغالطہ بڑی حد تک اس شخص کے ارادے اور مرضی کا بھی ممنون ہوتا ہے جسے مغالطہ دیا جا رہا ہے مثلاً تھیٹر اور سینما کے دیکھنے والے کا ایک ماہر فن ایکٹر کے مقابلے میں یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو "فریب خوردگی" کے لئے بالکل تیار رکھے لیکن حقیقی مغالطہ کو اس قسم کی ذہنی مدد نہیں ملتی اور اسے خود اپنی قوت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ چونکہ جھوٹ کا مدعا ہمیشہ یا خود کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے یا دوسرے کو نقصان پہنچانا اس لئے اس آلہ کو بے انتہا احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ مبادا عدم تکمیل کی صورت میں کوئی شدید نقصان اپنے کو نہ پہنچ جائے۔ رہی جھوٹ کی کثیر استعمال تو وہ ظاہر ہے اکثر و بیشتر جھوٹ بولتے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اکثر و بیشتر اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کثرت اور مزاولت سے اس کی خطرناکی کا احساس مردہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہی احساس آپ کی حفاظت کا ضامن ہوتا ہے اس لئے کہ جب تک آپ کے دل میں یہ خیال باقی ہے کہ آپ ایک خطرناک کام انجام دے رہے ہیں اس وقت تک آپ کے تمام قوائے دماغی مشتعل رہتے ہیں اور اس طرح اپنا عمل انجام دیتے ہیں کہ ممکن خطرات سے حفاظت ہو جائے لیکن کثرتِ عمل سے ایک بے حسی پیدا ہو جاتی ہے اور خطرات کی جانب سے آپ کا خیال ہٹ کر غیر ضروری چیزوں میں لگ جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ فاحش غلطیاں کر کے اپنے آپ کو رسوا کر لیتے ہیں۔ رسوا ہونے کے بعد جھوٹ کا فائدہ زائل ہو جاتا ہے اور وہ اسی قدر بیکار ہو جاتا ہے جس قدر گپ۔ اگر جھوٹ کے خطرناک ہونے میں شبہ نہیں تو پھر دنیا میں ہزاروں ایسے لوگ جو بھدے طریقے پر جھوٹ بولنے کے عادی ہیں کیوں سچ بولنا شروع نہیں کر دیتے کہ وہ سہل بھی ہے اور خالی از خطرہ بھی!

انیس احمد رشدی

اے زندگی! اچھے دن گزر گئے، اب تجھے کیوں کر گزاروں؟
گھڑیاں دراز ہو گئیں اور دن طویل!
اے زندگی تجھے کیونکر گزاروں؟
تو مجھے خوشیوں کا لالچ دیتی ہے؟
نہیں اے زندگی، نہیں!
میرا غم تیری خوشیوں سے بہتر ہے۔

غزل

تجھ کو نہیں اب پاسِ وفا جان گئے ہم
بدلی ہوئی آنکھیں تری پہچان گئے ہم

دم توڑ چکے ہم، ترے پیماں کی قسم ہے
لے اب ترا اللہ نگہبان، گئے ہم

اے ناصح ناداں یہ دمِ چارہ گری ہے
وہ دشمنِ جاں دوست نہیں مان گئے ہم

یہ گرمیٔ گفتار ہے تمہیدِ کرم کی،
طرزِ نگہِ دوست سے پہچان گئے ہم

یا قہر و ستم پر بھی گلہ دل میں نہ پایا
یا لطف و کرم پر بھی بُرا مان گئے ہم

غنچے کی طرح لائے تھے جمعیتِ خاطر
پر گل کی طرح ہو کے پریشان گئے ہم

حامد یہ فسوں کیا ہے کہ دیوانہ بنی خلق
جس بزم میں لے کر ترا دیوان گئے ہم

حامد علی خاں

محفلِ ادب

کوّے ہکنی

"......کوّے ہکنی کا قصہ سناتی ہوں" رزن خانم نے کہا "غور سے سنئے اور دیکھئے چشم زدن میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے. خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے...... سب سے پہلے تو آپ ملکہ زمانی بیگم کا حال سنئے. شاہی وقار، دبدبہ، خاندانی وجاہت اور رتبہ کے لحاظ سے جو درجہ ملکہ زمانی کا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نواب کی بیٹی، نواب کی بہن اور نواب کی بیگم تھیں. جہاں پناہ کا پہلا نکاح انہی سے ہوا اور اخیر وقت تک ان کا پلہ اسی وجہ سے بھاری رہا کہ بھائی کی یعنی نواب صاحب "رفترہ" کی حمایت رہی. مگر قسمت نے اولاد سے محروم رکھا صورت شکل عزت اور رتبہ سب ہی کچھ ان کو حاصل تھا لیکن بوجہ اولاد نہ ہونے کے رنگین محل بیگم کا اقتدار بڑھ گیا.

رنگین محل بیگم... جہاں پناہ کے چچا کی بیٹی لنگرانِ اعظم کے خاندان کا ایک چمکتا ہوا تارا!... اپنی چمک اور دمک کے ساتھ بڑی شان کے ساتھ طلوع ہوا. مگر آہ! بہت جلد... دیکھتے ہی دیکھتے... بجھ گیا!... اور اب اس کی ایک چمک ہے... جو آنکھوں میں اب بھی چبھ رہی ہے. رنگین محل... جس نے اپنی رنگین جوانی سے جہاں پناہ کی جوانی اور تخت و تاج کو رنگین بنا دیا! پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا. جہاں پناہ کو خبر بھی نہ تھی اور وہ ملکہ زمانی کے عشق و محبت کے گیت گا رہے تھے کہ رنگین محل کی محبت کا بھالا لگا، اپنے حسنِ لاثانی کے لحاظ سے سچ مچ شاہی خاندان کا ہیرا تھیں. بہت جلد بیگم بن گئیں اپنی خوبصورتی اور اپنی رنگینی کی وجہ سے رنگین محل کا خطاب پایا. سال بھر بھی شادی کو نہ ہوا تھا کہ خدا نے ان کو بیٹا دیا لنگرانِ اعظم کے خاندان کو خدا نے جانشین عطا فرمایا. یہ ایسی خصوصیت تھی کہ رنگین محل کو بڑی بیگم ملکہ زمانی پر بھی فوقیت حاصل ہو گئی.

رنگین محل کو بدقسمتی سے خداوند تعالیٰ نے اچھی صورت شکل کے ساتھ ضد بھی دی تھی جس میں خاندانی غرور اور ولیعہد مرحوم کی ماں ہونے کے فخر نے اور بھی تلخی پیدا کر دی تھی.

دلرس بانو بیگم کے محل میں داخل ہونے کے بعد عجیب سماں تھا... قصاں لرزاں محبت کے دو تارے تھے! اگر ایک طرف ولیعہد کی ماں کامیاب ترین جوانی کی تفسیر اپنی محبت اور عشق کے افسانوں کو اولاد... بہترین اولاد یعنی تاج و تخت کے وارث ولیعہد کی جیتی جاگتی تصویر سے مزین کئے آسمانِ محبت کے لئے زینت تھیں تو دوسری طرف دلرس بانو بیگم اپنی اٹھتی ہوئی جوانی کو حسن کی گرمی سے مشتعل کئے گویا مجسم عشق و محبت کی چنگاری کی طرح چمک رہی تھیں.

لوگ دونوں کو دیکھتے تھے اور سر ہلا کر کہتے تھے کہ ایک روز یہ دونوں ٹکرائیں گی! اب کیا ہوگا! یہ ایک سوال تھا!

دلرس بانو کے عروج نے ملکہ زمانی اور رنگین محل کی قدرتی مخالفت کو دور کر دیا. دونوں دیکھ رہی تھیں کہ دلرس بانو کی حریص نظریں اُس بلندی کو چھو رہی تھیں جو ان دونوں کو حاصل تھی اور اُن کے علاوہ کسی دوسری ہستی کو نہ تو نصیب ہو سکتی تھی اور نہ ہونا چاہیئے تھی وہ دیکھ رہی تھیں

کہ دلرس بانو آدابِ شاہی کا لحاظ نہیں رکھتی، وہ ان پابندیوں سے معاف ہے۔ وہ آدابِ شاہی اور محل کے دستوری روایات و قوانین کو ایک نئے سانچے میں ڈھال رہی ہے۔ دونوں اپنے حقوق کی بڑے غور سے نگرانی کر رہی تھیں اور ہر دم ہوشیار تھیں کہ کہیں دلرس بانو کی طرف سے کسی قسم کی دست درازی نہ ہو۔

دن گزرے۔ مہینے گزرتے گئے اور سال گزرنے آئے۔ اس دوران میں ایک موقعہ پر نہیں دس جگہ دلرس بانو نے سب ہی بیگمات کو توزک دی۔ ہر معاملہ میں سب ہی کو توزک ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ اُلجھنیں پیدا ہوئیں۔ بدگوئی، غمازی اور ریشہ دوانیوں کے جال بچھ گئے۔ کھلم کھلا دلرس بانو سے ملکۂ زمانی اور رنگین محل کی چشمک اور مخالفت کے تذکرے ہونے لگے۔ دلوں میں مخالفت کے بیج بوئے گئے۔ ملکۂ زمانی اور رنگین محل نے اپنی پوری قوت اور جمعیت کے ساتھ دلرس بانو کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر اپنی محافظت کی فکر کی۔ ہر دربار میں دونوں کو ذلت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہر موقعہ پر دعوت میں جلسہ میں کھلم کھلا سینکڑوں خواصوں اور ملازماؤں کی موجودگی میں دونوں یہ دیکھتیں کہ ہمارا کوئی نہ کوئی پرانا مرتبہ اور اعزاز ہم سے چھین کر دلرس بانو بیگم کو دے دیا گیا۔ نسبت بایں جا رسید کہ داہنے ہاتھ کا قرب ملکۂ زمانی سے چھین کر دلرس بانو بیگم کو ملا اور ان کے داہنے ہاتھ پر بیٹھنے سے رنگین محل نے انکار کر دیا۔ یہ عید کے دربار کا موقعہ تھا۔ ملکۂ زمانی تو درد سر کا بہانہ کر کے شریک نہ ہوئیں مگر رنگین محل نے اپنے درجہ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا اور ملکۂ زمانی کی غیر موجودگی میں جہاں پناہ کے داہنے ہاتھ کا قرب نہ لگا اور تیوری پر بل ڈال کر دلرس بانو بیگم سے کہا کہ اپنی جگہ سے اٹھو اور میرے لیے جگہ خالی کر دو۔

ظاہر ہے کہ دلرس بانو بیگم کو یہ ناگوار گزرا جس کے یہ معنی ہوئے کہ خود جہاں پناہی کو ناگوار گزرا۔ جہاں پناہ نے پہلے تو زبان سے کچھ نہ کہا لیکن بات جو بڑھی تو رنگین محل کو حکم دیا کہ بیٹھ جاؤ۔ رنگین محل کی سخت توہین ہوئی اور وہ آپے سے باہر ہو گئیں اور انہوں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا اور تیہے میں آ کر دربار چھوڑ کر چل دیں۔ جہاں پناہی پکارتے ہی رہے "سنو تو۔۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔" مگر بھلا وہ سنتی تھیں، نکلی چلی گئیں۔ دلرس بانو نے مذاق کے لہجہ میں یہ کہہ کر مشتعل دلا دیا کہ "وہ نہیں آئیں گی آپ کے قابو کی نہیں ہیں"۔ بس اتنا کہنا تھا کہ تو وہ بارود میں گویا آگ دے دی۔ "پکڑ لاؤ" گرج کر خواجہ سراؤں کی طرف دیکھا۔ "پکڑ لاؤ" دوبارہ گرج کر انہوں نے کہا اور چار خواجہ سرا حکم کی تعمیل میں دوڑ پڑے۔

رنگین محل سیدھی ملکۂ زمانی کے پاس گئی تھیں چوبداروں نے وہاں پہنچ کر حکم جہاں پناہی سنایا گویا نوٹس مل گیا کہ چلتی ہو تو چلو ورنہ سچ مچ پکڑ کر لے جائیں گے۔ چار و ناچار رنگین محل کو واپس آنا پڑا۔ جہاں پناہی جلال کی تصویر بنے ہوئے بیٹھے تھے ان کو دیکھ کر سہم گئیں اور دوڑ کر بیچاری نے اپنا سر جہاں پناہی کے قدموں میں رکھ دیا۔ جہاں پناہی نے کہا "معاف کیا" اتنا کہہ کر رنگین محل کا سر اوپر کو کر کے کہا اور دلرس بانو کی طرف انگلی اٹھا کر "ان سے بھی معافی مانگو۔"

جہاں پناہی کا یہ کہنا تھا کہ گویا رنگین محل کے دل پر برچھی لگی! ایکدم سے آنسو نکل پڑے اور انکار کر دیا۔ اس طرح کہ پھر جہاں پناہ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ دربار تو سب کا سب پہلی ہی گرج پر برہم ہو چکا تھا اور سوائے خواص و رازداروں کے اور کوئی نہ تھا۔

اس انکار پر جہاں پناہی کا غصہ بڑھنا شروع ہوا پھر تکرار پر رنگین محل کا سر جہاں پناہ کے قدموں میں تھا حتیٰ کہ جہاں پناہ نے اس غلام کی تیلی کے سر کو ٹھکرا دیا اور گرج کر حکم دیا کہ دلرس بانو سے معافی مانگے مگر وہاں وہی انکار تھا باوجود ٹھوکروں کے سر اسی طرف جھکتا تھا غصہ بڑھتا گیا تو جلال میں آ کر جہاں پناہ نے دو خواصوں کو حکم دیا کہ رنگین محل کا سر دلرس بانو کے قدموں

میں زبردستی لکھ دیں۔ حکم کی دیر تھی کہ خواصیں پہنچیں اور قدرے ادب سے انہوں نے رنگین محل کو اس طرح جھکانا چاہا تو رنگین محل نے زور لگا کر چھڑا لیا۔

قصہ مختصر اس کشمکش، ضد اور بحث نے جب زیادہ طول کھینچا تو زرین بانو بیگم نے جہاں پناہی سے پھر کہا۔ "ان کی ضد آپ کے بس کی نہیں"۔

بس یہ کہنا تھا کہ اور بھی آگ بگولا ہوگئے۔ خود اٹھ کھڑے ہوئے اور کئی گالیاں اس قدر نازیبا دیں کہ ایک تمکنت کے ساتھ رنگین محل کے ماتھے پر بھی بل پڑ گئے۔ ایک گستاخانہ نظر سے انہوں نے جہاں پناہی کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کرکے سر جھکا لیا! اور گویا بہری پتھر بن گئیں۔ جہاں پناہ کی ہزار دھمکیوں کا جواب ایک خاموشی تھی۔ ہر لمحہ جہاں پناہ کا غصہ بڑھتا گیا مگر رنگین محل سر جھکائے بت بنی پڑی ہیں حتیٰ کہ جہاں پناہ نے کہا کہ میں تین دفعہ اور کہوں گا اگر پھر بھی نہ سنا تو بس خیر نہیں ہے۔ رک رک کر انہوں نے تین دفعہ کہا "معافی مانگو" لیکن رنگین محل کا برا وقت آچکا تھا اور انہوں نے ایک نہ سنی۔ تیسری آواز کے بعد ہی جہاں پناہی کے منہ سے خوفناک حکم نکلا "بلاؤ کوتوال کو" یعنی خواجہ سراؤں کا کوتوال جس کے اور فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گاہے بگاہے بیگمات اور دوسری نکاحیوں اور منظورِ نظر باندیوں اور کنیزوں وغیرہ کو مارے پیٹے۔

"اس کو یہیں مارو" جہاں پناہ نے کہا اور کوتوال نے ایک کوڑے سے رنگین محل کی خبر لینا شروع کی۔ دو خواجہ سراؤں نے جہاں پناہ کے حکم سے رنگین محل کی چوٹی پر ہاتھ ڈالا۔ زخمی شیرنی کی طرح تڑپ کر رنگین محل اٹھی اور ضبط و تحمل سے بے نیاز ہو کر خواجہ سراؤں کو مارنے کی کوشش کی۔ چیخ کر کہا "مار بھی ڈالئے مگر اس چڑیل (زرین بانو کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا) سے معافی نہ مانگوں گی۔

مگر کہاں ایک کمزور ناز و نعم کی پالی بیگم اور کہاں تین خواجہ سرا۔ پکڑ کر ادھیڑ ڈالا اور رنگین محل بیہوش ہوگئی۔ جہاں پناہی نے حکم دیا کہ "اسے لے جاؤ اور حوالات میں رکھو۔ جب ہوش آئے تو کہہ دینا کہ یا تو معافی مانگے ورنہ سر مونڈ کر کوے ہکنی بنا دیا جائے گا۔

رنگین محل کو خواجہ سرا حوالات میں لے گئے۔ وہاں دو تین گھنٹہ بعد جب ہوش آیا تو جہاں پناہی کا پیغام ان کو پہنچایا گیا کہ یا تو معافی مانگو ورنہ کوے ہکنی بنو۔ بہت کچھ سب نے سمجھایا مگر وہاں تو ایک ضد تھی۔ صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ سچ مچ رنگین محل کا سر مونڈ دیا گیا اور سچ مچ وہ پائیں باغ میں "کوے ہکنی" کا لقب دے کر پہنچا دی گئیں۔ رنگین محل کا... تنزل تھا کہ موت.... خدا کی پناہ، ہمایوں کا ایک رنگین بلبلہ تھا جو رقصاں و لرزاں محبت کی فضا میں ابھی تیر رہا تھا کہ ایک ٹھوکر کے ساتھ بجھ گیا!

لنکران کے عالیشان محلوں کے جگمگاتے ہوئے کمروں میں محبت کے نغموں سے فضا معمور تھی۔ محبت کی پریوں کی نرم نرم اور میٹھی سانسوں سے کمرہ مہک رہا تھا۔ خوبصورت اور چلبلی خواصوں کا جمگھٹ ساز کے ساتھ تتلیوں کی طرح پھر پھرا رہا تھا۔ عشقیہ گیت نہیں تھے بلکہ ساز کے پردوں سے شعلے نکل رہے تھے، اور اس رنگین عالم میں ملکہ رنگین محل ایک خوشنما تارے کی طرح جھمکتی مسکراتی۔ نور کی شعاعوں میں نہاتی۔ بل کھاتی اٹھلاتی۔ چمک میں دمک بن کر اس طرح عشق کی زہریلی ناگن کی طرح بل کھا کر آئی کہ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس زہریلی ناگن نے آتے ہی لنکران کو ڈس لیا۔ میں عمر بھر وہ سماں نہ بھولوں گی۔ کہاں تو یہ عالم تھا اور کہاں یہ کہ سر مونڈ کر سچ مچ کوے ہکنی کا خطاب دے کر اس کو کتے کی طرح زنجیر سے باغ میں بندھوا دیا گیا۔"

زرین خاں نے اتنا کہا۔ ان کے سینہ سے ایک دردناک آہ نکلی۔ ایک آنسو تو ٹپ سے گرا، میں نے دیکھا لیکن باقی وہ پی گئیں۔ بغیر کچھ سنے خاموش اٹھ کر چلی گئیں۔ جہاں پناہ کا حکم تھا اور ان کی ڈیوٹی تھی کہ مجھے آدابِ شاہی اور محل کے قاعدے سکھائیں اور علیحدگی میں تعلیم دیں۔ شاید میرے لئے یہ بہترین تعلیم تھی۔

(عظیم بیگ چغتائی)

"شاہجہاں"

فہرست مضامین

جلد ۲۴ — **ہمایوں بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء** — **نمبر ۴**

تصاویر:- (۱) سنگدل حسینہ (۲) آئن سٹائن

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے — چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے مع محصول

جہاں نما

دنیا کی اقتصادی کانفرنس - دنیا کی اقتصادی کانفرنس بھی حسب معمول ناکام رہی اور اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہندوستان کی طرف سے اس کانفرنس میں کوئی نمائندہ شامل نہ ہوا تھا کیونکہ اہل ملک کو اپنے نمائندے خود منتخب کرنے کا موقع نہ دیا گیا تھا اور اس صورت میں ہندوستان کو اپنے مفاد کی حفاظت کی بہت کم امید ہو سکتی تھی۔ دوسرے ممالک جنہیں اپنے نمائندے خود منتخب کرنے کا اختیار تھا وہ اگر ناکام رہے تو اس کا ذمہ دار خود اُن کا باہم دگر طرز عمل تھا۔ خود غرضی اور رقیبانہ ناسازداری کی فضا میں دنیا کسی مشترک مفاد کو حاصل نہیں کر سکتی۔ ذیل کے کارٹون میں جو ہم ایک انگریزی رسالے سے نقل کرتے ہیں، دنیا کی اقتصادی کانفرنس پر نہایت قابلیت سے روشنی ڈالی گئی ہے یہ امر غور طلب ہے کہ کیا کانفرنسوں کی ناکامی کا باعث عموماً ایک ہی نہیں ہوتا؟

لارڈ رپن کی معتمدی سے گورڈن کیوں مستعفی ہوا؟ جنرل گورڈن کے مستعفی ہونے کا واقعہ "تہذیب" کی دروغ بافیوں کی بہت عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ جنرل گورڈن نے مشہور وائسرائے لارڈ رپن کے پرائیویٹ سیکرٹری کا عہدہ قبول کیا لیکن بمبئی وارد ہونے سے تین دن بعد ہی استعفیٰ داخل کر دیا جب ایک سپاس نامے کے جواب میں جو کسی وفد نے بھیجا تھا گورڈن کو یہ لکھنے کی ہدایت کی گئی کہ وائسرائے نے اسے نہایت دلچسپی سے پڑھا ہے تو گورڈن کو معلوم ہو گیا کہ وہ پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدے کے لئے موزوں نہیں۔ جنرل گورڈن نے لارڈ برسفرڈ سے کہا آپ جانتے لارڈ رپن نے یہ سپاس نامہ قطعاً نہیں پڑھا۔ پھر میں کس طرح یہ بات لکھ سکتا ہوں۔ اس کے بعد گورڈن نے استعفےٰ پیش کر دیا۔

جرمنی کا مختار مطلق ہٹلر

نازی جماعت کے برسرِ اقتدار ہونے سے دنیا کی توجہ اس جماعت کے رہنما ہٹلر کی طرف منعطف ہوگئی ہے مسٹر منیر الدین حیدر آبادی نے ہٹلر کے متعلق ذیل کا مقالہ لکھا ہے جسے امید ہے کہ قارئینِ ہمایوں دلچسپی سے پڑھیں گے۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا، سینئر مسولینی، پریذیڈنٹ روزولٹ اور مسٹر ڈی ولیرا، سیاسی درخت کی مختلف شاخیں ہیں ان میں ایک اڈالف ہٹلر بھی ہے۔

ہرہٹلر بہت دلکش انسان ہے، صنفِ نازک کا گروہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ وہ ایک زبردست مقرر اور ماہرِ نفسیات ہے، خانگی زندگی میں وہ اسی طرح گفتگو کرتا ہے جیسے ایک بڑے مجمع کو مخاطب کر رہا ہو۔ ابتدا میں اس کی گفتگو کی رفتار سست رہتی ہے رفتہ رفتہ ایک جوش کے ساتھ اس کی آواز میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اثنائے گفتگو میں اس کی نگاہ کمرے کے کسی گوشہ پر سختی سے جمی رہتی ہے اور زبان سے الفاظ کا دریا بہتا رہتا ہے۔ جوش کے عالم میں وہ اپنے مکّوں سے میز کی مرمت بھی کرتا ہے جس سے سارا ہال گونج جاتا ہے۔ ہٹلر تاثر، دلکشی، جذبہ، غضب اور ضبط کے مجموعہ کا نام ہے! وہ ۴۳ برس پیشتر آسٹریا میں پیدا ہوا تھا اس کے بال سیاہ چمکیلے اور ایک انچ لمبے ہیں۔ رخسار چوڑے اور آنکھیں نیلی ہیں جن میں آگ کی سی چمک ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

اس کا باپ چنگی کا ایک افسر تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ہٹلر بھی اس کی جگہ لے۔۔۔۔ ہٹلر کو آرٹسٹ بننے کا شوق تھا مگر اسے ناکامی ہوئی۔ فنِ معماری میں اس نے قدم رکھا لیکن یہاں بھی ناکامی سے سابقہ پڑا۔ آخر کار اس نے ایک معمولی "ہاؤس پینٹر" کی خدمت پر قناعت کرلی۔

ہٹلر اپنی ابتدائی غربت و افلاس کی داستانیں اب بھی سناتا ہے اور اپنی ماں کے قصے ہر وقت دہراتا رہتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے لڑکوں کی خاطر خود بھی فاقے کیا کرتی تھی۔ جنگِ عظیم کے وقت وہ بویرین رجمنٹ میں شریک ہوگیا تھا وہ اپنی نمایاں قابلیت اور خداداد ذہانت کی بدولت اپنے ہمچشموں میں ایک امتیازی شان کا مالک تھا۔ وہ لڑائیوں میں کئی مرتبہ زخمی بھی ہوا۔ ایک مرتبہ گیس کے اثر سے عارضی طور پر اندھا بھی ہوگیا تھا۔ "آئرن کراس" آج بھی اس کے سینہ پر نمایاں ہیں۔ وہ ہمیشہ کہتا رہتا ہے کہ "میرے ساتھیوں نے مجھے پہچان لیا اب میرا نصب العین ان کا نصب العین ہے اور میرے حوصلے ان کے حوصلے"۔

وہ کہتا ہے "سب سے بڑی قوت دماغ کی قوت ہونی چاہیئے"۔

اس کے ابتدائی پیرو معمولی تجار، دہقان، غریب اہلکار اور مفلس خاندانوں کے افراد تھے۔ ہٹلر مذہباً رومن کیتھولک ہے اس میں مذہبی جوش حد سے زیادہ ہے معلوم نہیں کیوں؟ لیکن وہ کہتا رہتا ہے کہ "میری ماں نے مجھ میں یہ جوش پیدا کیا"۔

ہٹلر سے اس کے مکان پر ملنے تو ایک نوجوان "نازی" یونیفارم میں ڈٹا ہوا دروازہ کھولے گا جوں ہی آپ کمرہ میں داخل ہونگے دیواروں پر مختلف چیدہ تصاویر دکھائی دینگی۔ اُن میں سے اکثر خود اس کے اپنے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ہیں اور یہ اس کی گزشتہ ناکامیوں کا مرقع پیش کرتی

ہیں۔ وہ آرٹ کا اب بھی دلدادہ ہے اور کہتا ہے "میں ایک بڑا آرٹسٹ ہوجاتا، لیکن مجھے موقع نہیں ملا"۔ مگر پھر اپنے دوستوں کو مخاطب کر کے یہ بھی کہتا ہے کہ "میں اپنے موجودہ مشن میں کبھی ناکام نہ ہوں گا"۔

اس کو تمباکو سے ازحد نفرت ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی تمباکو استعمال نہیں کیا۔ وہ سادہ غذا کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کا ناشتہ صرف کافی کی ایک پیالی ہے وہ بھی اس لئے کہ کام کرتے ہوئے تھکن محسوس نہ ہو۔ اس کا لباس حتی الامکان سادہ ہوتا ہے۔ اس کے پاس نیلے سرج کا ایک سوٹ ہے جو ہر مجلس میں اس کے زیب بدن نظر آتا ہے ــــــــ ہٹلر ابھی تک مجرّد ہے اگرچہ عورتیں اس سے محبت کرتی ہیں لیکن وہ اپنے فرصت کے لمحات مطالعہ میں صرف کرتا ہے، اس کے ہاں جرمن فلاسفی کی بہت سی کتابیں ہیں۔ وہ خصوصیت سے ٹامس کارلائل کی تصانیف کا بھی دلدادہ ہے۔

ہٹلر کا ایک من بھاتا مشغلہ "تیز رفتاری" ہے۔ تیز رفتاری سے اس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ کشادہ سڑکوں پر اپنی موٹر دوڑاتا ہے۔ تنہائی کو بہت زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ موٹر میں کسی قسم کا نقص ہو تو وہ بخوشی اپنے ہاتھوں سے ٹھیک کرلیتا ہے۔ بعض وقت ہنستے ہوئے کہتا ہے کہ "مجھے مکینکل انجینیر ہونا چاہیئے"۔

تعطیل کے روز ہٹلر بویریا کے پہاڑوں میں نکل جاتا ہے، پہاڑوں کی خوبصورتی اُن کی عظمت و وقعت کو دیکھ کر اس کو مسرت ہوتی ہے۔ ہٹلر ہمیشہ "رفتار" و "قوت" کا طالب رہا ہے۔ اس کا وجود افسانوی (Romantic) ہے تصاویر کے خوبصورت مناظر پر اس کی نظریں ادھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں ہٹلر بڑے بڑے خیالات باطل باندھتا ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ کہتا ہے کہ "میرے ارادوں کا ذکر کوئی نہ کرے اور نہ میرے ارادوں کو کوئی چرائے"۔

ہٹلر ایک سیاسی آدمی ہے۔ اس حیثیت میں وہ آپ سے لڑے گا بھی لیکن خانگی زندگی میں وہ آپ کے ساتھ دوستوں کی طرح برتاؤ کرے گا۔ اگر پلیٹ فارم پر آپ سے کسی معاملہ میں اختلاف رائے ہوجائے تو اس کے ہاتھ حرکت کرنے لگ جاتے ہیں، میز پر مکّوں کی بارش کرنے لگتا ہے۔ دوستی ختم ہو جاتی ہے۔

ہٹلر ایک وفادار دوست ہے۔ اس کے دوست اس کو ایک طاقتور آدمی سمجھتے ہیں اور دشمن اس کو ایک "غیر معقول چھوٹا آدمی" سمجھتے ہیں۔

اس کے چھوٹے سے مکان میں نہ کوئی طاقت ور آدمی نظر آتا ہے اور نہ کوئی زبردست طلسمی شخصیت، بلکہ ایک دلکش انسان۔ محبِ وطن، سرفروش اور خود پرست آدمی نظر آتا ہے۔ اسے چاہے آپ خوبصورت اڈالف کہہ لیں یا پریذیڈنٹ ہٹلر!

تصویر

"رائل اکیڈمی" کی ایک نفیس تصویر ہے جس میں مصوّر (جی۔ ایس۔ ڈالٹن) نے کیٹس کی مشہور نظم "لابیل دام سانز مرسی" (سنگدل حسینہ) کو متشکّل کیا ہے۔ یہ نظم کیٹس نے مئی ۱۸۱۹ء میں کہی تھی۔ نقاد کہتے ہیں کہ یہ نظم اس نے فینی بران کی تباہ کن محبت اور اس کی بے مہری و بے وفائی سے متاثر ہو کر لکھی تھی اور یہ قرین قیاس بھی ہے کیٹس اس کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا وہ پہلے ہی نحیف و نزار تھا اس پر محبت کی ناکامی نے اس کی رہی سہی طاقت بھی سلب کر لی اور ۲۲ فروری ۱۸۲۰ء کو وہ ۲۵ سال کی عمر میں سل کی مرض سے انتقال کر گیا۔

یورپ کی شمالی اقوام میں جو قصے کہانیاں رائج ہیں ان میں ایک ایسی مخلوق کا ذکر بھی آیا ہے جس کے جسم کا بالائی حصہ حسین عورتوں سے مشابہ ہوتا تھا اور نیچے کا دھڑ مختلف۔ اس قسم کی عورتیں جنگلوں میں راہ گیروں کو عشوہ و ناز سے اپنے دام محبّت میں گرفتار کر لیتی تھیں اور وہ وہیں بھٹکتے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل تباہ و برباد ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اس قسم کی عورتیں قوتِ گویائی سے محروم ہوتی تھیں :۔

سنگدل حسینہ

"اے سلح بند نوجوان! تو افسردہ و تنہا کیوں بھٹکتا پھرتا ہے۔ تیرا چہرہ غم سے زرد ہو رہا ہے۔
بہار گزر چکی، جھیل کے کنارے کی سبز گھاس خشک ہو گئی اور پرندے اپنا گیت ختم کر چکے۔
آہ اے بدنصیب تیرے پژمردہ چہرے پر یہ رنج و غم کے آثار کیسے ہیں؟
دنیا سرور و شاد کام ہے۔ گلہری نے سال بھر کے لئے دانے کا ذخیرہ جمع کر لیا اور کسان اپنی فصل کاٹ چکے۔
تیری پیشانی کے کنول کا رنگ فق ہوا جاتا ہے اور اس پر اندوہ و یاس کی اوس پڑی ہوئی ہے اور تیرے عارض پر گلاب کا ایک خزاں رسیدہ پھول دیکھتے دیکھتے مرجھائے جا رہا ہے۔"

———

"میں مرغزار میں ایک حسین خاتون سے دوچار ہوا، وہ پری زاد معلوم ہوتی تھی، اُس کے بال لمبے لمبے تھے، اس کی رفتار ہلکی اور اس کی آنکھیں جنگلی ہرنوں کی طرح وحشی تھیں۔

میں نے اُسے اپنے سُبک رَو گھوڑے پر بٹھا لیا۔ تمام دن وہ میری آنکھوں کے سامنے رہی اور مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ گھوڑے پر کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف جھکتی اور پریوں کا کوئی پُراسرار گیت گاتی۔

میں نے اُس کے سر کے لئے پھولوں کا ایک تاج بنایا، اُس کے ہاتھوں کے لئے پھولوں کے گجرے اور اس کی کمر کے لئے پھولوں کا ایک پٹکا۔

جب وہ میری طرف دیکھتی، یوں معلوم ہوتا کہ اُس کی آنکھوں میں محبت کا رس بھرا ہوا ہے۔ اور وہ میٹھے میٹھے نالے کرتی تھی۔

اُس نے مجھے خودرو پھول پھل میٹھا میٹھا شہد اور جنگل کی قدرتی نعمتیں لا کر دیں اور یقیناً کسی عجیب و غریب اور نامعلوم زبان میں یہ بھی کہا کہ مجھے تم سے سچی محبت ہے۔

وہ مجھے اپنے پریوں کے مسکن میں لے گئی۔ وہاں اُس نے مجھ پر اپنی پُرشوق نگاہیں جما دیں اور لمبی لمبی سرد آہیں بھریں۔

میں نے اُس کی غمگین اور وحشی آنکھوں کو نرمی سے بند کیا اور اُن کو چوم چوم کر اُسے سلا دیا۔

وہیں گھاس کے بچھونے پر ہم اونگھنے لگے اور آہ وہیں پہاڑ کی ٹھنڈی زمین پر میں نے وہ آخری خواب دیکھا۔ جس کے بعد میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے نیند سے محروم ہو گئیں۔

مجھے زرد رُو بادشاہ، زرد رُو شہزادے اور زرد رُو سپاہی نظر آئے، اُن سب کے چہروں پر موت کی سی زردی چھا رہی تھی۔

وہ بیک زبان کہہ رہے تھے کہ سنگدل حسینہ نے تجھے اپنا حلقہ بگوش بنا لیا ہے۔

میں نے جھٹپٹے کے دھندلکے میں اُن کے ہونٹوں کو دیکھا جن پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور جو کسی خوفناک انتباہ کے لئے پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں چونک کر اُٹھا اور میں نے اپنے آپ کو پہاڑ کی ٹھنڈی زمین پر یہاں تنہا پایا۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے یہاں ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور افسردہ و تنہا بھٹکتا پھرتا ہوں، حالانکہ جھیل کے کنارے کی سبز گھاس خشک ہو گئی اور پرندے اپنا گیت ختم کر چکے ہیں۔"

آئن سٹائن

میرے نزدیک آئن سٹائن کی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ وہ اپنے اُن انکشافات سے جنھوں نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے اپنے فلسفۂ حیات کی تشکیل نہیں کرتا۔ اس کے نظریۂ اضافیت نے اُن تمام لوگوں کو جو قطعی معیاروں کے منکر ہیں اور جو تمام قدروں کے تغیر پذیر ہونے پر اصرار کرتے ہیں نہایت زبردست دلائل بہم پہنچاتے ہیں لیکن آئن سٹائن فلسفے میں اضافیت کے استعمال کی کسی قدر سختی کے ساتھ مخالفت کرتا ہے۔

جارج سلوسٹر ویرک

اضافیت!

اِس لفظ سے بڑھ کر اِس دور کی خصوصیت کو اور کونسا لفظ بیان کرسکتا ہے؟

کسی معاملے میں بھی قطعیت اب ہمارا شعار نہیں ہے۔ ہر چیز کو ہم اضافیت کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں! اضافیت ہر فلسفی طبیعت کا کھلونا ہے۔

ہمارے عہد کا کون سا معیار ہے کہ جس پر اعتراض نہ کیا گیا ہو؟ کیا اخلاقیات، معاشیات یا قانون کا کوئی ایسا مطلق نظام ہے جس کے ثبات و استحکام پر کہیں حملہ نہ کیا گیا ہو؟

کیا ایک ایسی دنیا میں جہاں تکون کے تین زاویوں نے دو قائمہ زاویوں کے برابر ہونا چھوڑ دیا ہو اور ایک ایسی دنیا میں جہاں وقت اپنا مفہوم کھو چکا ہو، جہاں لامحدودیت محدود ہوگئی ہو اور محدود لامحدود میں گم ہوچکا ہو کوئی مستقل قدر یا کوئی مطلق صداقت موجود ہو سکتی ہے؟

آئن سٹائن کو اُن نئے نئے نظریوں کے تسلیم کرنے سے انکار ہے جن کی بنا اُس کے نظریۂ اضافیت کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے کہا "اضافیت کے معنی عام طور پر غلط سمجھے گئے ہیں فلسفی اس لفظ کے ساتھ اس طرح کھیلتے ہیں جس طرح ایک بچہ کھلونوں کے ساتھ کھیلتا ہے! اضافیت میرے نزدیک صرف یہ ظاہر کرتی ہے کہ بعض طبعی اور حیلی حقیقتیں، جن کو قطعی اور مستقل سمجھا جاتا رہا ہے طبیعات اور علمِ حیل کی دنیا میں بمقابلہ بعض دوسری حقیقتوں کے اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زندگی کی ہر بات اضافی ہے اور ہم تمام دنیا کو اپنی شرارت سے تہ و بالا کر دینے کا حق رکھتے ہیں"۔

مجھے اب یاد آگیا کہ آج سے چند سال پہلے جب میں پہلی مرتبہ آئن سٹائن سے نیویارک میں ملا تھا تو اُس نے فلسفی کہلانے

ا؎ Mechanics ۲؎ Mechanical

سے نہایت شدومد کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا "میں صرف ایک طبیعی ہوں"۔ باوجود اس انکار کے آئن سٹائن کو اس عہد کے ساتھ ایک نسبتِ خصوصی ہے ——— اِس عہد کے ساتھ جس کے اندر حکمت اور فلسفے کے ہر حلقے میں مطلق کے خلاف ایک جنگ ہو رہی ہے۔

نپولین کی طرح اور مسولینی کی طرح البرٹ آئن سٹائن نے اپنی زندگی ہی میں اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ اس کا نام ایک افسانوی ہستی کی طرح لیا جانے لگا ہے۔ کوپرنیکس، گلیلیو اور نیوٹن سے بڑھ کر اب تک کسی نے کائنات کے متعلق ہمارے خیالات میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کیں۔ آئن سٹائن کی کائنات محدود ہے۔ آئن سٹائن کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو زمان اور مکان بالکل آپس میں تبدیل ہو جانے والی حدود[۳] معلوم ہوتی ہیں وقت ایک چوتھا بعد[۴] نظر آنے لگتا ہے۔ مکان جو کبھی ایک غیر معین حیثیت رکھتا تھا آج اُس نے ایک کرہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آئن سٹائن نے ہمیں بتایا ہے کہ روشنی خم کھا کھا کر سفر کرتی ہے۔ یہ تمام نتائج آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت سے پیدا ہوئے ہیں جسے اُس نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۵ء کو پرشین اکیڈیمی آف سائنس کے سامنے پیش کیا۔

آئن سٹائن کی آمد کے ساتھ ریاضی اقلیدس کے ڈھنگ پر ایک معین علم نہیں رہا۔ نئی ریاضی نے جنگِ عظیم کے دوران میں جنم لیا تھا۔ بالکل ممکن ہے کہ انسانی خیال کے ارتقا میں آئن سٹائن کا انکشاف جنگِ عظیم سے بڑھ کر حصہ لے اور اس کی شہرت فوش اور لوڈنڈارف اور لوبن اور کلیمانسو سے زیادہ دیر تک زندہ رہے۔

کہا گیا ہے کہ صرف دس آدمی آئن سٹائن کے نظریے کو سمجھتے ہیں۔ میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دس میں سے ایک میں بھی ہوں۔ جب آئن سٹائن نے اپنے نشست کے کمرے میں چند آسان مثالیں دے کر اس کی تشریح کی تھی تو میں اس کو ہر پہلو سے کامل طور پر سمجھ گیا تھا۔ لیکن مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دوسرے ہی دن میں اس کو بالکل بھول گیا۔ اب جس وقت تک اس نظریے کو سمجھنے والا ایک اور آدمی پیدا نہ ہو جائے میں کہوں گا کہ دنیا میں صرف نو آدمی ہیں جو آئن سٹائن کو سمجھتے ہیں۔

آئن سٹائن کمال صبر کا مالک ہے۔ اُسے اپنے نظریات کی تشریح کرنے میں لطف آتا ہے وہ ایک پیدائشی استاد ہے۔ وہ سوالات کو کبھی رد نہیں کرتا۔ اُسے بچوں سے محبت ہے۔ ایک دوست کے دہ سالہ بیٹے کو یقین ہو چکا تھا کہ اس نے حرکتِ دائمی کا راز معلوم کر لیا ہے۔ آئن سٹائن نے نہایت محنت سے اسے سمجھا دیا کہ اس کی تحقیقات میں کس جگہ غلطی ہوئی ہے۔

جب کبھی اُس کے سامنے کوئی ایسا سوال آتا ہے جس میں ریاضی کا کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہو تو وہ جھٹ پنسل ہاتھ میں لے لیتا ہے اور نہایت پیچیدہ مساواتوں[۵] سے صفحوں کے صفحے سیاہ کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ نصاب کی کسی کتاب سے مدد نہیں لیتا بلکہ ضرورت کے مطابق ضابطے[۶] برمحل وضع کر لیتا ہے۔ آئن سٹائن کا اس طرح وضع کیا ہوا ضابطہ ایسا صاف، ایسا آسان اور ایسا مکمل ہوتا ہے

[۳] Terms. [۴] Dimension. [۵] equations. [۶] Formulae.

کہ کتابوں میں نہیں مل سکتا۔

حال ہی میں ایک شخص نے اُن سے رنگ کی فوٹو گرافی کا ذکر کیا۔ آئن سٹائن نے اُسی وقت اس موضوع پر غور کرنا شروع کر دیا کیمرے کا مطالعہ کیا، چند تخمینے لگائے اور زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس نے رنگین تصویریں کھینچنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا۔

جب وہ عوام کے لئے کوئی مضمون لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے لئے اپنے نظریات کی تشریح مشکل ہو جاتی ہے لیکن جب کوئی عام آدمی رُو در رُو اُس سے اپنی مشکلات کا ذکر کرتا ہے تو یہ عظیم الشان ریاضی دان عموماً اپنی واضح مثالوں سے اُس کی تشفی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ یکایک ایک تجلی کی طرح مجھے نہ صرف بُعد چہارم بلکہ کئی اور بُعد بھی نظر آنے لگے۔ اپنی کامیابی کی خوشی میں سرشار میں کبھی کبھی کوئی فقرہ یادداشت کے طور پر لکھتا جاتا تھا لیکن بعد میں جب میں نے اِن فقرات کے سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ کوئی خواب ہو جس کے رشتۂ خیال میں ہزاروں گرہیں پڑ گئی ہوں۔

میں نے کہا تھا "مجھے بتائیے کہ میں بُعد چہارم کا ایک دھندلا سا تصور کیسے قائم کر سکتا ہوں؟"

آئن سٹائن نے جواب دیا "ایک ایسے نظارے کا تصور کیجئے جس میں دو بُعد ہوں مثلاً ایک تصویر جس میں ایک شخص ایک بنچ پر بیٹھا ہوا ہو۔ بنچ کے سامنے ایک درخت کھڑا ہے۔ پھر فرض کیجئے کہ شخص بنچ سے اُٹھ کر ایک چٹان کی طرف جاتا ہے۔ وہ چٹان کے پاس اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ درخت کے سامنے یا درخت کے پیچھے کا فاصلہ طے نہ کرے۔ یہ دو بُعدی جگہ میں ناممکن ہے۔ وہ صرف تیسرے بُعد میں سے گزر کر چٹان تک پہنچ سکتا ہے۔

اب اُسی بنچ پر ایک اور آدمی بیٹھا ہوا فرض کیجئے۔ یہ دوسرا آدمی وہاں کیسے پہنچ گیا؟ چونکہ دو جسم ایک ہی جگہ کو ایک ہی وقت میں نہیں گھیر سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دوسرا شخص پہلے شخص سے قبل یا بعد اس بنچ پر بیٹھا ہو۔ دوسرے الفاظ میں اس نے ضرور وقت میں حرکت کی ہوگی۔ وقت چوتھا بُعد تھا"۔

"اسی طرح پانچویں چھٹے اور اس سے زیادہ ابعاد کی توضیح کی جا سکتی ہے ریاضی کے بہت سے مسائل لا انتہا ابعاد کو تسلیم کر کے آسان ہو جاتے ہیں"

میں نے پانچویں بُعد کے متعلق بھی آئن سٹائن سے دریافت کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ مجھے اُس کا جواب اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ اُس نے کچھ اس طرح کی بات کہی تھی کہ ایک گیند پھینکی گئی جو زمین کے دو سوراخوں میں سے ایک سوراخ میں گم ہو سکتی ہے۔ ان میں سے ایک بُعد پانچواں اور دوسرا چھٹا بُعد ہے!

میرا خیال ہے کہ آئن سٹائن کا ۱۹۲۹ء والا انکشاف جس میں اُس نے کائنات کی تشریح برقی مقناطیسیت کے ذریعہ سے کی ہے نسبتہً آسانی سے سمجھ میں آ جانے والا ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی آئن سٹائن خود اپنے آپ کو پورے طور پر اس کا قائل نہیں کر سکا۔ وہ اُن چھ صفحات کو جنہوں نے ساری دنیا کو چونکا دیا اور جن کی نقل چشم زدن میں ابھی تک کوئی کے ہر جگہ پہنچ گئی فیصلہ کن

قرار نہیں دیتا۔

اس نظریہ کی تکمیل کےبعد آئن سٹائن کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ قوت جاذبہ کو برق سے تعبیر کرے۔ اس مقصد کے لئے جس ضابطے کی اُسے ضرورت پڑی وہ اس قدر مشکل تھا کہ اُس کے معنی کی تشریح کے لئے اُسے اعلیٰ ریاضی کا ایک نیا قاعدہ وضع کرنا پڑا۔ آئن سٹائن کا نیا قاعدہ اقلیدس اور ریمین کا جھگڑا چکا دیتا ہے۔ یہ متوازی خطوط کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، ریمین نے ان کے وجود سے انکار کیا تھا۔

ریمین کا قول ہے کہ ایک مستدیر دنیا میں متوازی خطوط موجود نہیں ہوسکتے۔ آئن سٹائن نے بُعد چہارم کی مدد سے متوازی خطوط کا وجود دوبارہ دریافت کیا ہے۔ مجھ سے تفصیلاً اس کے متعلق دریافت نہ کیجئے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے بیان کے لئے پیچ در پیچ مساواتوں کے ایک ایسے سلسلے کی ضرورت ہے جس کا استحضار کوئی انسان حتیٰ کہ خود آئن سٹائن بھی نہیں کرسکتا۔

آئن سٹائن نے مجھ سے کہا "کوئی شخص چاروں ابعاد کا استحضار نہیں کرسکتا، یہ صرف ریاضی کے رُو سے ممکن ہے۔ بلکہ ہم تین ابعاد کا استحضار بھی نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "لیکن کیا آپ چاروں ابعاد کو مدِ نظر رکھ کر فکر نہیں کرتے؟"

اُس نے جواب دیا "میں چاروں ابعاد کو مدِ نظر رکھ کر فکر کرتا ہوں لیکن صرف تصوراتی حیثیت سے۔ انسانی قلب اُسی قدر ان کا تصور کرسکتا ہے جتنا کہ وہ برق کا کرتا ہے لیکن یہ برقی مقناطیسیت ہی کی طرح حقیقی ہے جو ایک ایسی قوت ہے جس سے ہماری اس کائنات کا ضبط و نظام وابستہ ہے اور جس کے اندر اور جس کی وجہ سے ہمارا وجود قائم ہے۔"

"مجھے خصوصیت کے ساتھ آپ کے اُس نظریے سے دلچسپی ہے جو ثابت کرتا ہے کہ قوتِ جاذبہ اور برق ایک ہی شے ہیں یقیناً ایسے چند صفحات کبھی نہ لکھے گئے ہوں گے جنھوں نے انسانی خیال میں ایسا زبردست انقلاب پیدا کردیا ہو۔"

آئن سٹائن نے ایک شرارت آمیز مسکراہٹ لبوں پر لاکر کہا "بدقسمتی سے میرا آخری نظریہ ابھی صرف ایک قیاس مفروض ہے جس کا ثابت کرنا ابھی باقی ہے۔ یہ میرے نظریۂ اضافیت سے مختلف ہے جس کی بعض دوسرے محققین نے بھی تصدیق کی ہے اور جسے اب قطعی طور پر ثابت شدہ سمجھنا چاہیئے۔"

اُس کے چہرہ پر پھر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اُس کی آنکھوں سے چل کر اس کے رخساروں کی طرف آئی اور اُن مونچھوں میں غائب ہوگئی جو اُس کے سر کے اُلجھے ہوئے بالوں سے کسی قدر کالی ہیں۔

بیگم آئن سٹائن نے ہمارے گلاس سٹرابری کے رس سے بھر دیئے اور پھلوں کی اور بہت سی قاشیں ہماری طشتریوں میں

Visualization ؎ Curved ؏ Reimann ؂ Gravity ؃ + Hypothesis ؄

ڈال دیں۔ آئن سٹائن کسی قسم کی شراب نہیں پیتا، لیکن تمباکو کی خواہش کو وہ روک نہیں سکتا۔ لڑکوں کی طرح وہ اِس کثرت سے سگرٹ پیتا ہے کہ جتنے اُس کی صحت کے لئے بھی اچھے نہیں ہیں۔ اس شخص کے پاس بیٹھ کر جس کا نام اس وقت ہر زبان پر ہے اور جس کے خیالات کو بمشکل کوئی کوئی سمجھ سکتا ہے سٹرابری کا رس پینے اور پھلوں کی سلاد کھانے میں ایک خاص لطف ہے۔

آئن سٹائن کی بیوی اُس کی عم زاد بہن اور اُس کے کام میں اُس کی مددگار ہے اُن کی قریبی رشتہ داری اُن کی پیشانی کی مشابہت سے ظاہر ہے۔ اُن کے باپ بھائی بھائی تھے اور اُن کی مائیں بہنیں بہنیں تھیں بیگم آئن سٹائن نے نہایت آہستگی کے ساتھ کہا "میں اپنے شوہر کے لئے وہ سب کچھ ہوں جو میں ہو سکتی ہوں"۔

آئن سٹائن اور اس کی بیگم نے یکجا پرورش پائی۔ ابتدا ہی سے وہ ایک دوسرے کے دوست تھے جب قسمت نے انہیں نوجوانی ہی میں جدا کر دیا تو آئن سٹائن نے ایک قابل ریاضی دان خاتون سے شادی کر لی جو سربیا کی رہنے والی تھی اپنی پہلی بیوی سے اس کے دو بچے تھے اسکے بچپن کی رفیق موجودہ بیگم آئن سٹائن نے بھی شادی کر لی اور چند بچوں کی ماں بن گئی۔ چند ہی سال کے بعد اُس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ پھر ایک قوت نے جو آئن سٹائن کی اُن قوتوں سے زیادہ طاقت ور ہے جن کو وہ اپنی حرکی مساوات میں اسیر کیا کرتا ہے اُن دونوں کو کھینچ کر ملا دیا۔ آئن سٹائن نے اپنی حساب دان بیوی سے طلاق حاصل کر کے اپنی عم زاد بیوہ بہن سے شادی کر لی۔ شاید یہ ایک غلطی ہے کہ ایک طبیعی ایک ریاضی دان سے شادی کرے۔ ایک گھر میں دو فاصلوں کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی۔

آئن سٹائن کے چہرے پر اور اُس کے دل پر اِس عہد کے ہنگاموں اور مصیبتوں کے نشان ثبت ہو گئے ہیں۔ اپنی پہلی بیوی سے آئن سٹائن کے تعلقات اب تک دوستانہ ہیں۔ اُسے اپنی پہلی شادی کی اولاد سے گہری محبت ہے اور اُس نے اپنی موجودہ بیوی کی پہلی اولاد کو بھی اپنا متبنّیٰ بنا لیا ہے۔

کشمکشِ حیات کی کوئی شکایت آئن سٹائن کی زبان پر نہیں۔ اُس کے چہرے کی ہر شکن سے مہربانی کا جذبہ نمایاں ہے۔ اُس کی صورت سے شدید غرور کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں اُس کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر بلدیہ برلن نے ایک نفیس مکان اور باغ تحفے کے طور پر پیش کیا۔ سوئے اتفاق سے بعد میں یہ معلوم ہوا کہ یہ مکان اور باغ بلدیہ کی ملکیت نہ تھا۔ اس پر انہوں نے اسے ایک قطعۂ زمین پیش کیا۔ لیکن اس کی ملکیت میں بھی کچھ نقص نکل آیا۔ نمائندگان شہر سخت پریشان ہوئے اور انہوں نے اسی گھبراہٹ کے عالم میں ایک تیسرا قطعۂ زمین تحفے کے طور پر پیش کیا جس کے متعلق اُن کا استحقاق پہلے کی بہ نسبت کچھ کم مشتبہ نہ تھا۔ آئن سٹائن نے طیش میں آکر اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے اپنے گاڑھے پسینے کے کمائے ہوئے روپے سے ایک تفریحی مکان تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو ایک دوست نے بلدیہ والوں کی حماقت کی تلافی کرنے کے خیال سے اُسے مکان کے لئے زمین کا ایک گرانقدر تحفہ

Dynamic لہ[12]

پیش کیا لیکن آئن سٹائن نے اُس کے لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا "میں ایک جماعت سے تحفہ قبول کر سکتا ہوں لیکن میں ایک فرد سے ایسی گراں بہا چیز قبول نہیں کر سکتا۔ ہر تحفہ جو ہم قبول کرتے ہیں ایک بندھن ہوتا ہے بعض اوقات مُفت کی حاصل کی ہوئی چیزوں کے لئے ہمیں سخت خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے۔"

اگرچہ آئن سٹائن اس وقت دنیا کا مشہور ترین حکیم ہے لیکن وہ اپنی شہرت کو حصولِ زر کا ذریعہ بنانے سے سخت نفرت کرتا ہے۔ جب اُس سے ایک امریکن سگریٹ پر دستخط کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ ہنس پڑا اور دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ صرف اپنا نام لکھنے کے لئے اُسے اتنا روپیہ پیش کیا جا رہا تھا کہ اس کے مکان کی تعمیر کے مصارف کے لئے مکتفی ہو جاتا۔ یہ سمجھ کر کہ اس کی ناموری نے اسے دوسرے لوگوں سے الگ کر دیا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے بہرصورت اپنی روح کی پاکیزگی کو برقرار رکھنا چاہیئے۔ ملاقاتیوں سے بچنے کی وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اُس کی حجاب پسند طبیعت اسے تنہا رہنے پر مجبور کرتی ہے اور اُس کی بیوی اس کام میں اُس کی ممد و معاون ہے۔ جب پیشکشوں اور فرمائشوں کے طوفان کو وہ روک نہیں سکتا اور مغلوب ہو جاتا ہے تو وہ اکثر خطوں کا جواب نہیں دیتا خواہ وہ بعض نامی شخصیتوں کی طرف سے موصول ہوئے ہوں لیکن وہ اپنے دوستوں کی ذرا سی بات کا جواب دینا بھی فرض سمجھتا ہے۔ اُس نے اپنے نظریات کو ایک کتابی صورت میں شائع کرنے یا عوام کے لئے اپنی ایک سوانح عمری لکھنے سے انکار کر کے بڑے بڑے شاہانہ پیشکشوں کو رد کر دیا ہے۔ اُس نے بار بار مجھ سے کہا "میں اپنے علم کو حصولِ زر کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتا۔ میں اپنی عظمت کو فروخت نہیں کرنا چاہتا۔"

عام طور پر لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ پروفیسر آئن سٹائن محض ایک اعلیٰ درجے کا ریاضی دان ہی نہیں بلکہ اُسے مسائلِ صنعت و حرفت کے عملی حل سے بھی بہت دلچسپی ہے۔ اُس کا دماغ جبلّی طور پر اُن نتائج کو اخذ کر لیتا ہے جن سے معمولی انجینیر اکثر محروم رہتے ہیں۔ اسی قسم کے کام کی بدولت اُس نے تھوڑا سا روپیہ پیدا کر لیا ہے اور وہ مکان بنایا ہے جس میں وہ برلن والوں کا ممنونِ احسان ہوئے بغیر اپنی زندگی بسر کر رہا ہے۔

آئن سٹائن ریاضی اور صنعت و حرفت کے اُن سوالات پر جو حل کرنے کے لئے اُسے موصول ہوتے ہیں اپنے بالاخانے کی تنہائی میں غور کرتا ہے۔ اُس کے کمرے کا فرنیچر نہایت پرانی وضع کا ہے جسے مدتیں ہوئیں اُس نے اپنی پہلی پہلی آمدنی میں سے خریدا تھا۔ مجھے اُس کے نہاں خانے میں عجیب و غریب آلات اور نادر و نایاب کتابیں دیکھنے کی امید تھی۔ مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوتی اگر اُس کی شکل زمانہ وسطیٰ کے کسی جادوگر کے غار کی طرح ہوتی لیکن اسے دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ اس میں چند کتابیں ہیں اور چند تصویریں فیبر ڈے، میکسول، نیوٹن کی تصویریں۔ نہ مجھے کہیں دائرے نظر آئے اور نہ تکونیں۔ آئن سٹائن کا واحد آلہ اُس کا سر ہے۔ اُسے کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ اُس کا دماغ اُس کی لائبریری ہے۔

بالاخانے پر بیٹھ کر آئن سٹائن کی نظروں کے سامنے مکانوں کی چھتیں ہی چھتیں ہوتی ہیں چھتوں کا ایک سمندر اور آسمان۔ یہاں وہ ہوتا ہے اور اُس کے خیالات یہیں اُس کے دماغ سے وہ نظریے پیدا ہوئے جنہوں نے حکمتِ جدیدہ میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہاں اُس کے خیالات کی پرواز کو کوئی انسانی مداخلت نہیں روک سکتی۔ یہاں تک کہ اُس کی بیوی بھی اِس بیت المقدس میں بے کھٹکے داخل نہیں ہو سکتی۔

لیکن آئن سٹائن ہر وقت مطالعہ میں مصروف نہیں رہتا۔ بلکہ وہ ایک زندہ دل آدمی ہے جسے آبی کھیلوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ اُس کا محبوب کھلونا ایک بادبانی کشتی ہے جو نئے زمانے کی تمام اصلاحات سے آراستہ ہے۔ جب وہ اپنے سر کے گرد نہایت بے ترتیبی سے تولیا باندھ کر سیر کو جاتا ہے تو ایک عظیم الشان یونیورسٹی کا پروفیسر معلوم ہونے کے بجائے وہ ایک بحری ڈاکو سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتا ہے جب وہ ہوا کے ساتھ مصروفِ جنگ ہوتا ہے تو اضافیت اور بُعدِ چہارم کا اُسے خیال تک نہیں ہوتا۔

ایک مفکّر، ایک انجنیئر، ایک کھلاڑی اور ایک آرٹسٹ ہونے کی حیثیت سے آئن سٹائن ترقی کے یونانی مطمحِ نظر کے قریب پہنچ چکا ہے۔ جب وہ کشتی نہیں چلاتا اور بُعدِ چہارم کی سیر سے بھی فارغ ہوتا ہے تو وہ اپنا رباب بجانے لگتا ہے۔ میں اُس کے دروازے پر کھڑا اجازت کا انتظار کر رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کہیں سے بحری موسیقی کی آواز آ رہی ہے۔ غالباً آئن سٹائن اپنا رباب بجا رہا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو وہ رباب کو اس طرح لپیٹ رہا تھا جیسے ماں رات کے وقت اپنے بچے کو لحاف میں لپیٹتی ہے۔

آئن سٹائن کی شکل ایک ریاضی دان کی بہ نسبت ایک مغنّی سے زیادہ ملتی ہے۔ اُس نے ایک تبسّم کے ساتھ جو نصف آرزو اور نصف معذرت سے عبارت تھا مجھ سے کہا "اگر میں ایک طبیعی نہ ہوتا تو میں غالباً ایک مغنّی ہوتا۔ میرے خیالات پر اکثر موسیقی کا کیف طاری رہتا ہے۔ میں اپنی زندگی کو بھی موسیقی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں"۔

آئن سٹائن کتابیں بہت کم پڑھتا ہے۔ موجودہ قصّے کہانیوں سے اسے دلچسپی نہیں۔ سائنس میں سے بھی وہ زیادہ تر اپنے مطلب کی چیزوں کے مطالعہ سے کام رکھتا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ "عمر کے ایک خاص مقام پر پہنچ کر پڑھنا دماغ کو تخلیقی سرگرمیوں سے روک دیتا ہے۔ ایک شخص جو بہت زیادہ پڑھتا ہے اور اپنے دماغ کو بہت تھوڑا استعمال کرتا ہے سُست ہو جاتا ہے اور ہمیشہ دوسروں ہی کے خیالات میں منہمک رہتا ہے اُس کی مثال بالکل اُس شخص کی سی ہے جو اپنا بہت سا وقت ناٹک میں صرف کرتا ہو اور دوسروں کے اوضاع و اطوار سے اس قدر متاثر رہتا ہو کہ اپنے طور پر زندگی بسر کرنا ہی اس کے لئے دشوار ہو گیا ہو۔"

اپنے موضوع کے متعلق آئن سٹائن ہر نئی تحقیقات سے گہری دلچسپی لیتا ہے۔ وہ ایک ہی نظر میں مساواتوں کا ایک پورا صفحہ پڑھ جاتا ہے۔ آئن سٹائن ریاضی کے ایک بالکل نئے قاعدے پر آدھ گھنٹے میں پورے طور سے حاوی ہو جاتا ہے۔

(۲)

آئن سٹائن نے کہا "میں اختیار کا قائل نہیں ہوں۔ یہودی اختیار کے قائل ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ انسان خود اپنی زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ میں اس عقیدے کا فلسفے کے رُو سے انکار کرتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں یہودی نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ انسان کم از کم محدود معنوں میں آزاد بھی ہے؟"

آئن سٹائن نے ایک دلکش انداز میں مسکرا کر جواب دیا "میں شوپن ہار سے متفق ہوں کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں کر سکتے ہیں لیکن ہم وہی چاہتے ہیں جو ہمیں چاہنا چاہیئے۔ اس کے باوجود عملی طور پر میں وہی کچھ کرنے پر مجبور ہوں جو اختیار کا متقاضی ہے۔ اگر میں مہذب لوگوں میں رہنا چاہوں تو مجھے یہ ماننا پڑے گا کہ انسان ایک با اختیار ہستی ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ فلسفے کے رو سے ایک قاتل اپنے جرم کا ذمہ دار نہیں لیکن پھر بھی مجھے اپنے آپ کو اس کی ناگوار صحبت سے بچانا چاہیئے۔ میں اُسے بے گناہ سمجھوں تو سمجھوں لیکن میں یہی چاہوں گا کہ میں اس کے ساتھ مل کر چائے نہ پیوں۔"

میں نے کہا "کیا آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے اپنا پیشہ خود انتخاب نہیں کیا۔ بلکہ آپ کے افعال کسی دوسری طاقت نے مقدر کر رکھے تھے جو آپ کے باہر موجود ہے؟"

آئن سٹائن نے جواب دیا "میرا پیشہ بلاشبہ مقدر ہو چکا تھا، اپنی ذات کی طرف سے نہیں بلکہ بعض ایسی طاقتوں کی طرف سے جن پر میرا کچھ اختیار نہیں۔ ان طاقتوں میں سب سے پہلے وہ پُراسرار غدود ہیں جن میں فطرت نے زندگی کی روح پیدا کی ہے، ہمارے اندرونی افرازات[۱۳]۔"

میں نے کہا "آپ غالباً اس بات کو دلچسپی سے سُنیں گے کہ ہنری فورڈ نے بھی مجھ سے ایک دفعہ کہا تھا کہ اُس نے اپنی زندگی کی تعمیر خود نہیں کی بلکہ اُس کے تمام افعال ایک اندرونی آواز کی طرف سے مقدر ہو چکے تھے۔"

آئن سٹائن نے کہا "فورڈ اسے اپنی اندرونی آواز کہہ سکتا ہے، سقراط اس کو اپنی ہمزاد روح کہتا تھا۔ ہم نئے زمانے کے لوگ اسے غدودوں کے اندرونی افرازات کہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر نام اس ناقابلِ انکار حقیقت کی توضیح کرتا ہے کہ انسانی ارادہ آزاد نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیا اس طرح آپ انسانی ترقی کے تمام نفسی عاملین[۱۴] کو دانستہ طور پر نظر انداز نہیں کر دیتے؟ مثلاً تحت شعوری نفس[۱۵] کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ فرائڈ[۱۶] کا خیال ہے کہ نفسی حادثات جو ہمارے زیریں قلب پر ایک امٹ نقش بناتے ہیں ہماری زندگی کی تعمیر و تخریب کا باعث ہوتے ہیں۔"

آئن سٹائن نے جواب دیا "جس طرح حقیقت پرست مورّخ اور فلسفی نفسی حقیقتوں کو نظر انداز کرتے ہیں اسی طرح فرائڈ اُن کو زیادہ

---

[۱۳] Internal Secretions [۱۴] Psycic factors [۱۵] Subconscious [۱۶] Freud

اہمیت دینے پر تُلا ہُوا ہے۔ میں نفسیات کا ماہر نہیں ہوں لیکن مجھے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تقدیر کے مالک عضویاتی عاملین[۲] ہیں۔"

"تو گویا آپ تحلیلِ نفسی[۱] کے قائل نہیں ہیں؟"

"میں خیال جدید کے ایک اِس درجہ اہم شعبے کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تحلیلِ نفسی کا نظریہ ہمیشہ قابلِ تسلیم نہیں ہوتا اور ہمیشہ تحت شعور کی نقاب کشائی بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی۔"

"کیا آپ شخصی بقا کے قائل ہیں؟"

"نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر فرد دو اور افراد کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ کہاں اور کس وقت کسی وجود کو روح عطا ہوتی ہے۔ میں نوعِ انسان کو ایک درخت کی طرح سمجھتا ہوں جس کی بے شمار شاخیں ہوں۔ مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا ہر کونپل اور ہر شاخ میں ایک انفرادی روح موجود ہے۔"

"زندگی ایک عظیم شجر پر دہ ہے۔ فرد اُس کی بے پناہ اور معجز نما بادت میں ایک ناقابلِ التفات دھاگا ہے۔"

"کیا آپ شخصی بقا کے خواہشمند ہیں؟"

"نہیں۔ میرے لئے صرف ایک زندگی کافی ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ حقیقت ہماری ہستی کو جاودان نہیں بنا دیتی کہ جو نقش ایک دفعہ بنتا ہے وہ پھر دنیا کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا؟ ایک ایسا شخص جو کسی دُور دست ستارے سے ہماری دنیا کی طرف دیکھ رہا ہو حضرتِ مسیح کی پیدائش اور اُن کے مصلوب ہونے کا نظارہ اب بھی دیکھ سکتا ہے۔ اُس کے لئے پیلاطوس، مریم مگدلینی اور دوسرے تمام لوگ زندہ ہیں جنہوں نے اِس المناک حادثے کو دیکھا۔ اگر ستارہ اور بھی دور ہو تو اُسے حضرتِ موسیٰ اور اُن کی اُمت بحرِ احمر کو عبور کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ دنیاوی آنکھوں کے لئے یہ نقوش مٹ چکے ہیں لیکن کائنات کی فضا میں وہ پیہم سفر کر رہے ہیں۔ دُور کی دنیاؤں میں حضرتِ مسیح ہر روز مصلوب ہوتے ہیں اور حضرتِ موسیٰ اور اُن کی قوم ہر روز بحرِ احمر کو عبور کرتی ہے۔"

آئن سٹائن نے جواب دیا "مجھے یہ سوفسطائیت معلوم ہوتی ہے۔ زندگی ایک مطلق انجام کو پہنچ جاتی ہے، خواہ اُس کا نقش بے شمار نوری سالوں تک دُور دُور کے ستاروں میں نظر آتا ہے۔ موت ایک حقیقت ہے۔"

"آپ موت کی کیا تعریف کریں گے؟"

"جب کوئی ہستی اپنے اعمال سے اپنے حوالیات پر اثر انداز نہیں ہوتی تو زندگی کامل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہی موت ہے۔"

میں نے کہا "اُس کے خیالات اُس کے بعد بھی زندہ رہ سکتے ہیں؟"

---

[۱] Psyco-analysis. [۲] Physiological factors

"ہاں، مگر خود وہ اپنے تجربے میں ایک ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں کر سکتا، وہ کسی صورت میں بھی ان میں کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "کیا انسانی جدوجہد کے افسانے میں کوئی ایسی بات بھی ہے جسے ہم ترقی سے تعبیر کر سکیں؟"

"مجھے صرف تنظیم کے سلسلے میں کچھ ترقی نظر آتی ہے۔"

"بعض اہلِ قلم نے مجھ پر اعتراض کیا ہے کہ میری "آوارہ یہودی کی خود نوشت سوانح عمری" کا ہیرو دو ہزار سال کی زندگی میں ایک فوق العادت انسان کیوں نہیں بن جاتا۔"

آئن سٹائن نے کہا "فوق العادت انسان کی نشو و ارتقا کے لئے دو ہزار سال بہت تھوڑے ہیں۔ آپ کا ہیرو اگرچہ ایک خاص جسمانی ساخت لے کر پیدا ہوا ہے لیکن اُس کی ترقی کی رفتار دوسرے انسانوں سے بڑھ نہیں سکتی۔ البتہ وہ انہیں حالات میں اپنے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"عام انسان اتنی دیر زندہ نہیں رہتا کہ وہ اپنے تجربے سے کوئی معقول فائدہ اٹھا سکے! اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص دوسروں کے تجربات سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک باپ اور ایک استاد ہونے کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ ہم اپنے بچوں کو کچھ نہیں سکھا سکتے۔ ہم نہ اپنی زندگی کا علم اُن کے سینوں میں منتقل کر سکتے ہیں اور نہ ریاضی کا۔ ہر شخص کو اپنا سبق نئے سرے سے لینا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن فطرت ہمارے تجربات کو محفوظ کر دیتی ہے۔ ایک نسل کے تجربات دوسری نسل کی جبلت میں ہیں۔"

آئن سٹائن نے کہا یہ تو سچ ہے لیکن ان تجربات اور خصوصیات کو آئندہ نسلوں میں منتقل کرنے میں فطرت کو دس ہزار یا دس لاکھ سال لگ جاتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں نے اپنی حیرت انگیز صنعت اور تنظیم کا سبق قرن ہا قرن میں سیکھا ہوگا۔ افسوس کہ انسان کیڑوں سے بھی آہستہ تر سیکھتا ہے۔"

"کیا آپ کی دانست میں انسان ترقی کرتے کرتے بالآخر فوق العادت انسان نہ بن جائے گا؟"

آئن سٹائن نے جواب دیا "اگر بنے گا بھی تو اس میں کروڑوں سال صرف ہو جائیں گے۔"

"اگر ہم دوسروں کے تجربے سے اس قدر کم مستفید ہوتے ہیں تو آپ سائنس کی دنیا میں بعض غیر معمولی ترقیات کی کیا تعبیر کریں گے؟ کیا آپ اپنے انکشافات کو القا یا الہام سے تعبیر کرتے ہیں؟"

"میں القا اور الہام کا قائل ہوں بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا خیال صحیح ہے، مگر میں جانتا نہیں آیا درحقیقت

صحیح ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنے تخیل پر اپنے علم سے زیادہ اعتماد ہے؟"

"ہاں، میں اتنی مصوری جانتا ہوں کہ اپنے پردہ تخیل پر بلا تکلف کوئی تصویر کھینچ لوں تخیل علم سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، علم محدود ہے تخیل سارے عالم پر حاوی ہے"۔

"کیا آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں، سپینوزا کے خدا پر؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کے اس سوال کا محرک میرا وہ بیان ہوا ہے جو میں نے اپنے ایک امریکن دوست کے استفسار کے جواب میں بھیجا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ایک مشہور مذہبی پیشوا نے تمہارے خلاف کفر کا فتویٰ دیا ہے۔ میں نے یہ جواب شائع ہونے کے لئے نہیں بھیجا تھا" پھر اُس نے مسکرا کر کہا "ایک امریکن کے سوا کسی اور کو یہ خیال نہیں آسکتا کہ ایک شخص کو تار کے ذریعے سے پوچھے کہ تم خدا کے قائل ہو یا نہیں؟"

میں مجرمانہ طور پر ہنس پڑا۔

میں نے کہا "معاف فرمائیے گا ایسے معاملات میں میں بھی استفسار کے ایسے ہی طریق استعمال کرنے کا عادی ہوں میں بعض اوقات لوگوں کے سینے پر پستول رکھ کر نہیں کہتا کہ اپنی جیب سے گھڑی نکال کر میرے حوالے کر دو بلکہ اُن سے اُن کا فلسفہ زندگی دریافت کرتا ہوں۔ میرے اسیر پیچ و تاب تو کھاتے ہیں لیکن میرا طریقہ دس میں سے نو دفعہ کامیاب ہوجاتا ہے۔ ہر شخص کا ایک فلسفہ زندگی ہوتا ہے لیکن وہ اُسے عموماً مختصر طور پر بیان کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا میرا سوال اسے سوچنے اور اپنے عقائد کا خلاصہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔"

آئن سٹائن نے جواب دیا "آپ کا سوال مشکل ترین سوال ہے۔ یہ کوئی ایسا سوال نہیں جس کا جواب میں صرف ہاں یا نہیں سے دوں۔ میں کافر نہیں ہوں۔ مگر نہیں میں اپنے آپ کو وحدت الوجودی[1] بھی کہہ سکتا ہوں یا نہیں۔ یہ مسئلہ ہمارے محدود دماغوں کے لئے نہایت وسیع حیثیت رکھتا ہے"۔

پھر ذرا وقفے کے بعد اُس نے کہا "میں آپ کے سوال کا جواب ایک تمثیل سے دیتا ہوں۔ انسانی دماغ خواہ اُس کی تربیت کتنی اعلیٰ درجہ کی ہوئی ہو کائنات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہماری حالت ایک چھوٹے بچے کی سی ہے جو ایک ایسے عظیم الشان کتب خانے میں داخل ہوتا ہے جس کی دیواریں چھت تک کئی مختلف زبانوں کی کتابوں سے ڈھنپی ہوئی ہیں۔ بچہ جانتا ہے کہ کسی نے اِن کتابوں کو لکھا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کس نے لکھا ہے اور کس طرح لکھا ہے۔ وہ اُن زبانوں کو بھی نہیں سمجھتا جن میں یہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔

---

[1] Pan theist

"بچہ دیکھتا ہے کہ وہ ایک خاص ترتیب سے آراستہ کی گئی ہیں' ایک پُر اسرار ترتیب سے جو اُس کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن جس کا وہ ہلکا سا تصور کر سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے معاملے میں انسانی دماغ کی مثال خواہ وہ دماغ کتنا ہی بڑا اور کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اس بچے کی سی ہے۔

"ہم کائنات کی حیرت انگیز ترتیب کو دیکھتے ہیں پھر اُسے خاص خاص قوانین کا پابند بھی پاتے ہیں لیکن ہم اُن قوانین کو نہایت مبہم طور پر سمجھتے ہیں۔ ہمارا محدود دماغ اُس پُر اسرار قوت کا احاطہ نہیں کر سکتا جو سارے نظام میں سرگرم کار ہے۔

"سپینوزا کی وجودیت مجھے مسحور کر دیتی ہے فلسفۂ جدید میں اُس نے جو جو اضافے کئے ہیں میں اُن کا اور بھی زیادہ قائل ہوں۔ سپینوزا موجودہ فلسفیوں کا سرتاج ہے کیونکہ وہ پہلا فلسفی ہے جو روح اور جسم کو دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک سمجھ کر بحث کرتا ہے"

میں نے کہا "کیا سپینوزا کے ہم خیال متقدمین ہندوستان کے رہنے والے تھے؟"

آئن سٹائن نے جواب دیا "اکثر فلاسفہ ہندوؤں ہی کے مرہونِ منت ہیں لیکن سپینوزا کا فلسفہ اُس کے دماغ کی پیداوار ہے۔ ہندو اپنے فلسفے میں جسم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی لئے وہ جسم اور روح کے درمیان حقیقی وحدت کا تصوّر نہیں کر سکے"

منصور احمد

نوائے شوکت

سچ ہے اُن کو مجھ سے کیا اور میرے افسانے سے کیا
کر دیا دیوانہ تو اب کام دیوانے سے کیا

عشق کا عالم جدا ہے حسن کی دنیا جدا
مجھ کو آبادی سے کیا اور تم کو ویرانے سے کیا

پھر حرم میں ہو رہا ہے امتحانِ اہلِ دل
سجدہ ہائے معصیت لے آؤں بتخانے سے کیا

میری حیرت اِس طرف ہے اُن کی غفلت اُس طرف
دیکھئے دیوانہ اب کہتا ہے دیوانے سے کیا

میکدہ سے خُم میں آئی خُم سے شیشہ میں ڈھلی
اب مرے لب تک نہ آئے گی وہ پیمانے سے کیا

جس طرح گذری ہے اب تک اب بھی گذرے گی یونہی
ہم نہیں بدلے تو دنیا کے بدل جانے سے کیا

عالمِ ہستی میں کیوں لے آئی اے عمرِ رواں
ایسے ویرانے کی رونق ایسے دیوانے سے کیا

دیں اِدھر دنیا اُدھر اور بیچ میں واعظ کا وعظ
پھیر لوں شوکت نظر میں اپنی پیمانے سے کیا

شوکت تھانوی

آخری پرواز

نظم میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ ایک شخص "خوفِ ناکامی و رسوائی" سے یا دیگر وجوہ سے کئی بار محبت کرنے کے باوجود پوری طرح محبت نہیں کر سکا۔ اب وہ نہایت ہمت سے کام لے کر آخری بار محبت کرنے کا عزم کرتا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو زندۂ جاوید ہو جائیگا اور اگر ناکام رہا تو یاس کی اُس گہرائی تک تو جا پہنچے گا جہاں سے امید شروع ہوتی ہے یا اُن تاریکیوں تک جہاں سے نور کا آغاز ہوتا ہے!"

کی ہے اے دوست، کئی بار محبت میں نے،
اشکوں اور آہوں سے بھرپور ہیں دامان مرے؛
آہ! خود ساختہ خوابوں کا فسوں،
وہ کئی بار محبت کا جنوں!
بجھ گئی شمعِ ضیا پوش جوانی میری،
ہو گئی ختم کہانی میری؛
سو گئے میری تمناؤں کے پروانے بھی،
خوفِ ناکامی و رسوائی سے،
حُسن کے شیوۂ خود رائی سے،
دلِ بے چارہ کی مجبوری و تنہائی سے؛

کی ہے اے دوست، کئی بار محبّت میں نے،
اور ہر بار رہیں دل ہی میں آہیں میری،
خوفِ ناکامی و رسوائی سے،
کر سکیں رُوح کو عُریاں نہ نگاہیں میری!

آخری بار تمنائے محبّت کر لوں؛
سعیٔ ناکام سہی،
اور اِک زہر بھرا جام سہی،
میرا، یا میری تمناؤں کا انجام سہی،
ایک سودا ہی سہی آرزوئے خام سہی؛

آخری بار محبّت کر لوں،
ایک انسان سے اُلفت کر لوں؛
میرے ترکش میں ہے اِک تیر ابھی،
مجھ کو ہے جرأتِ تدبیر ابھی،
برسرِ جنگ ہے تقدیر ابھی،
اور تقدیر پہ پھیلانے کو اِک دام سہی!

مجھ کو اِک بار وہی "کوہ کنی" کرنے دو،
اور وہی "کاہ برآوردن" بھی ——؟
یا تو جی اُٹھوں گا اس آخری پرواز سے میں،
(روح کر دے گی مری زندۂ جاوید مجھے!)
اور بتا دے گی رہِ جادۂ امید مجھے،
رفعتِ منزلِ ناہید مجھے!
یا اُتر جاؤں گا میں یاس کے ویرانوں میں،
اور تباہی کے نہاں خانوں میں،
تا کہ ہو جائے مہیا آخر،
آخری حدِّ تنزل ہی کی اک دید مجھے،
جس جگہ سوتے ہیں اہرمن بھی،
اور جہاں تیرگیاں خواب میں ہیں،
تا کہ ہو جاؤں اسی طرح شناسا آخر،
نور کی منزلِ آغاز سے میں!
اپنی اس آخری پرواز سے میں!

ن. م. راشد

شب برات

اُس شام شب برات تھی، اور کیا شب برات تھی!

بات یوں شروع ہوئی۔ ماموں جان کو ایک خیال سوجھا۔ یوں تو نہیں خیال سوجھتے ہی رہتے ہیں مگر اس دن کا خیال خاص الخاص تھا۔ باغ میں آرام کرسی پہ دراز تھے اور انداز سے ظاہر کر رہے تھے گویا پڑھ رہے ہیں! اول اول تو ہم بھی اس دھوکے میں مبتلا ہو جایا کرتے تھے۔ مگر اب ہم ذرا سمجھدار ہو گئے تھے۔ ماموں جان تو اپنے مطالعہ کی نمائش کیا کرتے تھے اور میرا کام متانت مجسم بنے رہنا تھا!

یکایک ان کی جانب سے دھما کا سا ہوا "افضل"۔ افضل میرا نام ہے میں کچھ زیادہ حیران نہ ہوا۔ آخر مجھے اُن کی صحبت میں رہتے عرصہ گزر چکا تھا اور قرب کی وجہ سے انسان کئی چیزوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔

میں نے جواب میں کہا "جی"۔ مگر کوئی جواب یا سوال پھر نہیں ہوا۔

اصل میں ماموں جان کسی کام میں عجلت نہیں کیا کرتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر زبانِ خلق میں کوئی صداقت ہوتی اور اس مثل میں کہ "عجلت شیطان کا کام ہے" کوئی حقیقت ہوتی تو ماموں جان ملائکِ اعلیٰ میں شمار ہوتے۔ البتہ ایک آدھ دفعہ ماموں جان بھی . . . مگر میں قبل از وقت کچھ نہیں کہنا۔ میں ان کی طرف متوجہ ہو بیٹھا۔ وہ اپنی مونچھوں پہ تاؤ دے رہے تھے یعنی دوسرے الفاظ میں کچھ سوچ رہے تھے۔ میری مؤدبانہ خاموشی بھی قابلِ تعریف تھی۔ کچھ دیر کے بعد "آج دعوت کیسی رہے گی" کی آواز سے ہوا میں گونج پیدا ہوئی۔ میں نے "بہت خوب" کہا اور اپنی کلائی کی طرف نظر کی۔ سہ پہر کے ساڑھے چار ہو رہے تھے اور دن چھ پونے چھ بجے غروب ہوتا تھا۔ مگر ماموں جان سے یہ کہنا کہ وقت تنگ ہے۔ بے سود تھا۔ کچھ دقیقہ کے بعد پھر انہوں نے پوچھا "کس کس کو بلانا چاہیئے"؟ اب مجھے یہ بخوبی معلوم تھا کہ اُن کے دماغ میں مہمانوں کی فہرست تیار ہے مگر یہ ظاہر کرنا بھی غیر ضروری تھا بلکہ تجربے کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مضر تھا۔ چنانچہ میں نے کہا "احمد جان صاحب تو ضرور آنے چاہئیں"۔ یہ احمد جان صاحب ماموں جان کے پرانے ہم جماعت تھے اور ہمارے شہر کے سب پوسٹ ماسٹر اور ماموں جان کی باتیں سننے کے سب سے زیادہ شائق۔

میرا جواب شاید پسند آیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اپنی سنجیدگی کے لحاف سے نکل کر فرمانے لگے "تو برخوردار دعوت نامے لکھ دو نا"۔ دعوت نامے! اور پونے پانچ بجے! دعوت نامے اور سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹہ اور کھانے میں ڈھائی ایک! واللہ میں بھی حیران رہ گیا۔ مگر میں نے "بہت اچھا" کہہ کر کمرے کا رخ کیا۔

میں ان کا اکلوتا بھانجا ہوں۔ ان کی اپنی اولاد نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے مجھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس بات کی اہمیت کا وہی شخص اندازہ لگا سکتا ہے جس کا ماموں ایک پنشن یافتہ صوبیدار میجر ہو! وہ ماموں جس نے دنیا کا سفر کیا ہو جس کی پلٹن غالباً ہر ملک میں دو تین سال رہی ہو۔ جس نے شنگھائی کیا اور ہانگ کانگ کیا، بحرین کیا اور عدن کیا، مصر کیا اور فرانس کیا! ہر مقام دیکھا ہو اور جسے بیشمار کہانیاں اور واقعات یاد ہوں جن میں سے اکثر اُس کے اپنے کارنامے ہوں جو ان کہانیوں کو کبھی زنگ نہ لگنے دیتا ہو۔ طرہ برآں جس کے پاس ہزار دس روپے ماہوار کی جائداد ہو! اور جو اپنی باتیں سنانے کا بہت دلدادہ ہو۔

یہی وجہ تھی کہ احمد جان اُن کو بہت پسند تھے اور چچا انور بالکل کم، بلکہ بالکل نہیں۔ چچا انور اصل میں ماموں جان کے قصوں اور کارناموں پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ کو کام میں لایا کرتے ہیں۔ مجھے تو کبھی ان کا تبسم اعتراض کے قابل نظر نہیں آیا۔ مگر ماموں جان کو میں نے کہتے سنا ہے کہ "انور کی مسکراہٹ دنیا کے بدترین اور اشتعال انگیز نظاروں میں سے ہے" باوجود اس کے چچا انور کی موجودگی دعوت میں ضروری تھی۔ کچھ رشتے ہی پیچ در پیچ ایسے آن پڑے تھے کہ اس معاملے میں ماموں جان بڑے مجبور تھے۔ اِس بات پر میں ان کے تحمل اور صبر کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب میں جانتا تھا کہ وہ بھی بلائے جائیں گے اور ماموں جان بھی جانتے تھے۔ مگر کیا مجال جو کسی کے منہ سے اُن بلانے کے متعلق کوئی لفظ نکل جائے۔

کمرے میں وہ میرے پیچھے ہی آ دھمکے۔ بظاہر تو انہیں پنسل کی ضرورت تھی جسے وہ میز پر ادھر اُدھر ڈھونڈتے رہے مگر دراصل انہیں مہمانوں کی فہرست لکھوانا تھی۔ آخر نام بولنے شروع کئے جیسے اپنے فوجی دستے کی حاضری لے رہے ہوں۔ میں کارڈ لکھنے بیٹھ گیا۔ کارڈ بھی اعلیٰ مطلے ہونے ضروری تھے، کیونکہ ایسی باتوں میں ماموں جان جیسا پابندِ وضع میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ خوش قسمتی سے دعوت نامے بہت سے میں نے چھپوا رکھے تھے۔ ان میں فقط نام تقریب اور دن اور وقت کی خانہ پری کرنی تھی۔ میں لکھتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ ماموں جان جلدی کرنے کی تلقین بھی کرتے جاتے تھے۔ بارے کارڈ تیار ہوئے تو حکم ہُوا کہ انہیں ابھی نوکر کے ہاتھ بھیج دیا جائے۔ میں جلدی جلدی کارڈ سمیٹ باہر نکل آیا اور اپنے نوکر اللہ بخش سے کہا کہ کارڈ جلد پہنچا دے اور ساتھ ہی ان سب حضرات کو زبانی بھی بہت بہت تاکید کردے۔ یہ ہدایت اس لئے تھی کہ مہمانوں کے آنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ یہ نہ تھا کہ ماموں جان کو اِن دقتوں کا علم نہ ہوتا تھا مگر ان کو اپنے احکام کی تعمیل کا وہ پاس تھا کہ انہیں کسی قسم کی چنان و چنیں گوارا نہ ہوتی تھی اور مشکلات کا اظہار کرنا ان کے نزدیک کمزوری کا اعتراف تھا جس سے انہیں بہت نفرت تھی۔

اب باورچی کو ہدایات دینی تھیں۔ چنانچہ اسے بھی بلایا گیا۔ واضح رہے کہ ماموں جان کامل طور پر مردانے ہی میں رہتے تھے۔ کھانے اور سونے کا انتظام بھی مردانے ہی میں تھا۔ اندر زنانے میں فقط جھپٹ کے ہو آیا کرتے تھے۔ گویا کسی افسرِ اعلیٰ کے رُوبرو حاضر ہونا ہوتا تھا اور اس فرض کو جتنی جلدی ادا کر دیا جائے بہتر تھا۔ دوسرے انہیں باورچی کو "ٹھوس" ہدایات دینے اور تنبیہ

اور نکتہ چینی کرنے کی جو عادت تھی ۔ اُس کے لئے اندر زنانے میں مطلقاً گنجائش نہ تھی اور یوں ماموں جان نے صاف طور پر کہہ بھی دیا تھا کہ انہیں قیود پسند نہیں، وہ آزاد منش آدمی ہیں، ساری عمر باہر گزاری ہے اور ان سے یکلخت نہ پہنچی جائے گی وغیرہ اور وغیرہ۔ ممانی جان نے بھی یہ سن کر انہیں مجبور نہیں کیا تھا فقط ماموں جان کے اعتراضات اور وجوہ کو سن کر مسکرا دی تھیں اور یہ امر ہمیشہ کے لئے طے ہوگیا تھا۔

غرض کہ باورچی آ گیا معلوم ہوتا تھا کہ کسی جہاز کے بطن سے کوئلہ جھونکتے جھونکتے ادھر سانس لینے کو آیا ہے بس ایک عجیب نظارہ تھا اگرچہ عام طور پر بھی میں حیران ہوا کرتا تھا کہ اس قدر میل وہ اپنے کپڑوں پر جنہیں کپڑے کی نسبت بعید سے بھی کہا جا سکتا تھا کیسے جما لیتا ہے مگر اس دن تو اس نے اپنے گزشتہ کمالات کو بھی مات کر دیا تھا۔ علاوہ اس کے چہرے کے جس پر اس کی آنکھیں شاذ ہی دکھائی دیا کرتی تھیں اور اس کی ڈاڑھی کے جسے باوجود لاکھ پھبتیوں، جھڑکیوں اور قطعی تاکیدوں کے وہ نہیں منڈاتا تھا، باقی چہرے کا کوئی حصہ ہی ہوگا جو دھوئیں یا میل پائی سے پاک ہوگا۔ حالت اس قدر غیر معمولی تھی کہ ماموں جنہیں چراغ (باورچی) کا برسوں سے تجربہ تھا، وہ بھی جھلا گئے۔ مگر آفرین ہے چراغ پر ماموں جان لاکھ گرجے، لاکھ کڑکے مگر کیا مجال جو چراغ کا ایک رونگٹا بھی ہلا ہو۔ جہاں کھڑا تھا، بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ البتہ کبھی ایک ٹانگ کے سہارے کبھی دوسری کے۔ مار پیٹ رہ جاتا تھا کہ اب ماموں جان کیا نہیں کرتے۔ کیونکہ جب سے عبداللہ (نوکر) کو ایک گھونسا مارا تھا اور اس کی ہنسلی ٹوٹ گئی تھی اور علاوہ بدنامی کے بہت سا روپیہ خرچ کر کے صلح صفائی ہوئی تھی، ماموں جان اتنے دراز دست نہیں رہے تھے۔ باقی رہی گالی گلوج سو اُس کا اثر چراغ پر نہ کبھی پہلے ہوا تھا اور نہ اب۔

آخر کار کھانے کے متعلق ضروری ہدایات دے دی گئیں۔ اگرچہ اس دوران میں چراغ کو کھانے وغیرہ کی خرابی کے متعلق اور پچھلی دعوت کے موقع پر جو اس نے کھانڈ کا تو ام سارے کا سارا حلوے میں ڈالنے کے بجائے پاس ہی پڑے ہوئے لوٹے میں بھی انڈیل دیا تھا اور جس کا پتا ہاتھ دھوتے اور کلی کرتے وقت چلا تھا، اس کے متعلق خوب ہی گرم گرم الفاظ میں زجر و توبیخ ہوتی گئی۔ مگر میں جو چراغ کی طبیعت سے واقف تھا اُس کی شکل کو دیکھ کر ہرگز نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس پر ان باتوں کا کوئی اثر ہو رہا ہے۔ ماموں جان کو چراغ کی بے حسی پر اور بھی غصہ آیا چنانچہ علاوہ گالیوں کے اپنی مونچھوں پر تاؤ بھی بہت جوش سے دیتے جا رہے تھے۔ بالوں کے نچنے میں شاید ہی کوئی فرق رہ گیا ہوگا۔

اب جیسے دانستہ ماموں جان کو چڑانا مقصود تھا چچا انور بھی اسی وقت ٹہلتے ٹہلتے آ نکلے۔ چچا انور گول مول سے آدمی تھے ڈاڑھی مونچھ کے سخت خلاف تھے۔ دانت ان کے بہت ہموار اور سفید تھے۔ جن سے وہ اکثر فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ دو سو روپیہ ماہوار کی پنشن تھی۔ ایک لڑکا سب جج تھا۔ چنانچہ چچا انور ایسے معلوم ہوتے تھے گویا بشاشت ان کے چہرے سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔ آتے ہی خندہ پیشانی سے سلام کیا۔ ماموں جان نے جواب فقط مونچھوں میں دیا۔ آواز بھی بہت جلی بھنی سی تھی۔ اس پر چچا انور نے میری

جانب دیکھا پھر چراغ کو دیکھ کر اپنے اُسی دائمی تبسم کو کام میں لاتے ہوئے پوچھا "کیوں صاحب کمسریٹ[1] میں کچھ خرابی پڑ گئی ہے" اسے کہتے ہیں کریلا اور نیم چڑھا۔ چچا انور نے ایسے موقع پر محض آ جانے پر اکتفا نہ کیا آتے ہی ایک شگوفہ بھی چھوڑ دیا۔ اب ماموں جان میں فقط ایک نقص تھا۔ ان میں تحمل کا مادہ بالکل نہ تھا۔ اگرچہ دوسروں میں اس ملکہ کی بہت داد دیا کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ماموں جان نے کبھی کسی کی بات پوری طرح سنی ہو اور اگر کوئی ان کا قطع کلام کرے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔

اُس وقت شاید چراغ پہ غصہ کا اظہار کر کے کچھ شگفتہ خاطر تھے یا دل کا بخار نکالنے پر اطمینان کے مزے لے رہے تھے۔ اگرچہ میں آج تک معلوم نہ کر سکا کہ یہ فوری غصے اور فوری بخارات کیسے ان کے دل میں پیدا ہو جایا کرتے تھے۔ کچھ بھی ہو مگر چچا انور کا ایسے موقع پر آ جانا اور آ کے طنزیہ سوال پوچھنا آگ پر تیل ڈالنے کے مترادف تھا۔ بس چچا انور پر ماموں جان پل ہی پڑے مگر حسبِ معمول وہ صاف بچ گئے۔ اگر کبھی ماموں جان کو یہ واقعہ یاد آتا تو اسے بھی "انور کی شیطانی خوش قسمتی" پر محمول کرتے۔

ہوا یہ۔ کہ کارڈ لکھنے، چراغ کے بلانے، ہدایات دینے اور باغ کی رَوِشوں پر ٹہلنے میں دن غروب ہو چکا تھا۔ چچا انور کے آنے کے وقت ہم کوٹھی کی طرف آ رہے تھے جس وقت ہم پورچ میں پہنچے اندھیرا ہو چکا تھا جب ہم پورچ کی سیڑھیاں چڑھ کر برآمدہ میں داخل ہونے لگے تو ماموں جان کا دایاں ہاتھ برآمدے کے سوچ بورڈ تک اُٹھ گیا۔ ہمارے ہاں بجلی کا لگ جانا بھی ماموں جان کے ذاتی کارناموں میں سے تھا۔ چنانچہ برسبیلِ تذکرہ تقریباً سارا شہر اس کے متعلق سن چکا ہوگا۔ اس میں انہوں نے قدامت پسندی کے مقابلہ میں شاندار فتح حاصل کی تھی اور وہ اسے اپنی کامیاب مہموں میں شمار کیا کرتے تھے۔ "منڈی سکیم" آخرکار نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھی اور ہمارا شہر بھی نہایت شوق سے بجلی لگوانے میں منہمک ہو گیا تھا۔ ماموں جان ایسے آدمی ہی نہ تھے کہ کسی سے پیچھے رہیں۔ وہ حسبِ عادت سب سے سبقت لے جانے میں کوشاں تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے ہمارے شہر کے سب انجینئر کو بہت مجبور کیا کہ شہر میں سب سے اول ہمارے ہاں ہی بجلی لگے۔ مگر اس کو سب انجینئر صاحب کسی طرح نہ مانتے تھے۔ عذر یہ کرتے تھے کہ ہمارا مکان شہر کے دوسرے سرے پر ہے اور جب تک راستہ میں بجلی لگ نہ جائے ہمارے مکان کو نہیں مل سکتی۔ ماموں جان اسے محض عذرِ لنگ خیال کرتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ بدتمیز رشوت کا خواہاں ہے اور باوجودیکہ بہت اشخاص سے پہلے ہمارے ہاں بجلی لگ گئی تھی، ماموں جان انجینئر صاحب سے جب تک وہ ہمارے علاقہ میں رہے بہت ناراض رہے اور میرے سامنے اسے خوب صلواتیں سناتے رہتے تھے۔

اُس شام جیسے ہر ایک چیز نے ماموں جان کے خلاف سازش کر رکھی تھی۔ سوچ دبانے سے بجلی نہ جلی یعنی سوچ کی کل نیچے تو ہو گئی مگر روشنی نہ ہوئی۔ ماموں جان سوچ کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور اسے دو تین بار اوپر نیچے کیا مگر کچھ نہ ہوا۔ اگر کچھ ہوا بھی تو یہ کہ اندھیرا اور تاریک ہونے لگا۔ اِس پر ماموں جان ابل پڑے۔ برآمدے کو تو ایک چھلانگ میں طے کیا اور ڈرائنگ روم کے سوچ پر جھک پڑے۔ وہ بدبخت بھی دم سادھے گئے۔ قمقموں کو نہ جلنا تھا نہ جلے معلوم ہوتا تھا گویا باقاعدہ بغاوت ہو گئی ہے۔ بیچارے چچا انور

[1] کمسریٹ۔ فوج میں رسد خانہ اور خورد و نوش کے انتظام والے محکمے کو کہتے ہیں۔

اب کس کو یاد رہتے۔

میں نے کھڑکی سے باہر نظر کی۔ سڑک کے لیمپ تو گویا ہم پر ہنس رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کھلم کھلا توہین کر رہے ہیں۔ اندر کمرے سے گالیوں کی بوچھاڑ آرہی تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا منہ سے جھاگ بہ رہا ہوگا۔ میں وہیں دبک کے کھڑا رہا۔ اول اول تو بجلی کو سمندر کی تہ میں اور پھر جہنم کے ساتویں طبقے میں پھینکا گیا۔ پھر بجلی استعمال کرنے کے خلاف تیز اور بلند آواز میں بہت کچھ کہا گیا۔ بعد میں سب انجینئر کی باری آئی۔ پتا چلا کہ یہ سب اسی کی حرامزدگی ہے جب کبھی معلوم ہوا کہ ہمیں بجلی کی ضرورت بہت ہوگی تو بجلی بند کرا دی۔ چنانچہ جب ضرورت ہوئی، جبھی بند، آخر یہ ہے کس کام کی؟ معلوم نہیں کس احمق نے بجلی کو ایجاد کیا! آخر اس میں خوبی ہی کونسی ہے؟ بلب ہیں کہ روز ٹوٹتے رہتے ہیں اور پھر جلنے کے وقت جواب ہے۔ تو پھر بجلی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آخر یہ روز روز کا جھمیلا کیوں ہے؟ جہنم میں جائے سب کچھ' یہ بے عزتی اور یہ تکلیف ہر وقت برداشت نہیں ہو سکتی' ہرگز نہیں۔ . . . . ہو سکتا اور . . . . . . اور . . . . . .

اور کیا کیا؟ قبل اس کے کہ کوئی انہیں روک سکے یعنی اگر کسی کو اتنی جرأت ہوتی بھی۔ انہوں نے سوچ بورڈ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایسا زور سے کھینچا کہ سوچ اور تختہ مع تھوڑے بہت تاروں کے ان کے ہاتھ میں آگیا اور آپ نے نہایت غصے سے ایرآمدے میں پھینک دیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ ہم سنبھل بھی نہ سکے اور مجھے یقین ہے کہ چچا انور بھی مسکرانا بھول گئے ہوں گے۔

اتنے میں ایک نوکر آیا میں نے اسے لیمپ فوراً لانے کو کہا۔ جب لیمپ آیا تو اس کی روشنی میں ہم نے ماموں جان کو دیکھا عجیب ہیئت بنی تھی۔ مونچھیں نیزوں کی طرح کھڑی تھیں ہاتھ کی ایک انگلی سے خون بہ رہا تھا۔ چہرہ طیش سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ کمرے میں بپھرے ہوئے ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔

فیوزوں' تاروں' سوچوں اور بجلی کے متعلق کچھ شدبُد مجھے بھی تھی مگر میں بھی اس تھوڑے سے عرصے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ ادھر ماموں جان کمرے میں یوں ٹہل رہے تھے۔ جیسے دیواریں گرا دینا چاہتے ہیں۔ لیمپ کے آنے سے کمرہ خوب روشن ہو رہا تھا جس کی روشنی کے ساتھ ساتھ ماموں جان کا غصہ بھی کمرے کے ہر گوشہ میں پھیلتا اور سرایت کرتا گیا۔ پہلے تو بجلی گھر والوں کی کارستانیوں اور شرارتوں اور ان کے جملہ افعال کے متعلق بہت کچھ کہا گیا۔ کس طرح لوگوں سے وہ بھونڈے مذاق کرتے ہیں' ان کو کیسے تنگ کرتے ہیں۔ جس کسی سے ضد ہوئی اسی کے ہاں کی بجلی بند کر دی۔ معلوم ہوا کہ کسی نے دعوت دی ہے کسی کے ہاں جلسہ ہے بس اس کے ہاں بجلی کی لائن منقطع کر دی' چاہیئے ان حرام خوروں کو چوک میں لا کر بید مار مار کر اڑا دیا جائے (بہت غصے سے) آخر لوگوں نے روپیہ کاہے کو خرچ کیا ہے' اپنے آرام کے واسطے یا ان اُلو کے پٹھوں کے واسطے کہ جو چار بجلی گھر میں بیٹھے کرتے رہیں۔ خیال تھا کہ سب انجینئر ہی خبیث ہے معلوم ہوا یہ سب کے سب شیطان ہیں' سب نے سازش کر رکھی ہے۔ سب انجینئر جانتا ہے کہ بجلی کے معاملہ میں اسے زک پہنچی ہے (؟)

بس اس کینہ کو دل میں جمائے بیٹھا ہے (اور غصے سے) اچھا اُلو کے پٹھے تو بھی کر لے جو کچھ کرنا ہے! بدمعاش نے کہیں سے سنا ہے کہ میں نے آج دعوت دی ہے، جھٹ بجلی خراب کر دی، اس حرامزادے سے اچھی طرح بنٹ لونگا (اور بھی تیزی سے) اس کے ساتھ اس کے چیلے چانٹوں کو بھی چھٹی کا دودھ نہ یاد دلا یا تو میرا نام اسد اللہ نہیں، میں کل ہی ان کتے کے بچوں پر دعویٰ کرتا ہوں، سارے محکمے پر دعویٰ کروں گا، انہوں نے بھی کیا سمجھ رکھا ہے، ہم بھی کوئی موچی جلاہے ہیں کہ دب جائیں، ایسی بری طرح رگیدوں گا کہ ساری عمر یاد کریں گے آخر انہوں نے سوچ کیا رکھا ہے میں کیا ان کے داؤ پیچ نہیں جانتا۔ مجھے احمق جانتے ہیں، میں اُلو ہوں، آخر یہ بجلی ہے کس کام کی؟ میں نے لگوائی تھی؟ خود پوچھتے پھرتے تھے، خوشامدیں کرتے تھے، لے جائیں اب ساری بجلی وجلی کو، مجھے کچھ نہیں درکار، میں نے دو ہزار روپیہ خرچا ہے۔ مجھے دو ہزار روپے دے دیں مگر ایک پیسہ کم نہیں لوں گا، یہ جانتے ہی کیا ہیں؟ کسی سے پالا نہیں پڑا، میں اب ایک منٹ اس کوڑے کو گھر میں نہیں رکھونگا، ان تاروں واروں کو ابھی اتروا دوں گا۔ ابھی دلی بجلی گھر بھیجتا ہوں یہ کیا سمجھتے ہیں، او علی محمد ابھی مستری کرم الٰہی کو بلا لا۔ ابھی ساتھ لا۔ نہ لایا تو کھال اُدھیڑ دوں گا۔ اس سے کہو کہ ابھی آ کر یہ سامان تار اور ہنڈے لے جائے، مجھے نہیں ضرورت، ان لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے ..... "افضل" ......

میں جانتا تھا کہ یہ بال کہاں ٹوٹے گی۔ یقینی تھا۔ اس لئے میں حیران بھی نہ ہوا، میں نے کہا "جی" "ابھی لکھو ان حرامزادوں کو میں بالکل نہیں برداشت کر سکتا۔ آخر انہوں نے کیا مذاق بنا رکھا ہے میں ساری شیخی نکال دونگا، لے جائیں یہ سب کچھ غلاظت مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں، ابھی تار ہنڈے اور سوئچ سارا سامان ابھی لے جائیں ابھی، اور مجھے دو ہزار روپے دے دیں۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ان حرامزادوں پر، ابھی سب کچھ بجھواتا ہوں، نہیں تو کچھ پتا لگ جائے نا خبیثوں کو، میرے دو ہزار روپے دے دیں نہیں تو کل کرتا ہوں دعویٰ، ناک چنے چبوا دوں گا، چلیں کہاں تک چلتی ہیں، مجھے بھی انہوں نے اُلو سمجھ رکھا ہے، رگید رگید کے جان نکال دونگا، ذرا لکھو تو، پتا چل جائیگا، دے دیں روپیہ نہیں تو کل دعویٰ کرتا ہوں کل...."

"مگر کل تو اتوار ہے" چچا انور بیچ میں بول اُٹھے معلوم ہوتا تھا، چچا انور کو اپنی مسکراہٹ پھر مل گئی تھی، ماموں جان اس پر بہت چنگھاڑے "کچھ پرواہ نہیں تم لکھو" یہ مجھے گھور کے کہا۔ "اور.... اور.... تم" اب مجھے خطرہ ہوا کہ ضرور چچا انور پر برس پڑیں گے، میں نے جلدی سے کہا "جی اور کیا؟ کل دعویٰ کر دوں گا اگر روپے نہ دیے تو پھر...."

بارے وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ مگر چچا انور کیا مجال جو انہوں نے مسکرانا چھوڑا ہو، یعنی چچا انور بھی بس ایک ہی تھے۔ ماموں جان غصہ سے کھول رہے تھے اور چچا انور گوتم بدھ کی تصویر بنے مسکرا رہے تھے۔ شاید میں بھی کامل طور پر ماموں جان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکتا اگر اسی وقت ..... فوراً ... اچانک برآمدہ روشن نہ ہو گیا ہوتا۔

ہماری سب کی نظریں یکلخت باہر کی طرف اُٹھ گئیں۔ کیا تیز روشنی تھی! ادھر دروازے میں مستری کرم الٰہی سوئچ بورڈ کو اٹھائے کھڑا تھا اور اس کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو انگلیوں سے سیدھا الٹا کر رہا تھا۔ ہم سب ہمہ تن سوال تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ تختے کو الٹتے پلٹتے کہا "جناب عالی بجلی تو بالکل ٹھیک تھی فقط بڑا سوئچ کسی نے بند کر دیا تھا۔"

فیاض محمود

تأثراتِ گورستاں

درد کی تصویر کھینچی ہے سکوتِ شام نے ۔۔۔ ایک رقّت خیز منظر ہے نظر کے سامنے
دُور تک پھیلے ہیں حسرت خیز قبروں کے نشاں ۔۔۔ غرق ہے کیفیّتِ غم میں زمین و آسماں
سرد آہیں چھپ کے بیٹھی ہیں سکوں کے بھیس میں ۔۔۔ نوحہ گر ہے ایک ناطق خامشی اس دیس میں

آج سے دس سال پہلے، یونہی وقتِ شام تھا ۔۔۔ اور میں ناواقفِ دلدوزیٔ آلام تھا
چند لوگ اس رُوح فرسا سرزمیں میں آئے تھے ۔۔۔ موت کی سرکردگی میں اک جنازہ لائے تھے

میرے استفسار پر یوں مجھ کو بہلایا گیا ۔۔۔ موت کے عقدے کو دو فقروں میں سُلجھایا گیا
ہو سکا جب تک تمہارے پیار کا دم بھر گیا ۔۔۔ اب تمہارا نوجواں بھائی خدا کے گھر گیا
آہ! وہ سادہ دِلی بچپن کی اب تک یاد ہے ۔۔۔ میں نے یہ سمجھا خُدا زیرِ زمیں آباد ہے

آج پہچانا نہیں جاتا وہ گم گشتہ مزار ۔۔۔ بن گئی ہیں اُس جگہ ویسی ہی قبریں بے شمار
کس طرح معلوم ہو، یہ خویش، وہ بیگانہ ہے ۔۔۔ ہر تفاوت سے بری رُوحوں کا وحدت خانہ ہے

ایک ہی روحوں کی لے اور ایک ہی آواز ہے
موت کیا ہے؟ اجتماعی زلیست کا آغاز ہے

عدمؔ

اشتراکیت اور یونان و روما

سوفسطائیہ۔ مسیح سے تقریباً چھ سو برس پہلے جبکہ فلسطین میں یہودی تمدن زوال پذیر ہو رہا تھا سرزمینِ علم و حکمت یونان میں ایک نئے تمدن کی داغ بیل پڑ رہی تھی ہمیں اس تمدن ملک و قوم میں ایک ایسی علمی جماعت کا وجود نظر آتا ہے جو قدیم توہمات اور مذہبی معتقدات سے الگ ہو کر انسان اور انسانیت کو سمجھنے کی خواہاں اور مسائلِ زندگی کو عقلی بنیادوں پر حل کرنے میں کوشاں تھی۔ حکما کا یہ گروہ جمہوریہ ایتھنز میں قیام پذیر تھا اور سوفسطائیہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ انسان کو ان ہی مسائل کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو آسانی سے اس کی سمجھ میں آسکتے ہوں۔ اس جماعت کے نزدیک خیر و شر کا معیار انسان اور صرف انسان تھا۔ جو بات ایک خاص انسان کو بھلی معلوم ہو اُس کے لئے وہی خیر ہے اور جو اسے بُری لگے اس کے لئے وہی شر ہے۔ انفرادیت سے الگ ہو کر کسی عالمگیر خیر یا شر کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ یہ سوفسطائی حکما اخلاقی نظریوں اور سیاسی لائحوں کو ایک غیر فطری اور خود ساختہ معاہدے سے زیادہ اہم نہ سمجھتے تھے۔ قانون اور ریاست کی حقیقت ان کی نگاہ میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" سے زیادہ نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ شخصی آزادی اور انفرادی حقوق کے طالب تھے اور مروجہ قوانینِ حکومت اور ضوابطِ شہریت سے پوری پوری نجات حاصل کرنی چاہتے تھے۔ چونکہ اُن کے نزدیک انسانی زندگی کا نصب العین تحصیلِ مسرت و انبساط تھا اور یہ بیحد آزادی پسند واقع ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زمانۂ دراز تک ان کی تعلیم انفرادیت پسند عوام اور شوریدہ سر نوجوانوں میں خاص قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔

سقراط۔ زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ایک زبردست مصلح اور ایک غیر معمولی انسان پیدا ہوا جس نے اس بڑھتی ہوئی انفرادیت کو روک کر عوام کو اشتراکیت کی پہلی جھلک دکھائی۔ یہ بڑا انسان سقراط تھا۔ اس کے غیر معمولی دماغ نے زمانے کی سطح سے بلند ہو کر اور عام روش سے الگ ہٹ کر اخلاقی معیار کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس نے وقت کی سب سے اہم ضرورت پوری کرنے کے لئے مسئلۂ خیر و شر کے عقلی اور اصولی حل کی تلاش شروع کر دی۔ اس کا دماغ ان خیالات سے پُر تھا کہ خیر و شر کا اصلی مفہوم کیا ہے؟ کامیاب اور مطمئن زندگی کسے کہہ سکتے ہیں؟ ایک معقولیت پسند انسان اپنی زندگی کن اصولوں پر منضبط کرے؟ یہ خیر و شر اعتباری اور اضافی اصطلاحیں تو ہو نہیں سکتیں! اس کا کوئی نہ کوئی ایسا مکمل معیار ضرور ہونا چاہیئے جس کو معقولیت پسند انسان دنیا کے ہر حصے اور ہر زمانے میں یکساں تسلیم کریں بشرطیکہ ان کو سکون و اطمینان کے ساتھ غور و فکر کا موقعہ نصیب ہو۔ پھر وہ خیرِ محض کیا چیز ہے جس سے مشابہت اور مماثلت پیدا کر لینے سے ہر چیز خیر کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے؟

سقراط اس کا ایک اور صرف ایک ہی جواب دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خیرِ محض علم اور صرف علم ہے۔ کیونکہ صحتِ اعمال کے لئے صحتِ افکار ضروری ہے

اور صحت افکار ہی کا دوسرا نام علم ہے۔

سقراط کا دعویٰ ہے کہ جو انسان الصاف، محبت اور سعادت کے اصلی مفہوم سے ناواقف ہے وہ صحیح معنی میں منصف، ابنائے جنس کا دوست اور سعید نہیں بن سکتا۔ اسے یقین ہے کہ انسان فطرۃً نکو سرشت واقع ہوا ہے۔ ناممکن ہے کہ کسی انسان کو نکوئی کا حسین اور دلکش چہرہ صاف صاف نظر آئے اور پھر بھی وہ اس کے دل میں سما نہ جائے۔ انسان بالطبع شر پسند نہیں ہے۔ خیر کو چھوڑ کر شر کو اختیار کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ کوئی انسان بُرے خیالات اور افعالِ بد کی پیروی اپنی رضامندی سے نہیں کرتا۔ بلکہ اگر وہ دو مختلف مرتبے کی برائیوں میں گھر جائے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر ہو جائے تو وہ غیر معمولی شر کو معمولی اور کم مرتبہ شر پر کبھی ترجیح نہ دے گا۔ خیر و شر کا یہ علم سقراطی دنیا میں خیال و نظر تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے نزدیک ان کی حیثیتیں عملی اور قطعاً عملی تھیں۔ اس کے خیال میں انسانی اعمال و افعال کا واحد منشا زندگی کو مطمئن اور خوشگوار بنانا ہے۔ بنا بریں اچھے اور قابلِ احترام وہ خیال ہیں جو بہ حیثیتِ مجموعی مفید ہوں جن میں کوئی پہلو مضرت رساں نہ ہو۔ سعادت اور حقیقی مسرت ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ بہادر، عقلمند اور منصف مزاج انسان جسے اپنے نفس پر پوری پوری قدرت حاصل ہو یقیناً قابلِ رشک اور مسرت خیز زندگی کا مالک ہے کیونکہ سعادت ہی تمام مسرتوں کی سرمایہ دار اور یہی تمام مادّی قوتوں کی خزینہ بردار رہے۔ دولت و قوت سے سعادت نہیں مل سکتی۔ ہاں سعادت سے یہ چیزیں خود حاصل ہو جاتی ہیں۔

اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جب سقراط عدالت کے حکم سے زہر کا پیالہ نوش کرنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے حاضرین کو اپنے پسماندوں کے متعلق یہ وصیت کرتا ہے کہ اگر اس کے لڑکے سن رسیدہ ہونے کے بعد تحصیلِ سعادت سے بے توجہی برتیں اور مادّی قوتوں کی تحصیل میں سرگرداں نظر آئیں تو اس کے دوستوں کا فرض ہوگا کہ وہ ان کو اسی طرح پریشان کریں اور اس طرح طنز و استہزا سے کام لیں جس طرح سقراط اپنے زمانے میں دوسروں کے ساتھ کیا کرتا تھا اور جس کے صلے میں اسے زہر کا پیالہ نوش کرنا پڑا۔ الغرض یہ تھا وہ اخلاقی نظریہ جس پر سقراط "ریاست" اور "حکومت" کی بنیاد قایم کرنی چاہتا تھا۔ مزید تفصیل کے لئے "سقراط کے اعترافات" ملاحظہ فرمائیں:۔ (Trial and Death of Socrates by Plato) اس کے زمانے میں آزادی پسند نوجوان حکومتِ وقت کو اجنبی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ مگر اس نے اگر عوام کو حکومت و ریاست کی حقیقت اور ضرورت سمجھائی۔ اس نے نظامِ جماعت کی اہمیت بتائی اور ثابت کر دکھایا کہ "حکومت" ایک خود ساختہ اور غیر فطری معاہدہ و مفاہمہ نہیں بلکہ ایک فطری اور قطعاً فطری ادارہ ہے جو نظم و نسقِ جماعت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ "ریاست" کسی بیجا قوت و اقتدار کا نام نہیں بلکہ ایک نہایت ہی مقدس اجتماعی نظام ہے۔ قانون خود سر اور آزاد نہیں بلکہ ایک قائم و دائم صداقت کا تابع فرمان ہے اور چونکہ جماعت بہر حال اشخاص و افراد سے بالاتر ہے۔ اس لئے انفرادی اغراض و مقاصد جماعتی مفاد کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

افلاطون۔ افسوس اسے اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ کوئی مکمل و منضبط نظامِ فلسفہ یا کوئی مستقل معاشرتی لائحہ دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے ان کی بنیادیں استوار کر دیں اور اپنے پسماندوں کے غور و فکر کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔ دراصل یہی وہ اساسی خیالات اور بنیادی نظریئے تھے جن پر آگے چل کر اس کے لائق و نائق شاگرد افلاطون نے مشہورِ عالم "جمہوریت" کی عمارت تعمیر کی۔ اس نے اپنے محبوب استاد کے اخلاقی نظریوں اور اس کے سیاسی خیالات کو وسعت دے کر دنیا کے سامنے مرتب و مدون مکالمات کی صورت میں پیش کیا۔ اس نے ان مکالمات میں ان تمام مسائل کو اپنے نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا فلسفۂ اخلاق اور اس کی جمہوریت تمام تر اس کے نظریئے تجدد و امثال (مثل افلاطونی) پر مبنی ہے۔ اس لئے ضمناً اس کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔

افلاطون کے نزدیک دنیائے انسانیت بہرحال معقولیت پسند ہے محسوسات ظاہری اور موجوداتِ مادی ایک غیر متبدل اور قائم و دائم "حقیقت" کے پرتو ہیں۔ خود یہ محسوسات دوامی طور پر منقلب ہیں اور ایک فانی وجود رکھتے ہیں اس لئے ذاتی طور پر ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ قابلِ قدر تو وہی دائمی اور غیر متبدل صداقت ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں تو اس صداقت اور حقیقت کا نام عقل ہے اور یہی خیرِ محض بھی ہے۔ بنا بریں دنیائے انسانیت کا عقلی اور صرف عقلی پہلو حقیقی کہلا سکتا ہے اور اسی لئے انسانیت کا واحد نصب العین "کمالِ عقلی" ہے۔ حواسِ خمسۂ ظاہری اور جسمانی قویٰ کو حقیقت کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ جسم اور جسمانیات تو روح اور روحانیات کے لئے بمنزلہ قفسِ عنصری کے ہیں جس سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا روحِ انسانی کا آخری اور واحد مطمحِ نظر ہے۔ پس ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ مادیات سے پوری پوری نجات حاصل کرنے کی کوشش کرے! اب اس مادیت سے نجاتِ کامل حاصل کر لینا ہی "خیرِ محض" یا "خیرِ مجرد" سے مماثلت پیدا کر لینا کہلاتا ہے۔ بنا بریں روحِ انسانی کا جسم سے دائمی نجات پا لینا اور حسین و جمیل محسوسات و خیالات کی دنیا میں محوِ پرواز رہنا انسانی زندگی کا واحد مقصد اور اس کی تگ و دو کی آخری منزل ہے۔ مگر عقل، روح، ارادہ اور روحانیت یہ سب قفسِ عنصری میں محصور و مقید ہیں اور جسم کے دام میں یکساں گرفتار ہیں۔ اس لئے مشترک مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر ان تمام قویٰ کو باہم متحد ہو جانا چاہیئے اور چونکہ عقل کا فریضہ روح کی رہنمائی اور اس کی معاونت ہے اس لئے اسے دوسری تمام قوتوں پر حاکم و قابض ہو کر رہنا چاہیئے۔ پھر اس تمام نظام کی نامساعد اتفاقات سے حفاظت بھی ضروری ہے۔ اس لئے ارادہ کا مرتبہ باقی ماندہ تمام قوتوں سے بلند تر ہونا چاہیئے۔ تاکہ حسبِ ضرورت پورے نظام کی حفاظت ہوتی رہے! الغرض نظامِ جسمانی میں عقل کا مرتبہ ایک تجربہ کار اور صاحبِ دانش مشیر کا سا ہے جس کے مفید مطلب مشورے بہر صورت ناگزیر ہیں اور ارادہ کی حیثیت ایک وفادار سپہ سالار کی سی ہے جس کا فرض ہے کہ پوری بہادری کے ساتھ پورے نظام کی محافظت کرتا رہے۔ باقی رہے حواسِ مادی اور جسمانی قوتیں تو ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ متحدہ طور پر جسم کی عادلانہ خواہشوں اور اس کی فطری ضرورتوں کو مہیا کرتے رہیں! اس لئے ان کو بہرحالت عقل و ارادہ کے تابع ہو جانا چاہیئے۔

بالفاظ دیگر ان کی حیثیت فرمانبردار خدام کی سی ہے۔ جو شب و روز مقررہ فرائض اور معینہ واجبات کے ادا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

اب وہ افراد جن کی قوتِ عاقلہ دوسری قوتوں پر حاکمانہ حیثیت و مرتبہ سے حاوی ہو۔ جن کی نگاہیں عالم و مافی العالم کے اسرار سے ایک گونہ واقف ہوں حکیم کہلانے کے مستحق ہیں اور جن افراد کی قوتِ ارادہ نسبتہً زیادہ توانا ہو مگر ساتھ ہی عقل کی تابع اور اس کی رفیق بھی ہو۔ تاکہ عقل کی رہنمائی میں زندگی کی کلفت و مسرت کی پیچیدہ منزلوں سے بآسانی گزر سکے وہ ذی ہوش بہادر کہے جانے کے سزاوار ہیں۔ اسی طرح وہ افراد جن کی قوتِ ارادہ اور نفسانی طاقت قوتِ عاقلہ کی تابع فرمان ہو۔ بالفاظ دیگر جن کی تمام قوتیں فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے منظم و متحد ہوں اور ہر قوت انفرادی طور پر متعلقہ فرائض اور واجبات بحسن و خوبی ادا کر رہی ہو۔ ان کو "انسانِ کامل" یا "انسان عادل" کے معزز لقب سے سرفراز کیا جا سکتا ہے یقیناً جو زندگی اس زریں نظام پر کاربند ہو کر گزاری جائے اس کو ذی عزت اور باسعادت زندگی کے معزز خطاب سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ مگر وہ شخص جس کی جسمانی قوتیں بے باک ہوں اور جس کی نفسانی خواہشیں اس کے عقل و ارادہ پر چھائی ہوئی ہوں جس کی زندگی کا مقصد ہی حصولِ لذت اور تحصیلِ لطف و مسرت ہو۔ الغرض جس پر نفس پرستی کا بھوت سوار ہو اس کو "شقی" کے قابلِ شرم نام سے پکارنا چاہیئے اور اس کی زندگی کو شقاوت کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ اس لئے قابل تقلید اور معیاری زندگی یہ ہوئی کہ روح فضائل سے آراستہ و پیراستہ ہو۔ قوتِ روحانی تمام دوسری قوتوں پر اور قوتِ ارادی جملہ جسمانی قوتوں پر حاکم و متصرف ہو اور عدالت و ضبط نفس، معقولیت اور بہادری زندگی کے بنیادی اصول قرار پائیں۔ الغرض انسانی زندگی اور اس کے جملہ مساعی ہر لحاظ سے تلاشِ خیر پر مرکوز نظر آئیں کہ یہی کمالِ سعادت ہے اور یہی انبساط و مسرت اور چونکہ تحصیلِ لذت مقاصد زندگی میں داخل نہیں۔ بلکہ روحانی زندگی کے لئے اس کا وجود خطرناک ہے اس لئے ممکن ہے کہ ایک عادل و کامل انسان کی زندگی لذت سے بیگانہ رہے۔ بایں ہمہ وہ مطمئن و مسرور ضرور ہوگی کہ اطمینان و مسرت سعادت کے ادنیٰ ترین خادم ہیں۔

افلاطون کا یہی نظریۂ اخلاقی نظام اس کی "جمہوریت" پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اور آگے چل کر اس کی سیاسیات کا بھی یہی سنگِ بنیاد نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس میں اسی حد تک اشتراکیت کا عنصر پایا جاتا ہے جو اس کے اس اخلاقی لائحہ سے متناقض نہیں۔ چونکہ اس کے نزدیک افراد کی انفرادی زندگی کا نصب العین خیرِ محض سے مماثلت پیدا کرنا اور اخلاقی سعادت حاصل کرنا ہے اور اس نصب العین تک انفرادی کوششوں سے رسائی نصیب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے اجتماعی جد و جہد درکار ہے۔ ہاں چونکہ کوئی فرد من حیث الفرد "خیرِ محض" یعنی اخلاقی سعادت و فضیلت کو حاصل نہیں کر سکتا اور اس کے لئے ایک اجتماعی ہم آہنگی ضروری ہے۔ لہٰذا کسی ایسے اجتماعی نظام کا وجود بھی ضروری ہوا جس کی بنیاد اخلاقی اصولوں پر قائم ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں افلاطون اپنی معیاری جمہوریت دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور سیاست و معاشرت کا ایک مکمل لائحہ پیش کرتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک جس طرح ہر فرد کی زندگی کا نصب العین حصولِ فضیلت ہے اسی طرح ریاست کے وجود کا مقصد بھی سعادت کی

تحصیل و اشاعت ہے۔ بلکہ ریاست کا واحد منشا اس سعادت کو فراوانی کے ساتھ حاصل کرنا ہے۔ اس کے قوانین ضوابط بلکہ خود اس کی تعمیر کی غرض و غایت ایسے اسباب اور حالات پیدا کرنا ہے جن کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ انسان بآسانی تمام مسرت و سعادت سے بہرہ اندوز ہوسکیں اور اپنی زندگی خیر و برکت سے معمور کرسکیں۔ بالفاظِ دیگر ریاست عوام کی فلاح و بہبود کی واحد ذمہ دار قرار پاتی ہے۔ بلاشبہ اجتماعی زندگی مقصود بالذات نہیں بلکہ محض تکمیلِ افراد کا ذریعہ ہے اور یہ صحیح ہے کہ ایک صاحبِ شعور انسان کو خارجی رہنمائی اور ریاستی قانون سازیوں کی ضرورت نہیں عقل اور صرف عقل کی رہبری اس کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ بھی تو صحیح ہے کہ ایسے سعادتمند انسانوں کی تعداد ہمیشہ اور ہر جگہ کم اور بہت کم رہی ہے۔ بنابریں ریاست اور قانون کا وجود عام حالتوں میں نہایت ضروری ہے، اور عوام کی فلاح کو مدنظر رکھتے ہوئے قوانین کی غیر مشروط پابندی بھی لازمی ہے۔ لاریب اگر تمام افراد معقولیت پسند اور منضبط زندگی بسر کرنے کے عادی ہوجائیں تو قانون و ریاست کا وجود محض فضول ہو کر رہ جائے۔ مگر یقیناً ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہی کوئی توقع ہے۔ تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہیئتِ اجتماعیہ کی فلاح و بہبود کے لئے افراد کے ذاتی مفاد اور ان کی انفرادی ضرورتوں کو عوام کے اجتماعی مفاد کے تابع ہونا چاہیئے۔ یہی مفہوم اس مشہور و معروف سیاسی نظریئے کا ہے کہ افراد کی فلاح جماعت کی فلاح میں مرکوز ہے۔ افلاطون کی جمہوریت یا ریاست کی ایجاد و پیدائش خالص جماعتی ضرورتوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے اسی لئے اس میں جا بجا اجتماعیت نمایاں نظر آتی ہے۔

افلاطون نظامِ ریاست کی تعمیر اُن ہی سہ گانہ اصولوں کی بنیاد پر استوار کرنی چاہتا ہے جن پر اس نے جسمِ انسانی کی عمارت قائم کی ہے اور جن کو وہ عقل ارادہ اور نفس کے نام سے تعبیر کرتا ہے جس طرح ہر زندہ انسان میں یہ تینوں قوتیں جداگانہ طور پر کارفرما ہیں اس کے نزدیک اسی طرح ہر زندہ جماعت میں بھی ان ہی تین قوتوں کا ہونا ضروری ہے جن کی نمائندگی اس کے نقطۂ خیال سے جماعت کے تین مختلف طبقے کرسکتے ہیں۔ پھر ہیئتِ اجتماعیہ کے ان طبقوں کے باہمی تعلقات اور ان کے مراتب میں فرق و امتیاز اور ان کے فرائض و واجبات میں تفاوت بھی ٹھیک اس نہج پر ہونا چاہیئے جس طرح یہ ایک مکمل جسمانی نظام میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ریاست اور جمہوریت میں جماعت کے ان سہ گانہ اجزا کو طبقۂ حکما۔ فوج اور عوام کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اب جو لوگ علم و حکمت کے ماہر ہیں وہ اس کی "ریاست" میں قوتِ عاقلہ کے نمائندے ہیں اور اسی بنا پر ان کو حکمرانی کے مناصب پر فائز ہونا چاہیئے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ قانون سازی کی وساطت اور فوج کی اعانت سے جماعت میں نظم و نسق قائم رکھیں اور خارجی حملوں سے اس کی حفاظت کا سامان بہم پہنچائیں۔ پھر بہادرانِ فوج جو قوتِ ارادہ کے مظاہر ہیں ان کا تقرر فوجی عہدوں پر ہونا چاہیئے۔ اس طبقے کا فرض یہ ہے کہ وہ جماعت کی حفاظت کرے اور طبقۂ حکما کی رہبری میں ریاست کو اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھے بغرض قیامِ امن اور محافظت جماعت کے فرائض انجام دے۔ باقی رہے عوام یعنی صناع۔ کاشتکار اور تجار وغیرہ تو چونکہ یہ مادی قوتوں اور نفسانی خواہشوں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لئے ان کا مرتبہ دوسرے دو طبقوں سے فروتر ہونا چاہیئے۔ اس طبقے کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اسبابِ

معیشت اور ضروریات زندگی فراہم کرے اور مقدم الذکر طبقوں کی ماتحتی اور نگرانی میں زندگی بسر کرے۔ ان سہ گانہ طبقوں کی متحدہ جماعت کا نام افلاطونی جمہوریت یا ریاست (Republic) ہے۔

اور چونکہ کمال عدل صرف اسی جماعت میں وجود پذیر ہو سکتا ہے جس میں یہ تینوں طبقے اپنے اجتماعی علائق اور اپنی انفرادی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور متعلقہ واجبات کو بحسن وخوبی ادا کرتے رہیں اس لئے ہر فرد کا اخلاقی و قانونی فرض ہے کہ وہ ہیئتِ اجتماعیہ میں کوئی نہ کوئی متعین منصب رکھے۔ اور ریاست کی جانب سے عائد شدہ فرائض و واجبات کو بحسن و خوبی اور پوری پوری محنت و تندہی سے انجام دے۔ ذاتی مفاد اور شخصی اغراض کو عوام کی فلاح و بہبود پر قربان کردے۔ کیونکہ وہ خود عوام سے الگ ہو کر کوئی قابل اعتنا وجود نہیں رکھتا۔ اسی طرح انفرادی مفاد اجتماعی مفاد کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ الغرض افراد کا اپنے ارادے اور اپنی قوتِ عمل کو نظامِ اجتماعی کے تابع رکھنا لازم ہے۔ کیونکہ جب تک ہم ہیئتِ اجتماعیہ کی فلاح و بہبود کو مدنظر نہ رکھیں گے اس وقت تک ہماری انفرادی فلاح و بہبود ممتنع الحصول رہے گی۔ بالفاظ دیگر زندگی کی غرض و غایت گو انفرادی سعادت ہی ہے اور اجتماعی سعادت اس انفرادی سعادت کا محض ایک خزینہ ہے۔ تاہم بلا اس مرکزی مخزن اور اس اجتماعی منبع کے موجود ہونے کے انفرادی سعادت کا وجود ناممکن ہے۔ اس لئے کمالِ سعادت صرف وہی جماعت حاصل کر سکتی ہے جس کی تعمیر چند متعین اصولِ انصاف اور قوانینِ عدل و ضوابطِ عدالت پر ہوئی ہو جس میں حاکم و محکوم مسئلہ استحقاقِ حکومت میں متفق الرائے ہوں۔ حکومت کی ذمہ داری کن افراد کے سپرد کی جائے؟ اس معاملے میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ پھر چونکہ تمام افراد کی صلاحیتِ دماغی اور قوتِ جسمانی یکساں نہیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص وہی خدمت انجام دے جو اس کی شان کے شایاں ہو۔ الغرض جس جماعت میں ہر فرد اپنی مخصوص استعداد اور دماغی و جسمانی قابلیت کے لحاظ سے کسی ایک طبقے کے فرائض انجام دے رہا ہو۔ اور ساتھ ہی اپنے اجتماعی حقوق سے بھی بخوبی بہرہ ور ہو رہا ہو۔ اس مرحلے پر پہنچ کر افلاطون ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور شخصی سرمائے اور انفرادی ملکیت کو قانوناً ممنوع قرار دے دینا چاہتا ہے۔ اس خاص مسئلے میں اس کو اس قدر غلو ہے کہ وہ بچوں اور عورتوں کو بھی ریاست کی مشترکہ ملکیت بنا دینا چاہتا ہے۔ "ہر بچہ ہر شہری کا بچہ ہے اور ہر عورت ہر مرد کی بیوی"۔ یہ ہے اس کی بلند پروازی اور یہ ہے اس کی اشتراکیت! افلاطونی ریاست صحیح معنی میں اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کی آئینہ بردار ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ زر۔ زمین۔ زور اور زن جماعت کی مشترکہ ملکیت ہے۔

پروفیسر فرینک تھلے (Frank Thilly) اپنی مشہور و معروف کتاب "تاریخ فلسفہ" میں افلاطونی "ریاست" کی اسی اشتراکیت و اجتماعیت سے بحث کرتا ہوا رقمطراز ہوتا ہے:۔

"افلاطون کی یہ معیاری ریاست کامل جماعتی اتحاد کی خواستگار اور وسیع خاندانی اشتراک کی خواہاں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ذاتی سرمایہ اور انفرادی ملکیت کا سخت مخالف ہے۔ بلکہ وہ تو مروجہ رسومِ نکاح و شادی کے بھی خلاف ہے۔

اس کی جمہوری ریاست جماعت کے دو برتر طبقوں کے لئے کامل و مکمل اشتمالیت (Communism)
کی سفارش کرتی ہے۔ جس میں زر، زمین، زن اور زن تا اینکہ بچے بھی ریاست اور اس کی وساطت سے افراد جماعت
کی اشتمالی ملکیت قرار پاتے ہیں منجملہ دوسری اہم اشتراکی سفارشات کے اس میں یہ بھی پایا جاتا ہے کہ رسوم شادی
اور بچوں کی پیدائش۔ نیز ان کی پرورش اور تربیت وغیرہ براہ راست ریاست کی حفاظت و نگرانی میں انجام پائے
ریاست ہی کے زیر نگرانی ابتدائی اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے علوم ادب اور فنون لطیفہ۔ صناعات جمیلہ
اور معمولی دستکاریوں کی پوری پوری حفاظت بھی حکومت ہی کے ذمے ہو" (History of philosophy)
نظریہ تحسین و تربیتِ اولاد اور نظام تعلیم کے متعلق افلاطون جن اچھوتے خیالات کا اظہار کرتا ہے ان میں بھی اشتراکیت کا
عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ اس بحث کی ابتدا اس طرح کرتا ہے کہ ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے جسے اشاعتِ تہذیب و تمدن کا آلہ اور
ذریعہ سمجھنا چاہیئے اس لئے اس کی مرکزی اور بنیادی تعمیر علم و فلسفہ کے گرد ہونی چاہیئے۔ بنابریں یا تو طبقۂ حکما برسر حکومت ہو یا حکمران
جماعت کا دماغ علم و حکمت سے معمور ہو۔ بہر حال سیاسی اقتدار کا قوائے علمی سے اتفاق و اتحاد ناگزیر ہے۔ ورنہ ریاست کبھی کامیابی
حاصل نہ کر سکے گی اور جماعت کو کبھی سعادت نہ نصیب ہو سکے گی۔ اسی لئے ضرورت ہے کہ ریاست تعلیمی اداروں کا نظم و نسق خود اپنے ہاتھ
میں لے اور ان اداروں کا انتظام ایک ہی دستور العمل اور ایک ہی نصاب و اصولِ تعلیم پر جاری کیا جائے تعلیمی عمر کے چند مدارج
متعین کئے جائیں یعنی ابتدائی بیس سالوں میں جسمانی و دماغی تعلیم و تربیت دی جائے اور اس سے مرد و زن غرضیکہ دونوں جنس یکساں
طور پر مستفید ہوں وہ عورتوں کے لئے بھی جبری تعلیم کی حمایت کرتا ہے اور ان کو ایسی تربیت دینے پر زور دیتا ہے جو ان کو حربیات اور
سیاسیات میں حصہ لینے کے قابل بنا دے۔ اس مرحلے سے گزر جانے کے بعد منتخب نوجوانوں کو ان علوم و فنون میں مہارت اور تکمیل حاصل
کرنی چاہیئے۔ جن سے اُن کو نظرتاً مناسبت ہو تعلیم کا یہ درجہ موجودہ زمانے کی ثانوی تعلیم کے ہم مرتبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ زاں بعد جن نوجوانوں
میں دماغی اور جسمانی توتوں کے لحاظ سے جنگی خدمات انجام دینے کی صلاحیت ہو ان کو پانچ سال تک فوجی تعلیم دی جائے۔ زاں بعد
ان کو مناسب فوجی مناصب سے سرفراز کیا جائے۔ جہاں وہ پندرہ سال تک یہ خدمات انجام دیں اور اب جن افراد میں حکمت و فلسفہ کی جانب
نظری میلان اور ریاست و قانون کی طرف قدرتی رجحان پایا جائے وہ مستقل طور پر فلسفہ قانون کا مطالعہ شروع کر دیں۔ تا اینکہ وہ بنتیج
فرائضِ حکومت و سلطنت کی انجام دہی کے قابل ہو جائیں اور اب ان کو مہماتِ ریاست میں عملی حصہ لینے اور قومی و ملکی خدمات کو انجام
دینے کا موقع دیا جائے۔ مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ تعلیم مصنفہ فرینک گریو (Frank Graves)
اور تعلیم ہی پر کیا منحصر ہے۔ افلاطون نے جس قومیتِ متحدہ کا سیاسی تخیل اور جس وحدتِ کاملہ کا تخیلی نظریہ جمہور کے سامنے پیش کیا ہے
اس کی ظاہری صورت ایک وسیع مشترکہ خاندان کی سی ہے جس میں مختلف افراد اور جماعتیں یکساں حقوق اور مساوی حیثیت کی مالک ہیں،

جس میں افراد اور جماعتوں کے فرائض بھی یکساں ہیں اور گو ان کی نوعیتوں میں تفاوت ضرور ہے۔ مگر اصولی اشتراک اس میں بھی موجود ہے۔ افلاطون اس اشتراکی قومیت کے متعلق تفصیلی ہدایات بھی قلمبند کرتا ہے حکما کے کیا فرائض ہیں؟ اور بہادرانِ فوج کے کیا وظائف ہیں؟ اور عوام کے کیا واجبات ہیں؟ غرضکہ اُن امور کے متعلق تفصیلی مباحث موجود ہیں جن کا مشترک عنصر یہ ہے کہ ان سب میں اشتراکیت کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے الفرڈ ویبر اپنی کتاب "تاریخ فلسفہ" میں افلاطون کا مجموعی پیغام اس طرح سناتا ہے:-

"جزئی اغراض کو وسیع تر اغراض کے ماتحت کردینا چاہیئے! انفرادی اور خاندانی مفاد کو اغراضِ مملکت میں جذب ہوجانا چاہیئے۔ تاکہ مملکت بڑے پیمانے پر فرد وحد یا وحدت حقیقی بن سکے۔ دراصل مملکت ایک بڑا کنبہ ہے اور تمام افراد اس کے بچے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت بھی اسی کا کام ہے" پھر ایک دوسری جگہ کہتا ہے۔ "مملکت بمنزلہ ایک وسیع تربیت گاہ کے ہے۔ جس کا فرض یہ ہے کہ وہ دنیا میں خیر و عدل کو وجود پذیر کرے"۔

افلاطون کی "ریاست" کو "مدینۂ فاضلہ" کا ایک تخئیلی معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اسے "آسمانی بادشاہت" Kingdom of Heaven کا ایک خیالی خاکہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسے "یوٹوپین ٹائپ" (Utopian type) کی ریاست کا نمونہ بھی سمجھا جاسکتا ہے با ایں ہمہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایتھنز اور اسپارٹا بلکہ یونان کی دوسری قدیم ریاستیں بھی اس کی اس خیالی ریاست سے قریب قریب وجود کی مالک تھیں اور اس طرح کسی حد تک اس کی خیالی تجویزیں عملی صورت میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ افلاطون نے اپنے دورِ آخر کی تصنیفات میں اس جمہوری "ریاست" کے لئے علم و عقل اور ارادہ کے علاوہ جذبۂ محبت اور آزادی کو بھی لازم قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے حکمت و فلسفہ علم و عقل ہی سب کچھ نہیں۔ بلکہ ایک کامیاب ریاست کے لئے جذبۂ الفت و محبت کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی عدالت و نصفت کی اپنی مشہور و معروف کتاب قانون (Laws) میں افلاطون مطالبہ کرتا ہے کہ افراد آزاد اور خود مختار تسلیم کئے جائیں۔ افرادِ جماعت مشترکہ طور پر زمین اور اس کے منافع پر قابض و متصرف ہوں۔ تمام افراد نظم و نسقِ حکومت میں مساوی طور پر شریک و سہیم ہوں۔ نظامِ خاندان مثل سابق دورِ فطرت (State of nature) کی حیثیت و صورت اختیار کرلے۔

اس کی آخری تصنیفات میں بعض سفارشات اس قسم کی پائی جاتی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تجارتِ خارجہ و داخلہ کی خدمات اجیروں (Helots) کے سپرد ہونی چاہئیں۔ ان اجیروں کی قانونی اور معاشرتی حیثیت جو کچھ بھی قرار دی جائے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی خدمات کا منشا بھی اشتراکی ہی ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس کی ان آخری تصنیفات میں بھی ریاست کا نصب العین خیرِ محض اور سعادت ہی رہتا ہے اور اس کے قیام کا مقصد وہی افراد کی اخلاقی تعلیم و تربیت ہے۔ اسی طرح اُن میں بھی قوانین کا مقصد وہی افراد کو سعید و صالح بنانا ہے اور صلح و سعادت کے حصول و قیام کے لئے قانونی پابندیاں بہرحال ضروری ہیں۔ بالفاظ دگر ریاست کا قیام اب بھی افراد کی انفرادی ضرورتوں کو مہیا کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔

افلاطون کا نظریۂ تقسیم جماعت "مسئلۂ تقسیم کار" کا ایک بےمثال حل ہے جو عملی زندگی کی بہت سی دشواریوں کو بآسانی ختم کر سکتا ہے اور کیا عجب کہ جماعت کی یہ سہ گانہ تقسیم اس سے پہلے وجود پذیر ہو چکی ہو۔ چنانچہ اگر وسعت نظر سے کام لیا جائے تو "افلاطونی تقسیم جماعت" اہل ہند کے قدیم ضابطۂ ذات سے بہت کچھ مشابہ نظر آتی ہے۔ غالباً ضابطۂ ذات (Caste system) کی اولیں تاسیس و تشکیل اسی مناسبت فطری اور اصول تقسیم کار پر ہوئی تھی جس میں جماعت برہمن۔ کھشتری اور ویش کے سہ گانہ طبقوں میں منقسم کی گئی ہے اور ہر طبقے کے فرائض و واجبات اس کی فطری مناسبتوں کے لحاظ سے مقرر ہیں اور بہ ترتیب حکمت و قوت اور صنعت کی راہ سے عزت، حکومت اور دولت کو جماعت کے مختلف طبقوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ اس نظام کے ماتحت طبقات سہ گانہ کے نام برہمن، کھشتری اور ویش ہیں اور افلاطونی ریاست میں ان کو حکماء۔ رؤسا فوج اور صنعت کاروں کے نام سے یاد کیا ہے۔ مگر بنیادی خیال دونوں میں وہی مسئلۂ تقسیم کار اور مناسبت فطری ہے۔

یہ ہیں افلاطون کے خیالات جن کی اہمیت اس کی خیالی تجاویز کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بلند اخلاقی معیار کے باعث ہے جو اس کا نصب العین ہے۔ اس کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ افلاطون نے کم از کم نظام جماعت کے دو طبقوں کو تیسرے طبقے پر فوقیت دی۔ اسی طرح عورتوں کو مردوں کا تابع قرار دینا یقیناً مکمل مساوات کے خلاف ہے۔ تاہم اس کو اشتراکیت سرکاری State Socialism اور اشتمالیت (Communism) کے بین بین کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس کی ریاست کتنی ہی خیالی کیوں نہ ہو۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دراصل یہ اسی کی تعلیم اور اسی کے نظریے تھے جو آگے چل کر سنٹ آگسٹائن۔ ٹامس مور اور لاک۔ روسو اور سائمن کے یہاں اور نمایاں ہو جاتے ہیں اور جن پر بعد میں مارکس اجتماعیت (Collectivism) کی عظیم الشان عمارت تعمیر کرتا ہے۔ اس کے خیالات مسیحیت کے فلسفہ پر پوری طرح چھائے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کی سرحد تخیل و نظر ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ کلیسائے روما کے دور حکومت میں ایک زندہ عملی تجویز کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ارسطو۔ مگر افلاطون جس خیالی دنیا کے تصور میں محو تھا عوام الناس کم از کم اس وقت وہاں تک رسائی نہ رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی یہ اشتراکی تعلیمات زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکیں۔ دوسرے اس کے بعد ہی اس کے قابل و فاضل اور حریف مقابل شاگرد ارسطو کا زمانہ آگیا جس کے ٹھوس نظریوں نے رہی سہی افلاطونیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ یہ صاحب دماغ انسان ہر مسئلے پر عملی حیثیت سے نگاہ ڈالنے کا عادی تھا۔ اس کے نزدیک صحیح نصب العین کی تعریف یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ حد تک ممکن العمل ہو۔ اس کی دوررس اور حقیقت بین نگاہوں نے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا کہ افلاطونیت اپنے ماحول اور مخصوص حالات میں کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر اس نے افلاطونی اشتراکیت کی مخالفت کی۔ خاندانی اداروں۔ ذاتی جائداد اور شخصی ملکیت کے حقوق کو تسلیم کیا۔ بلکہ اس نے تو غلاموں کے ایک مستقل طبقے کا وجود ریاستی خدمات کے لئے ناگزیر قرار دیا! اور اس طرح اس نے مشروط مساوات اور مشروط انصاف کا عملی طور پر خاتمہ کر دیا۔

تاہم ارسطو بھی افلاطون اور افلاطونیت کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہ ہو سکا اور ہم اس کے "مدینۂ فاضلہ" میں "افلاطونی ریاست" کی پوری پوری صلاحیت پاتے ہیں۔

افسوس جس جمہوریۂ ایتھنز کو شاگرد و استاد دونوں متفق طور پر "مدینۂ فاضلہ" کا کامل نمونہ قرار دیتے تھے۔ ایک زمانہ آیا کہ خود ارسطو ہی کے شاگرد سکندر کے زمانے میں اس کی آزادی و خودمختاری کا خاتمہ ہو گیا اور صحیح معنی میں اس روز یونان کی دوسری جمہوری سیاستوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی قوم کی آزادی اور خودمختاری چھن جاتی ہے۔ تو اس میں اولوالعزمی اور بلند پروازی بھی باقی نہیں رہ جاتی۔ اب بجائے اس کے کہ وہ کسی اہم اور مشکل نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کرے عموماً آسان پسندی اور سلامت روی کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں پژمردہ بلکہ فنا ہو جاتی ہیں اور تقلید و نقالی کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ سکندر اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں یہی حال یونانیوں کا ہوا جیسے ہی ان کی آزادی چھنی اور ان کی ذمہ داریوں میں کمی آئی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سیاسی و علمی امنگوں کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ان میں ایسی جماعتیں پیدا ہو گئیں جو سیاست و فلسفہ تو ایک طرف جماعتی تعلقات اور معاشرتی زندگی سے بھی برگشتہ خاطر ہو گئیں۔

اپیکورس۔ یہی مایوس کن ماحول تھا جس میں اپیکورس پیدا ہوا۔ مگر اس عام افسردگی کا اثر اس کی منبسط و متفاول (Optimistic) طبیعت پر بالکل مختلف ہوا۔ اس نے اس سے نجات کی راہ اسی میں پائی کہ تحصیلِ مسرت کو زندگی کا نصب العین قرار دے اور انفرادیت و آزادی کا علم دوبارہ بلند کرے۔ اس کا فلسفہ ایک حد تک تحصیلِ لذت کی دعوت دیتا ہے اور یقیناً یہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔

رواقیہ۔ مگر اسی زمانے میں رواقیوں کی ایک نئی جماعت پیدا ہو گئی۔ جو زندگی کا نصب العین امن و اطمینان کو قرار دیتی تھی۔ اور خیرِ محض کے حصول کی ساعی تھی۔ اس کا بانی زینو (۳۰۰ قبل مسیح) نامی ایک فلسفی تھا جو ایتھنز کا باشندہ تھا۔ یہ افراد کو رہبانیت اور ترکِ لذات کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ فرقہ حکومت کے بارے میں ایک عجیب اور اچھوتا نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ کسی مقامی اور ایسی حکومت کا قائل نہیں جو جغرافیائی اور تاریخی حدود میں محدود ہو اور جو قوم و ملک اور رنگ و نسل کی تمیز و تعیّن میں گرفتار ہو۔ اُن کے نزدیک حکومت اس قدر وسیع اور ہمہ گیر نظام ہے کہ وہ عالمگیر آفاقیت کے مترادف ہو گیا ہے۔ دراصل اس کا مسلک نہ تو انفرادیت تھا اور نہ اشتراکیت بلکہ اس سے بھی زیادہ وسیع یعنی آفاقیت۔ یہ فرقہ اقوامِ عالم کو جسمِ واحد کے اجزا قرار دیتا تھا اور ایسے عالمگیر انسانی اتحاد کا قائل تھا جس کی ترکیب اصولِ مساوات و انصاف پر مبنی ہو۔ دوسری طرف یہ انسانی اتحاد کو قوانینِ فطرت کا بھی پابند بنانا چاہتا تھا۔ بالفاظِ دگر اس کے نزدیک قانونِ فطرت و قانونِ ریاست نظمِ جماعت کے لئے ہر دو لابدی تھے۔

یہ نظریہ متضاد خیالات کا مجموعہ ہے۔ مگر ایک بات ہر خیال میں مشترک ہے اور وہ ہے اشتراکیت کی پوری پوری صلاحیت۔ بلکہ ہم

کچھ اور آگے بڑھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا پیش کردہ نظام اشتراکیتِ سرکاری (State Socialism) کی ابتدائی صورت تھی۔ زمانہ تھا حکومتِ روما کا جس کی فرماں فرمائی کی حدود انتہائے مغرب سے انتہائے مشرقِ قریب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ حکومت کا یہ تخیل اس قوم کی بڑھتی ہوئی ہوسِ ملک گیری کے مناسب تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روما میں اس فلسفہ کی خوب اشاعت ہوئی اور یکے بعد دیگرے پولی بس اور سسرو اور دوسرے حکما گزرے جو اس آفاقی اشتراکیت کے ہمنوا تھے۔ چنانچہ پولی بس (۱۴۷ قبل مسیح) کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ روما "توازنِ قوت" کے اصول پر کاربند اور قائم تھی جس میں ایک طرف تو افسرانِ فوج کی جماعت تھی اور دوسری جانب حکمران طبقہ اور پھر ان کے ساتھ ساتھ عوام کی نمایندہ مجالس جو قانون سازی اور نظم و نسقِ مملکت میں کافی دخل رکھتی تھیں۔

بہ استثناء جمہوری نظامِ ریاست جو روم میں رائج تھا اور جس کی نقل تقریباً ہر صوبے میں کی جاتی تھی۔ مزید بریں حکومت یورپ ایشیا کے اکثر و بیشتر حصوں پر مشتمل تھی۔ اس لئے اس کو بجا طور پر اشتراکی آفاقی "ریاست قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس زمانے کی تہذیب اور تمدن کو گبن نے اپنی مشہور کتاب (Decline and fall of the Roman Empire) زوالِ روما میں پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں روما کی سلطنت دستوریت جمہوریہ کی بنیاد پر قائم تھی۔ صناعوں اور کاشتکاروں کو اپنی محنت سے پوری طرح مستفید ہونے کا موقع حاصل تھا۔ آزادی اور مساوات قانون کی اصل اور بنیاد تھے۔ فوجی افسروں اور ملازمینِ سرکار کو عوام اور مزدوروں سے معمولی سی زیادتی کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بہ حیثیت مجموعی یہ امن و اطمینان اور فارغ البالی کا زمانہ تھا۔

مگر افسوس کہ غربت و امارت کا امتیاز کسی نہ کسی صورت میں اس زمانے میں بھی موجود تھا۔ مزید برآں طول و عرض ملک میں غلاموں کی جماعت پھیلی ہوئی تھی۔ جن کی تعداد آزاد رومیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ان بدقسمت انسانوں کی زندگی مشقت اور محنت سے بسر ہوتی تھی اور اُن کے خلاف ریاست میں سخت قوانین رائج تھے۔ جن کے بے شمار قابلِ نفرت کارنامے تاریخِ روما کے صفحات پر نمایاں ہیں۔ تاہم اس زمانے میں بھی ان کی حالت اتنی خطرناک نہ تھی جتنی آج بعض ممالک میں نام نہاد آزاد شہریوں کی نظر آرہی ہے اور آنا تو ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ آزاد رومیوں کے لئے رومی سلطنت کی حیثیت خالص جمہوری تھی۔

سسرو۔ الغرض ایک طویل زمانے تک روما میں آزادی و مساوات، کا انصاف و حمیت کا اور اشتراکیت و جمہوریت کا دور دورہ رہا۔ مگر اس کے بعد مشہور معروف رومی جرنیل جولیس سیزر نے باقتدار ہو کر جمہوریت کا ایک حد تک خاتمہ کر دیا۔ اسی زمانے میں مشہور معروف اشتراکی فلسفی سسرو (۱۰۶ قبل مسیح) منصۂ شہود پر آیا۔ اس نے سیزر کی مخالفت کی اور اس کے طرزِ حکومت کو رومی تہذیب و تمدن کا زوال قرار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ رومی تہذیب و تمدن کے زوال سے روما کا سیاسی و اخلاقی زوال شروع ہو گیا۔ یہ رواقیوں کی اشتراکیتِ آفاقیہ کا ہمنوا تھا۔ یہ اتحاد و مساوات، انصاف و آزادی کو ضوابطِ ریاست اور قوانینِ فطرت قرار دیتا تھا۔ جمہوریت کی تبلیغ اور سیزر کی مخالفت اس کے لئے پیغامِ موت ثابت ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اس مخالفت کے بدلہ

میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔

زمانے کے زبردست ہاتھ اور رائے عامہ کی قوت نے جلد ہی سیزر اور اس کی مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیا۔ مگر اُس کے جانشین آگسٹس نے اپنی حکمتِ عملی سے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا اور اس طرح روما میں قدیم جمہوریت کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد روما میں نیرو نامی ایک ظالم و خونخوار انسان تختِ نشین ہوا۔ اس کے وزیر سینکا (۴ قبل مسیح) نے قدیم رومی قوانین اور جمہوری اداروں کی دوبارہ ترویج کی کوشش کی مگر اسے قطعاً کامیابی نہ ہوئی اور اس طرح روما سے جمہوریت۔ آفاقیت اور اشتراکیت کا خاتمہ ہوگیا۔ ملک میں مطلق شاہی کا دور دورہ ہوگیا اور عوام نے لاقانونیت (Anarchism) کے خوف سے ان خودمختار حکمرانوں کے مظالم برداشت کئے۔ تا اینکہ ۳۹۲ء میں قسطنطین اعظم کے زمانے میں رومی تمدن کا خاتمہ ہوگیا۔ قوم عیسائی ہو گئی اور ایک نئے فلسفہ و مذہب کی ترویج شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ اشتراکیت پھر رواج پذیر ہوئی مگر اس مرتبہ اس کی عمارت بالکل نئی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ ازمنۂ متوسطہ میں اشتراکیت کے عروج و ارتقا کی یہ ایک مجمل سی داستان ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دُور افتادہ زمانہ بھی اشتراکی مطالبات اور اشتراکیت کی آواز سے خالی نہ تھا۔ لاریب اشتراکیت فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے اور اس لئے اس کا ہر زمانے پایا جانا قطعی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ آج اس کی آواز ہر در و دیوار سے سنائی دے رہی ہے۔ مگر اُس زمانے میں اس کو اتنی قوت حاصل نہ تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انفرادیت اور سرمایہ داری بھی دورِ متوسط میں موجودہ اقتدار کی مالک نہ تھیں، ان کی تباہ کاریاں اتنی آشکارا نہ تھیں اور ان میں اتنی شدت نہ تھی جو آج پائی جاتی ہے۔

سید عزیز الرحمٰن ہاشمی گورکھپوری

ہمارا مقصدِ حیات

ہم اپنے وطن کے لئے زندہ رہیں گے! اور ہماری موت بھی اپنے وطن کے لئے ہوگی !!

ہم اپنی زندگی، اپنی دولت اور اپنی ہر چیز اپنے وطن کی عزت پر قربان کر دیں گے !!

اے میرے وطن! تو تونگر تھا لیکن آہ! اب تو مفلس ہے! دشمنوں نے تیرے خون سے اپنی خواہشات کے باغ کو خوب سینچا! اور تیری تباہی روز بروز بھیانک صورتیں اختیار کرتی جاتی ہے لیکن ہم تیرے نوجوان فرزند تیرے لئے ہر طرح کے دکھ درد سہیں گے اور تجھے آزاد کرا کے چھوڑیں گے۔ غلامی کی زنجیروں کو جو تجھے جکڑے ہوئے ہیں توڑ دینگے اور تجھے بہشت کا نمونہ بنا دینگے اور ہم ضرور کامیاب ہونگے کیونکہ آزادی ہمارا مقصدِ حیات ہے

ایم۔ زبیر احمد ارکوی

مجبور محبّت

ملائک کے کرشمے اور ثریّا کے حسیں نغمے،
سکوتِ نیم شب کے نیم خواب و مرجبیں نغمے،
تمہاری نیم باز آنکھوں میں نازک نیند سوتے ہیں۔
پرستاں کے فسانوں میں ترنّم کی ضیاؤں میں،
دلِ مخمور کے رنگیں تصوّر کی فضاؤں میں،
جہاں انجم فسونِ کیف سے بے ہوش ہوتے ہیں،
تمہارے حسن نے فردوس کے منظر کئے پیدا،
جہانِ خوبیٔ ممکن کی تم تکمیل ہو گویا۔

فریبِ آرزو! تم بے خبر ہو میں تڑپتا ہوں
کہ میری یاس کی شدّت تمہیں معلوم ہو جائے،
حجابِ پاسِ دنیا ہی کہیں معدوم ہو جائے،
تمہیں ملتا ہوں چپ رہتا ہوں کچھ کہنے سے ڈرتا ہوں۔
بڑی مجبور الفت ہے بڑی محروم الفت ہے
کہ آنکھوں میں تمہارا حسن ہے اور تم سے فرقت ہے

محمد جمیل واسطی

چڑیا

لکس! لکس! او بھدی صورت! میلے کچیلے! بے رحم کتے! ادھر آؤ! فوراً واپس آ جاؤ!"

کتے تک پہنچنے سے پہلے پہلے لڑکی کے ننھے دماغ میں جو تحقیر آمیز الفاظ آئے اس نے اپنے جوش کے اظہار کے لئے کہہ ڈالے۔ چھوٹے چھوٹے بالوں والا سفید رنگ کا کتا ایکھونسل سے تھا۔ اس کے بائیں کان سے لے کر منہ کے ایک حصے تک کالے بالوں کی ایک دھاری سی چلی گئی تھی جس سے وہ بہت ہی مکار معلوم ہوتا تھا۔ دنیا کا کوئی کتا بھی تحقیر آمیز بے پروائی کے اظہار کے لئے ایسی شکل نہیں بنا سکتا۔ اس نے لڑکی کے خوبصورت بکھرے ہوئے بالوں کی طرف سر اٹھا کر ایک لمحے کے لئے دیکھا وہ اس کی طرف دوڑی آ رہی تھی۔ پھر اس نے بے پروائی سے دوبارہ اپنی توجہ ایک چھوٹی سی زندہ چیز کی طرف مبذول کر لی جو گھاس میں پڑی ہل رہی تھی۔ کتا اس کے نزدیک اپنی ناک لے جا کر سونگھنے لگا اور اس پر آہستہ آہستہ اپنا پنجہ پھیرنے لگا۔

"پیچھے ہٹ جایئے جناب!" کہہ کر آٹھ سال کی کم سن اور نازک لڑکی نے پوری قوت سے کتے کے پہلو پر ایک مُکا رسید کیا یا یوں کہئے کہ پایا نے مکا تو کتے کو مارا لیکن چوٹ اُسے خود آ گئی اور آئی بھی خوب کیونکہ کتے کو اپنے خاندان کے علاوہ شاید وہیل مچھلی سے بھی کچھ اثر ورثہ میں ملا تھا۔ اس کے پہلو تو بالکل وہیل مچھلی کی ہڈی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

پایا کا منہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس نے جھک کر گھاس پر سے اس ننھی سی جان کو اٹھا لیا اور اپنے بوسوں سے اُسے گرم کر دیا۔ آہ یہ کس قدر چھوٹی اور کس قدر قابل رحم ہے ——— "ایک ننھی سی چڑیا" ——— باغ میں ایک نہایت ہی پرانا اونچا سا درخت تھا۔ جس پر چڑیا کا گھونسلا تھا۔ یہ اس گھونسلے سے قبل از وقت اُڑ کر گر پڑی تھی۔ اس نے ابھی پوری طرح اڑنا بھی نہ سیکھا تھا۔ لڑکی نے دل میں کہا درخت کی چوٹی تو مینار تک جا پہنچی ہے اور اس کی گھنی شاخیں خود بھی ایک جنگل ہیں۔ اب اس تھکی ماندی چڑیا کو اپنے گھر کا راستہ کیسے ملے گا؟

چڑیا کو خود بھی اپنی بدقسمتی کا علم تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ نہایت دردناک آواز سے چوں چوں کرنے لگ جاتی اور اپنی چمکدار سیاہ آنکھیں خوف اور تکلیف سے بند کر لیتی اور اپنا جسم سمٹا لیتی۔ اُف! اس کا دل کس زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ لڑکی نے سوچا یہ ضرور سخت زخمی ہو گئی ہے یقیناً اس میلے کچیلے کتے نے اس کی چھاتی توڑ ڈالی ہے افسوس مجھے کس طرح معلوم ہو کہ اس کم بخت نے کیا شرارت کی ہے؟ اب بھی اس شوخ کتے کی اتنی جرأت تھی کہ اس نے اپنی تھوتھنی بچی کے کندھے پر رکھ دی جسے وہ ابھی

ابھی کئی دفعہ زبان سے چاٹ چکا تھا۔ اس کا دھوکا دینے کا سادہ انداز اور اس کی ”فصیح“ آنکھیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ ”مجھے میری چیز واپس دے دو یہ میں نے پائی ہے اور میری ہے میں اس سے کھیلنا چاہتا ہوں۔ جب میں اسے اپنے پنجے سے چھوتا ہوں تو یہ کیسی عمدگی سے سمٹ جاتی ہے“۔

پاپا نے پھر حقارت سے کہا ”ہٹ جاؤ جی“ اور دوڑ کر کتے کو اپنے پاؤں سے زور کی ایک ٹھوکر لگائی جس سے اس کے نازک ٹخنے کا جوڑ اپنی جگہ سے ٹلتے ٹلتے رہا لیکن کتا اپنے دل میں ضرور مسکرا پڑا ہوگا۔

وہ دوڑ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور چڑیا کو دودھ اور روٹی کے ٹکڑے کھلانے لگی۔ وہ جانور پالنے کا فن جانتی تھی۔ گزشتہ سال اس نے نہایت کامیابی سے چڑیا کے تین بچوں کو جو اپنے گھونسلے سے گر گئے تھے پال لیا تھا اور اُن میں سے دو تو اس چڑیا سے بھی بڑے ہوگئے تھے لیکن وہ تو پھر بھی موٹی موٹی اور بے ڈول چڑیاں تھیں اور ہزاروں ایسی اڑتی پھرتی ہیں اور یہ تو عام چڑیوں سے بالکل مختلف نہایت خوبصورت اور نازک چڑیا تھی۔

ننھی چڑیا اپنی محسنہ کی دی ہوئی خوراک نہ کھاتی اور جب وہ آہستہ سے اس کی چونچ کھول کر اس میں دودھ ڈالتی تو وہ نہ پیتی۔

گھر کی باورچن پیسٹری بورڈ کے قریب کھڑی تھی۔ باورچن کیا تھی لمبے قد کی ایک لحیم و شحیم عورت شوربے کی پلیٹ کے سے چہرے والی اوپر چھائی ہوئی آنکھوں والی ڈائن۔ اس نے چڑیا کی طرف نہایت ترحم آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا ”تم نے تو بیچاری چڑیا کو سخت دق کر رکھا ہے۔ مجھے دو میں اس کی تکلیف کا خاتمہ کر دوں گی“۔

پاپا کو سخت غصہ آگیا اس نے اپنا خوبصورت سر اوپر اٹھایا اور اسے ذرا اوپر کی طرف جنبش دیتے ہوئے کہنے لگی ”تو اپنا ہی خاتمہ کریگی“ بیشمار کبوتروں، چوزوں، وتیتروں کی قاتلہ، نہایت حقارت آمیز منہ بنا کر ذرا غصے سے بولی ”میں ظالم نہیں ہوں میں کبھی ایک غریب اور بے کس جانور کو اپنے کھیلنے کے لئے اس طرح تکلیف نہ دوں“۔

باورچن کی ڈانٹ سن کر پاپا کانپ گئی اور اس پیشہ ور قاتلہ سے بچنے کے لئے باورچی خانہ چھوڑ کر بھاگ گئی۔

”اُف یہ باورچن کس قدر خوفناک باتیں کہہ سکتی ہے اور جو شاید درست بھی ہیں“۔ کیونکہ میں اس سے کھیلنا چاہتی ہوں“؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ بلکہ بھی زیادہ قصوروار ہے کیونکہ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں لیکن انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگلے دن کیا ہوا تھا۔ جب بوڑھے فلاک کے لئے ڈاکٹر نری سرجن بلایا گیا اور اس نے کہہ دیا کہ یہ لاعلاج ہے؟ دادی اماں نے ابا سے کہہ دیا تھا کہ اس پر رحم کرو اور اسے گولی سے مار دو تاکہ یہ بغیر تکلیف کے مر جائے۔ اس پر پاپا نے اپنی بندوق لے کر فلاک کو مار ڈالا تھا“ وہ اُن کا بہت پیارا کتا تھا۔

پاپا نے آہستہ سے چڑیا کے کان میں کہا ”تم میری پیاری ہو میں تم پر رحم کروں گی میں جانتی ہوں کہ تمہارے لئے یا کسی اور پرندے کے

لئے بہترین موت کیا ہو سکتی ہے۔ تم آخری لمحہ تک خیال کرتی رہو گی کہ میں اڑ رہی ہوں، پھر تم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاؤ گی ایک پرندے کے لئے تمام باتوں کا خاتمہ یہی ہے"۔

وہ دوڑ کر صحن کے پار چلی گئی، دربرآمدے میں سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی بالاخانے پر چوکیدار کے کمرے میں جا پہنچی۔

چوکیدار نام ہی کا چوکیدار تھا وہ نہایت پرانا نوکر تھا جسے سوائے ناس لینے اور سونے کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ بالاخانے کے برج کو تو وہ اپنی ملکیت ہی سمجھے بیٹھا تھا۔ خود تو کبھی اوپر نہ گیا تھا ہاں البتہ اس کی بوڑھی بلی ٹام نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا کہ ہر آنے والے کے ساتھ اوپر تک جائے چوکیدار کے کمرے کا نصف پٹ کھلا تھا اس میں ایک سوراخ بھی تھا جس کے قریب سے گزرتے ہوئے پاپا نے اندر ایک نگاہ ڈالی۔ بوڑھا آدمی اپنی آرام کرسی پر سویا پڑا تھا اور اس کے دوسری طرف ٹام میز پر بیٹھی محافظت کر رہی تھی۔

جونہی اس نے لڑکی کو آتے دیکھا میز پر سے کود پڑی اور اپنے آپ کو سکیڑ کر دروازے کی درز میں سے سانپ کی طرح نکل کر بے پاؤں اس کے ساتھ ہولی اور نزدیک آ کر اس کی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ اس نے نہایت تعجب سے اپنی گول گول مقناطیسی آنکھوں سے پاپا کو گھورنا شروع کیا۔ معلوم نہیں اس نے پرندے کی بو پائی یا خود ہی اُسے پتہ لگ گیا کہ لڑکی کے ہاتھ میں کیا ہے۔

زینہ گرد سے اٹا پڑا تھا جس پر شفق کی دھیمی دھیمی روشنی پڑ رہی تھی۔ کھڑکیوں پر بھی گرد ہی گرد نظر آتی تھی۔ کھڑکیاں کیا تھیں محض چوکھٹے رہ گئے تھے۔ جن پر مکڑی نے جالا تن رکھا تھا۔ کبھی کبھی کوئی چیز دوڑ کر پاس سے گذر جاتی —— شاید چوہے تھے! اس کے بعد کمرے میں کچھ گڑبڑ سنائی دیتی اور کسی جاندار کی خوف اور تکلیف کی تیز اور باریک آواز کی چیخیں سننے میں آتیں۔ تھوڑی دیر بعد شکاری جانور پاپا کے پاس واپس جاملا اور اپنی زرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پاپا کی طرف دیکھنے لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلی یہ کہہ رہی ہے "لیکن مجھے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اور ہے تم مجھے اس سے محروم رکھنا چاہتی ہو لیکن یاد رکھو میں اسے لے کر رہوں گی۔ میرے پنجے بہت تیز ہیں"۔

لڑکی ڈر گئی اور دوڑ کر زینے پر چڑھنے لگی آج تو زینہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا۔ اُف! زینہ کس قدر بلند ہے اور اس کے پیچدار راستے نے تو دماغ ہی چکرا دیا ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارد گرد کی تمام چیزیں گھوم رہی ہیں۔

دفعتہً چڑیا کو جنبش ہوئی اس نے اپنے پر پھڑپھڑائے اس کے ننھے بازوؤں کو ایک جھٹکا سا لگا اور پھر وہ بالکل ساکت ہو گئی۔ وہ بالکل جنبش نہ کرتی تھی شاید یہ اس کے آخری لمحات تھے۔ اب پاپا غالباً ایک نعش اٹھائے لئے جا رہی تھی۔

کس قدر بھیانک خیال تھا —— موت کا یہ خیال! وہ کانپ گئی اور آہستہ سے چڑیا کے پاس اپنے ننھے ننھے ہونٹ لے جا کر کہنے لگی "مت مرو! مت مرو! تم میرے ہاتھوں میں نہ مرو" اس نے پرندے کے سر کو اپنے گال سے لگا لیا اور اپنی سانس سے اُسے گرم کرنے لگی۔

بلی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ اچھل کر لڑکی کے قریب آ گئی اور میاؤں میاؤں کر کے اُسے دھمکیاں دینے لگی۔ لڑکی کے دل میں ایک بزدلانہ خیال آیا۔ کیا میں پرندہ اسے دے دوں۔ یہ تو اب مر ہی چکا ہے"۔ لیکن شاید اس کی جان پوری طرح نہیں نکلی اور بلی کی چیر پھاڑ

کے خیال سے یہ بہت ڈرے گی اور اسے تکلیف ہوگی"۔نہیں کبھی نہیں! میں اسے نہیں دونگی۔ میں اپنی مرضی کی مالک خود ہوں میں کیوں ایک بوڑھی بلّی سے شکست کھاؤں۔

دور ہو! میری آنکھوں سے دور ہو! ——— تو تو ایسی ذلیل ہے کہ تجھے بلّی کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے"۔

بچی دل ہی دل میں خوش ہونے لگی اور کہنے لگی "آہا آہا اس بلّی کے لئے میں نے کیسی اچھی گالی سوچی ہے"۔

اس کے بعد وہ پھر دوڑ کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگی آخر وہ اُس دروازے کے قریب پہنچ گئی جس کے آگے ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ دروازے کی پرانی لکڑی میں شگاف ہو گئے تھے جن میں سے سورج کی سنہری اور رنگ برنگی شعاعیں اندر آرہی تھیں۔ پایا نے دروازہ کھولا اور باہر چبوترے پر آگئی۔ بلّی بھی اس کے قدموں میں موجود تھی۔ اب اُسے بلّی سے کوئی خوف معلوم نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ پھر اُس نے ننھی چڑیا کا منہ چوما۔ "اب میں تم پر رحم کرتی ہوں تمہیں اور تکلیف نہ ہوگی۔ تم گرتی جاؤگی، گرتی جاؤگی لیکن تمہیں یہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوگا" اس کے بعد لڑکی نے بالاخانے کی چوٹی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔

بہت سے درختوں کی چوٹیاں یہاں تک آپہنچی تھیں اور پرانا درخت تو سب سے بڑھ گیا تھا اور اس قدر قریب تھا کہ آدمی شاید اُسے چھو بھی سکے۔ سب سے اونچی ٹہنیوں میں کچھ جنبش ہوئی اور کسی پرندے کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور ساتھ ہی پرندے کی مضطربانہ چیخ پکار سنائی دی۔ لڑکی چلّا کر بولی "یہ تم ہو؟ ——— چڑیا کی اماں؟ آہ تم بھی کیسی بدقسمت ہو! تمہاری بچی آرہی ہے لیکن افسوس کہ وقت سے بہت دیر بعد۔ اب یہ مر چکی ہے۔" پایا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا بلّی اچک کر منڈیر پر جا بیٹھی۔

لڑکی نے چلّا کر کہا "میں تمہیں ہرگز نہ دونگی! ——— ہرگز نہیں" ایک لمحے کے لئے اس نے زور سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور مٹھی کھولدی۔ ایک لمحے تک چڑیا نیچے کی طرف گری۔ اس کے بعد ——— او خدا ——— اچھے خدا! یہ مردہ تو نہ تھی ——— یہ زندہ تھی! اس نے اپنے پر پھیلائے، اس کے گلے سے خوف میں ملی ہوئی مسرت کی ایک آواز نکلی اور وہ کچھ عجیب طرح اڑتی ہوئی جیسے کوئی مدہوش ہو پرانے درخت کی بالائی شاخوں میں جا پہنچی۔ وہاں مسرت بھری آوازوں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت مضطرب ہو کر اس سے پوچھ رہا ہے "تم اچھی تو ہو؟ سچ مچ؟ بالکل اچھی؟"

"اب اس کو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔ پایا نے چلّا کر یہ الفاظ کہے اور پھر بلّی کے افسردہ اور مایوس گول چہرے کی طرف دیکھ کر ایک قہقہہ لگا کر بولی "بیوقوف بڈھی بلّی! لگا اس کے پیچھے چھلانگ! اور اسے پکڑلے! وہ اب محفوظ ہے تجھ سے اور اپنے سب دشمنوں سے وہ اب اپنی ماں کے پاس ہے"۔

ننھی لڑکی وہیں ٹھیر گئی اور خیالات میں کھو گئی۔ اپنے اور چڑیا کے درمیان فاصلہ دیکھ کر اُس نے آہستہ سے یہ لفظ دہرائے۔

"اپنی اماں کے پاس"۔

اُسے بالکل خبر نہ تھی کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ وہ اس قدر ننھی تھی . . . . . لیکن ایک پرندے اور ایک بچے کے لئے ضرور یہ ایک دل خوش کن بات ہے۔

مہدی علی خاں

میرے پھول

میرے گھر میں تجھ سے نور   میرا ٹیلا[1] تجھ سے طور

میری جنت کی تو حور   تیری خوشی مجھ کو منظور

پھولوں میں اے میرے پھول

گانا گا اور جھولا جھول

تیری باتوں میں ہے رس   بجلی سی ہے تیرا مس

عمر ہے تیری چار برس   اللہ بس باقی ہے ہوس

پھولوں میں اے میرے پھول

جھولا جھول اور سب کچھ بھول

بشیر احمد

---

[1] جہاں اب "المنظر" ہے وہاں پہلے ایک بلند ٹیلا تھا۔

روحانیات

علمی نقطۂ نظر سے

قدیم زمانے سے روحوں کے ساتھ تعلقات اور گفتگو کا پتہ لگتا ہے، چنانچہ ایک نامعلوم مدت سے ہندوستان، مصر اور چین کے باشندے اس کے متعلق متفرق ذرائع سے تجربات کرتے رہے ہیں اور ان کے نتائج تحقیقات، جدید تحقیقات کے نتائج سے زیادہ دوررس اور وسیع ہیں. کوئی زمانہ ایسے اشخاص سے خالی نہیں رہا جو پوشیدہ طور پر اس کے متعلق کوشش نہ کرتے رہے ہوں اور یہ رازداری اس لئے تھی تاکہ عام اشاعت اور رسوائی سے محفوظ رہ سکیں. اس سلسلے میں جو نئے حقائق منظرِ عام پر آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ آج مغرب کے اربابِ سائنس نے اپنے مشہور طریقہ بحث و تفتیش اور معروف اسلوبِ تدقیق تجسس کے ساتھ اس مسئلے کی جانب اپنی توجہ مبذول کی ہے. سائنس نے اب تک اس کے متعلق جس قدر تجربات کئے ہیں ان کے نتائج حیرت انگیز اور مہتم بالشان ہیں اور اربابِ غرض نے اس پر ابہام و غموض کے جو پردے ڈال دیئے تھے وہ چاک ہوتے جا رہے ہیں۔

۱۸۴۶ء میں جب کہ مادہ پرستی اپنے عروج پر تھی شہر ہیڈسفل (امریکہ) کی پولیس کو اطلاع ملی کہ میڈم فوکس کے مکان میں ایک "روح" ظاہر ہوتی ہے جو گھر والوں کے ساتھ دیواروں اور میزوں پر صوتی اشارات کے ذریعہ سے گفتگو کرتی ہے اس نے بیان کیا کہ وہ ایک مقتول کی روح ہے جو اس گھر میں ایک شخص کے ساتھ رہتا تھا. اس شخص نے مقتول کو دھوکے سے قتل کر کے وہیں دفن کر دیا اور اس کے مال پر خود قبضہ جما لیا. پولیس کو مقتول کے مفقود الخبر ہو جانے کا تو علم تھا مگر اس سے زیادہ اُسے کچھ معلوم نہ تھا. جب میڈم فوکس نے اپنے مکان کے واقعات کی پولیس کو اطلاع کی تو پولیس خفیہ طور پر وہاں آئی اور نہایت احتیاط سے اس قسم کے تمام انتظامات عمل میں لائی جن سے فریب کاری کے جملہ امکانات کا کلیتہً خاتمہ ہو جاتا تھا. یہاں تک کہ ہمسایہ مکانات کی چھتوں وغیرہ پر بھی نگرانی قائم کر دی. ان تمام پیش بندیوں کے علی الرغم "روح" آئی اور اُس نے پولیس کے سامنے وہ تمام واقعات دہرائے جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے. پولیس اس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور معاملہ حکومت کے روبرو پیش کر دیا گیا. حکومت نے اپنے چند ذمہ دار افسروں کو مامور کیا کہ وہ خود اپنے مواجہ میں اس کی تحقیقات عمل میں لائیں. ان لوگوں نے بھی ہر ممکن احتیاط کا انتظام کیا اور کوشش کی کہ اگر فریب کاری کا کوئی شائبہ ہو تو منظرِ عام پر آ جائے. مگر روح بدستور آئی اور پولیس کی طرح اربابِ حکومت کو بھی واقعاتِ متذکرہ سے آگاہ کیا. حکومت نے روح کے بتائے ہوئے مقام کو کھودنے کا حکم دیا اور حقیقت میں وہاں سے مقتول کی لاش برآمد ہو گئی، نیز قاتل بھی گرفتار کر لیا گیا!

اس واقعہ نے ممالکِ متحدہ کی رائے عامہ میں ہیجان پیدا کر دیا۔ میڈم فوکس کے مکان پر بہت سے عقلا اور اہلِ علم جمع ہوئے مثلاً مسٹر اوڈ منڈس صدر دارالحکومتِ (ممالک متحدہ) مسٹر میپس پروفیسر نیویارک یونیورسٹی اور علامۂ کبیر ہا ئر وغیرہ۔ ان تمام اصحاب نے تحقیق کر کے واقعے کو صحیح قرار دیا اور اس کے متعلق متعدد کتابیں شائع کی گئیں۔ مزید جستجو سے معلوم ہوا کہ تجربے کے لئے ایک وسیط (معمول) کی ضرورت ہے اور میڈم فوکس کے مکان والی روح دو چھوٹی بچیوں کے ذریعہ سے حاضر ہوتی ہے۔

رسائل و اخبارات میں اس مسئلے پر دل کھول کر بحث ہوئی اور یہ تحریک شدہ شدہ یورپ تک جا پہنچی وہاں بھی وسیطوں (معمولوں) کی تلاش شروع ہوئی تاکہ ہر جگہ عالمِ ارواح کے ساتھ تعلقات قائم کئے جا سکیں۔ انگلستان، فرانس اور جرمنی میں خصوصیت کے ساتھ اس موضوع سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی اور تمام تحقیق و استقرار کا خلاصہ یہ نکلا کہ معاملہ یقیناً اہم اور قابلِ توجہ ہے۔

انگلستان میں ۳۰ سے زیادہ علما کی ایک کمیٹی بنائی گئی تاکہ وہ اس معاملہ پر علمی نقطۂ نظر سے غور کریں۔ یہ کمیٹی ۱½ سال تک کام کرتی رہی۔ اتفاق سے اس کمیٹی کا ایک رکن وسیط بننے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ اس لئے کرایہ کے وسیطوں کی ضرورت نہ رہی۔ ان کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب نے بالاتفاق ان خوارق کا امکان تسلیم کیا اور ۴۱۵ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ پیش کی جس کا اکثر زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ ہر شہر میں بہت سے علما نے اس مسئلے میں تحقیقات شروع کر دی اور اس کے لئے کثیر التعداد انجمنیں معرضِ وجود میں آگئیں۔ یہ مباحث روز بروز نشو و نما پاتے اور ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے لئے خصوصیت سے بہت سے علمی ادارے بن گئے اور سینکڑوں رسائل جاری ہو گئے۔ متعدد کانفرنسیں خاص اسی مقصد سے منعقد ہوئیں اور ان میں ہزاروں علما و محققین نے شرکت کی۔ ان اداروں میں سے "جمعیتِ مباحثِ نفسیہ" بہت مشہور اور آج بھی موجود ہے۔ اسے انگلستان کے علما نے ۱۸۸۲ء میں قائم کیا تھا اور یہ اپنے تجربات بیسیوں مجلدات میں شائع کر چکی ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ اور جرمنی کی اسی نام کی انجمنیں بھی کافی شہرت رکھتی ہیں۔

ان انجمنوں کو روحانی اکادمی پیرس میں (جو ۱۹۱۹ء میں اپنی خاص عمارت میں قائم ہوئی اور حکومتِ فرانس کی جانب سے رفاہِ عام کے اداروں میں تسلیم کی گئی) پروفیسر علامہ شارل ریشے (نمایندہ فرنچ اکادمی) کی صدارت، اور ڈاکٹر کیلمٹ (نمایندہ محکمۂ حفظانِ صحت پیرس) اور پروفیسر ڈارسونفال (نمایندۂ سوربون یونیورسٹی) کی رکنیت اور دوسرے بڑے بڑے جلیل القدر مشاہیر و علما کی شرکت کا فخر حاصل ہوا۔ موسیو جان میئیے نے اس اکادمی کو اپنے مقاصد کی اشاعت کے لئے ایک گرانقدر عطیہ پیش کیا جس سے ۴ لاکھ فرانک سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔

ہر متمدن شہر میں جو بے شمار دوسرے درجہ کی انجمنیں ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ موضوع انسان کے مخصوص ترین میلانات کی ترجمانی کرتا ہے اس لئے وہ اس پر اتنی ہی توجہ صرف کرتا ہے جتنی خود اپنی ذات پر۔ دوسری حیثیت سے دیکھئے تو یہ موضوع علم (سائنس) کے لئے ایک غیر محدود میدان کھول دیتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان اسرارِ کائنات کے رموز حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے ایسے رازوں کا انکشاف کرتا ہے جو خواب میں بھی خیال میں نہ آسکتے تھے چہ جائیکہ ان کی

تہ تک رسائی کا امکان پیدا ہو۔

یورپ اور امریکہ کے علماء ۱۸۴۶ء سے اُن رُوحانی تجربات میں مصروف ہیں جو ابتداً دیواروں اور میزوں پر صوتی اشارات کی صورت میں شروع ہوئے تھے، پھر بتدریج ترقی کر کے حروف لکھوانے اور وسیطوں کے ہاتھ سے ایسے رسم الخط اور ایسی زبانوں میں لکھنے تک ترقی کر گئے جن سے وسیط قطعاً ناواقف تھے۔ اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا اور قلم، کسی شخص کے ہاتھ لگائے بغیر خود بخود لکھنے لگا۔ روحوں سے فوق العادت مادّی امور کی فرمائش کی گئی اور کرسیاں اور میزیں خود بخود معلق ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ انگریزی اکادمی کے ۸۔ ارکان ایک میز پر بیٹھ گئے اور وہ میز چھت تک اٹھ گئی۔ فرمائش کرنے پر دیوار کے اُس طرف کی اشیا حاضر کر دی گئیں مقفل آہنی صندوقوں میں جو چیز چاہی داخل کر دی گئی، ہاتھ پاؤں کے نشانات خود بخود پیدا ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ روحیں اپنی سابقہ جسمانی شکل میں ظاہر ہونے لگیں اور وزن کرنے، دیکھ بھال کرنے اور تصویر لینے کا موقع دینے لگیں۔ یہ تمام امور یورپ اور امریکہ کے ایسے لوگوں کی موجودگی میں رُونما ہوئے جن پر ۸۰ سال سے زائد مدت کے دوران میں علم و شہرت کے اعتبار سے کبھی کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی گئی۔

ان تمام واقعات میں اب شک کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کیمبرج یونیورسٹی کے ایک مشہور پروفیسر سجوک (Sidgwick) جو انگلستان کے سب سے زیادہ غیر اثر پذیر عالم سمجھے جاتے ہیں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:-

"—— یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہو گی اگر ان رُوحانی واقعات کی صحت میں شک کیا جائے جن کے متعلق ماہرینِ خصوصی کی ایک بہت بڑی جماعت نے اجتماعی اور انفرادی طور پر بطورِ شاہد اپنی تصدیق کا اعلان کیا ہے اور دوسری جماعت نے ان مسائل کے حل کرنے میں انتہائی اہتمام کا اظہار کیا ہے، اگر علمی دنیا ان تمام امور کے باوجود سادگی کے ساتھ احمقانہ انکار کا سلسلہ جاری رکھے تو اسے ضد کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں ——؟"

لیکن اصل مسئلہ جس نے عقلیں حیران کر رکھی ہیں اور جو محققین کے درمیان مابہ النزاع بنا ہوا ہے وہ روحوں کے تشخص کی صحت کا مسئلہ ہے یعنی یہ کہ کیا واقعی یہ انہی مُردوں کی روحیں ہیں جن کی ظاہر کی جاتی ہیں یا کسی دوسری قسم کی روحیں ہیں جو عالم اثیری میں موجود ہیں اور بیان کردہ روحوں کا نام اختیار کر کے اُن کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یا خود وسیط کی روح ہے جو لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے اور اُن سے مُردوں کی زبان میں گفتگو کرتی ہے۔ یا کسی قسم کی ذہنی روح ہوتی ہے جس کے عناصر حاضرینِ تجربہ گاہ کی ارواح کے مجموعے سے ان کے قصد و ارادہ کے بغیر تالیف پذیر ہو جاتے ہیں اور جو ایک مصنوعی شخصیت کی صورت اختیار کر کے اور حاضرین کے مافی الضمیر کو پڑھ کر جوابات پیش کر دیتی ہے، یا اس کا تعلق اُس مادّی کائنات سے ہے جو میت کے سامان اور اُس کی نشانیوں کی صورت میں باقی رہ جاتی ہے؟

بعض علما اس امر کو ترجیح دیتے ہیں کہ ان واقعات کے ظہور میں وسیط کی روح کو بڑا دخل ہے۔ اس کے ثبوت میں منفعتی اکادمی شہر بلفورسٹ کے میکانی مدرس پروفیسر کرافورڈ کے قطعی تجربات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے روحانی واقعات میں وسیط کے تعلق کو دریافت کرنے کے لئے اسے ایک میزانچہ (Weighing machine) پر بٹھا دیا اور اس روح سے جو اس کے توسط سے ظاہر ہوتی تھی فرمائش کی کہ کمرے میں رکھی ہوئی میز کو اٹھالے۔ فرمائش کی تعمیل ہوئی۔ اس وقت پروفیسر کرافورڈ نے میزانچہ کی سوئی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وسیط کے وزن میں میز کے وزن کے برابر اضافہ ہوگیا ہے!

یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ جب روحیں جسمانیت اختیار کرلیتی ہیں اور ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ جسم کہاں سے حاصل کیا تو وہ جواب دیتی ہیں کہ وسیط کے جسم یا حاضرین کے اجسام سے امداد حاصل کی ہے یعنی انہوں نے اِن مادوں کو حل کرکے اُن سے اپنے لئے ایک نیا جسم تیار کرلیا ہے۔ تحقیقات سے یہ جواب صحیح ثابت ہوا۔ کیونکہ روح کے تجسم کے دوران میں وسیط کا وزن نصف کے قریب کم ہوجاتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وسیط کے جسم کا نچلا نصف حصہ تجربہ کے دوران میں تحلیل ہوکر غائب ہوجاتا ہے اور روح کے چلے جانے کے بعد اصل حالت پہ لوٹ آتا ہے۔

یہ تمام مشاہدات بتاتے ہیں کہ ان واقعات کے ظہور میں وسیط کا ضرور کچھ نہ کچھ دخل ہوتا ہے۔ یہ دخل اس کی روح مع عصبی قوی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اگرچہ اس نے کسی چیز کو چھوا نہ ہو اور وہ تجربہ کرنے والوں سے فاصلے پر بیٹھا ہو۔

شوپنہار کے جانشین فلسفی اڈورڈ ہارٹ مین نے اپنی کتاب "—ایمانس اسپرٹیمیس—" میں ان تمام واقعات کی ذمہ داری وسیط پر عائد کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تجربات کے جلسوں میں جو کچھ ہوتا ہے اسے وسیط کی رُوح کرتی ہے یہاں تک کہ تجسم بھی جس نے محققین کو حیران بنا رکھا ہے۔ وسیط کی رُوح بعض اوقات اپنے جسم سے نکل کر خود وسیط کے جسم سے یا خارجی مواد سے اپنے لئے خاص قسم کا جسم اختیار کرلیتی ہے۔ وہ اپنے تجرّد اور روحِ مطلق کے ساتھ اتصال کی وجہ سے "ما کان و ما یکون" (ماضی، حال اور مستقبل کے جملہ واقعات) سے واقف ہوجاتی ہے اور اس سے زمین و آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔

علامہ الگزنڈر اکزاکوف نے اپنی کتاب "انیمزم و اسپرٹزم" میں اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"——فرض کیجئے کہ پروفیسر اڈورڈ ہارٹمین کا مسلک صحیح ہے۔ وہ روح مجرد ہوکر روحِ مطلق سے اتصال پیدا کرلیتی ہے اور ہر چیز سے واقف ہوجاتی ہے لیکن کیا یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ روح اپنے اس برگزیدہ تجرد اور روح القدس کے ساتھ اتصال کی حالت میں کذب کی مرتکب ہوگی اور یہ غلط دعوی کرسکے گی کہ میں فلاں مرنے کی رُوح ہوں حالانکہ وہ اس کی روح نہ ہو——؟"

جرمن فلسفی کو اس سے بہتر جواب نہیں دیا جاسکتا!

اس کے ساتھ مشہور پروفیسر رسل ولاس جس نے ڈارون کے ساتھ "انتخابِ طبعی" کا اصول دریافت کیا تھا، اپنی کتاب "اسپرٹزم اور معجزات موجودہ زمانے میں" میں تحریر کرتا ہے کہ وہ شخصیتِ ارواح کی صحت کا قائل ہے۔ کیونکہ یہ امر اُس کے تخیل میں نہیں آسکتا کہ تمام کائناتِ روحانی اس قدر طویل مدت تک دنیا کے مختلف ملکوں میں جہاں یہ واقعات رونما ہوئے کسی منفرد استثنا کے بغیر لوگوں کو دھوکا دیتی اور گمراہی میں مبتلا کرتی رہی ہو۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بعض شریر روحیں دوسری روحوں کی شخصیت اختیار نہ کرلیتی ہوں۔ مگر وہ عموماً پہچان لی جاتی ہیں اور اعتراف کرتی ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا اُس کا مقصد محض تجربہ کرنے والوں سے تمسخر کرنا تھا۔

طلب کردہ روحوں کا مردوں کے ان تمام اسرار کی صحیح خبر دینا جنہیں اُن کے قریب ترین اعزہ کے سوا کوئی نہیں جانتا بلکہ بعض اوقات جنہیں کوئی بھی نہیں جانتا — اس میں اور اس قسم کے دوسرے واقعات میں ایک علمی اصول کی بنا پر تشکک کا اظہار کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تنویم مقناطیسی کے ذریعہ سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کی ظاہری شخصیت کے ماورا ایک روحانی ترقی یافتہ شخصیت بھی موجود ہے جو تنویم مقناطیسی کے معمولین میں ظاہر ہوتی ہے اور حاضرین کے اسرار معلوم کرلیتی ہے، ان کے خیالات پڑھ لیتی ہے، ایسی زبانوں میں گفتگو کرتی ہے جنہیں عامل معمول اور حاضرینِ جلسہ میں سے کوئی نہیں جانتا، بعید مقامات بلکہ دور دراز ممالک تک جاتی ہے اور حسبِ ہدایت وہاں کے حالات و واقعات کو دیکھتی اور صحیح طریقے پر بیان کردیتی ہے یہی روح جسم کی پرورش کرتی ہے اُس کے مفاسد کی اصلاح کرتی ہے اور حکم کے مطابق جسم میں علاماتِ مرض بلکہ زخم اور گھاؤ پیدا کردیتی ہے۔ پھر اگر اُسے حکم دیا جائے تو انہیں فوراً اچھا بھی کردیتی ہے۔ عمل جراحی کرنے کے لئے جسم کا احساس باطل کردیتی ہے سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید دکھلاتی ہے۔ اگر نوم مقناطیسی کے دوران میں روح کو حکم دے دیا جائے تو بیداری کے بعد وہ بعض حاضرین کے دیکھنے سے بھی قاصر رہتی ہے۔

یہ ترقی یافتہ شخصیت جس کو "عقلِ باطن" کہا جاتا ہے اس امر کی ذمہ دار قرار دی جاسکتی ہے کہ روحانی تجربات کے دوران میں وہی اس امر کا دعویٰ کرتی ہے کہ وہ میت کی روح ہے جسے بلانے والا مخاطب کرتا ہے، وہی میت کی روح کی حیثیت سے جواب دیتی اُس کے انداز تحریر میں لکھتی، اُس کی زبان میں بولتی اور اُس کے دستخط کرتی ہے اور وہی حاضرین اور میت کے اعزہ کے دلوں میں گھس کر اور کتب و رسائل میں اس کے حالات پڑھ کر اس کے تمام اسرار سے واقف ہوجاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام امور ہر معمول کی عقلِ باطن کے امکان میں ہیں بشرطیکہ عامل اسے نوم مقناطیسی کے بلند درجات تک پہنچا سکے۔ پھر وسیط کی عقلِ باطن کو خواہ وہ عامل ہو یا نہ ہو، ان متفرق قسم کے خوارق سے کون سی چیز روک سکتی ہے، درانحالیکہ ہمیں اب تک ان کے متعلق کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔

حال ہی میں عقلِ باطن کے مظاہر کے متعلق یہ عجیب و غریب واقعہ اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ موسیو مارنیگو رکن جمعیتِ طبیہ پیرس نے

جمعیتِ مذکور کی توجہ تبدیلِ شخصیت کے اس حیرت انگیز واقعہ کی جانب مبذول کرائی کہ کلیۂ حقوق (لاء کالج) کی طالبات میں سے ایک نوجوان لڑکی کو ذات الجنب کا دورہ پڑا اور وہ اس کے بعد ایک طویل نیند میں مبتلا ہو گئی۔ جب وہ بیدار ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی اصلی زبان (فرانسیسی) بالکل فراموش کر دی ہے اور اس کے بجائے ۱۲ دوسری زبانیں جن سے پہلے قطعًا ناواقف تھی جاننے لگی ہے۔

عقلِ باطن کے اس قسم کے واقعات نے یورپ کے علما کو اس بات پر آمادہ کر دیا ہے کہ وہ عقلِ باطن اور ارواحِ موتی کے مابین کوئی واضح امتیاز معلوم کرنے کے لئے متواتر جد و جہد شروع کر دیں۔ چنانچہ پروفیسر مائرس اور پروفیسر ہاجسن نے جو کیمبرج یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور روحانیات کے بہت بڑے محققین میں سے تصور کئے جاتے ہیں، یہ تجویز پیش کی کہ مرکب روحانی اتصالات پر عمل کیا جائے۔ یعنی شہر کے مختلف گوشوں میں بیک وقت چار یا پانچ تجربی جلسے منعقد کئے جائیں اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ کی جائے۔ پھر ایک جلسہ میں ایک روح کو طلب کر کے اس سے خواہش کی جائے کہ وہ کوئی پیغام دے اور ہر جلسے میں جا کر تجربہ کرنے والوں کو اس پیغام میں سے چند سطور اس طرح لکھا دے کہ کسی کو ان متفرق سطور کا مکمل مفہوم معلوم نہ ہو سکے۔ جب تجربہ مکمل ہو جائے تو یہ متفرق سطور جمع کی جائیں اگر یہ متفرق سطور مل کر ابتدا میں لکھوائے ہوئے پیغام سے مطابقت کھا جائیں تو سمجھا جائیگا کہ وسیطوں کا ان تحریرات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ صرف "آلات" ہیں جنہیں ارواحِ موتی زندوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ یہ تجربات مکمل طور پر کامیاب ہوئے اور ان سے ثابت ہوا کہ وسیط صرف آلات ہیں جنہیں روحیں زندوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔

اگرچہ اسے علمی دلیل نہیں کہہ سکتے لیکن اس موقعے پر اس جانب اشارہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقلِ باطن پر اس قسم کا اتہام لگانا نہایت معیوب ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ عقلِ باطن فطری کمال اور بلند اخلاق کے ساتھ متصف ہوتی ہے۔ بلکہ وہ حتی الامکان کوشش کرتی ہے کہ انسان کو نقائص سے نجات دے اور اس کی تکمیل کے لئے الہاماتِ حسنہ اور باطنی ہدایات کے ذریعہ سے رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے۔ اس لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان صفات سے متصف ہونے کے باوجود اس قسم کی فریب کاری کا ارتکاب کرے؟ نیز یہ کہ تمام عقولِ باطنہ دنیا کے ہر حصے میں اس کمزوری میں کیسے شریک ہو سکتی ہیں؟ اور کوئی ایک فرد بھی اس سے مستثنیٰ کیوں نہیں ہوتا جو واقعی صورتِ حال سے خبردار کر کے تجربہ کرنے والوں کو ان گمراہیوں کے جال میں گرفتار ہونے سے روک دے جو ۷۰ برس سے دنیا کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہیں؟!

(فرید وجدی)

منظور سروش (بھوپالی)

زندگی اور موت

(۱)

زندگی

مری سُن موت، ظالم! میں اگر تیری جگہ ہوتی
بھیانک پُر شکن ہرگز نہ ہوتی میری پیشانی
نہ ہوتی ابنِ آدم کے لئے وجہِ پریشانی
نہ وقتِ نزع اس کی کشتِ دل میں حسرتیں بوتی

اگرچہ سچ ہیں یہ دلچسپ حیرتناک افسانے
بیاں ہے جن میں انسانوں کی آئندہ مسرت کا
ہے جن میں ذکرِ رنگیں سلسبیل اور باغِ جنت کا
چھلکتے میری آنکھوں میں مئے کوثر کے پیمانے

نویدِ عیش تو پُرہول نظروں سے چھپاتی ہے
مگر میں بزم کو اُمید کا ساغر پلا دیتی
جہاں میں بن کے رحمت کا فرشتہ نور برساتی
کہ میری راگنی خوابیدہ روحوں کو جگاتی ہے
تھکے ماندوں کو میں آرامِ منزل کا پتا دیتی
شرارِ آرزو سے دل ہر اک انسان کا گرماتی

(۲)

موت

اگر میں اے دل آرا زندگی، تیری جگہ ہوتی
نہ ہرگز لوٹتی لاکھوں کا ایماں اک تبسم سے
چراتی دل نہ انسانوں کے فسونِ تکلّم سے
سکونِ قلب دشتِ گمرہی میں خلق کیوں کھوتی
جو انسان کھیلتے ہیں بیکسی سے تیرے دامن میں
انہیں تو قتل کر دیتی ہے سونے کی کٹاری سے
رہا کرتی نہیں ان کو کبھی زندانِ خواری سے

تجھے شاید مزا آتا ہی اُن کے آہ و شیون میں

مگر اُن کو اماں ملتی مرے آغوشِ شفقت میں
مرا سیلِ کرم خاشاکِ عُسرت کو بہا دیتا
جہاں آسودہ ہوتا میرے بے پایاں تلطف سے
نشاطِ دائمی ہوتی عیاں میری محبت میں
مرا لطف و کرم سب رنج و غم اُن کے بھلا دیتا
فقیر و بادشہ گرویدہ ہوتے میری اُلفت کے

(۳)

یہ سُنکر زندگی جب چپ رہی تو موت پھر بولی
کسی کو مُلکِ ہست و بود میں ہرگز نہ میں لاتی
کسی کی روح کو یہ ہفت خواں ہرگز نہ دکھلاتی

(ایلا ویلر ولکاکس)

یہاں وہ لعل و گوہر سے نہ بھر سکتا اگر جھولی
اگر انساں کو سچ مچ میری صورت سے بھی نفرت ہے
تو کہہ اے زندگی! وہ راہ میری دیکھتا ہی کیوں
خموشی میری اس کے واسطے ہیبت ربا ہے کیوں
ترے جھوٹے تبسّم میں بھی کیا ایسی لطافت ہے

حسیں گر میں نہیں یہ بھی تو ہے تیرے لئے بہتر
چھپاتی ہوں میں اسرارِ عدم یہ بھی غنیمت ہے
قیامت کا سماں ہوگا اگر وہ راز کھل جائیں
کہ تاریکی میں لوٹیں گے ہزاروں کوہِ غم تجھ پر
زباں کو اس مصیبت کے بیاں سے بھی کراہت ہے
کہ بچے سرحدِ ہستی سے میری گود میں آئیں

عطاء اللہ کلیم

اینک آرڈن

بہت زمانہ گزرا ـــ تقریباً پونے دو سو سال۔ سمندر کے کنارے ایک خوشنما اور مضبوط بنگلے میں تین مختلف خاندانوں کے افراد ـــ دو لڑکے اور ایک لڑکی رہا کرتے تھے۔ چونکہ ان کے آباؤ اجداد کو ایک جگہ اور ایک ساتھ رہتے ہوئے کافی زمانہ ہوگیا تھا اس لیے اب اُن کے آپس میں ہمدردانہ اور عزیزانہ برتاؤ کو دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے الگ ہیں ـــ جس کسی کو بھی اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوتا یا تعلقات قائم کرنے کا موقع ملتا وہ یہی خیال کرتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک ایک دوسرے کا قریبی رشتہ دار ہے ایک خاندان کے دوسرے خاندان کے ساتھ اس قسم کے مخلصانہ برتاؤ کا اثر ان کی اولاد پر بھی ہوا یعنی ان کے بچے بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک لڑکا جس کا نام فلپ رے تھا ایک چکّی والے کا اکلوتا نورِ نظر تھا۔ "اینک آرڈن" دوسرے لڑکے کا نام تھا جو اپنے جہازراں باپ کے سمندر میں ڈوب جانے کی وجہ سے یتیم ہوگیا تھا۔ لڑکی کو اینی لی کے نام سے پکارتے تھے۔

یہ تینوں بچپن میں ہمیشہ ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے اور زیادہ تر ان چیزوں سے جو ساحلِ بحر پر بیکار پڑی رہتی تھیں ـــ ساحل کا کوڑا کرکٹ، گلے ہوئے جہازی رسّے، مچھلی پکڑنے کے زنگ آلود جال اور ناکارہ کشتیاں۔ کبھی کبھی وہ ریت جمع کرتے اور اُس کے مکان بناتے اور انہیں سمندر کے پانی کے ساتھ بہتا دیکھ کر خوش ہُوا کرتے تھے۔ غرض ان کے وقت کا بیشتر حصہ یوں ہی کھیل کود میں صرف ہوجایا کرتا تھا۔ وہ روز اپنے معصوم قدموں کے پاک نشان ریت پر چھوڑ جاتے اور دوسرے دن آکر دیکھتے تو انہیں نہ پاتے۔

ان کے بنگلے کے قریب ہی ایک ڈھلوان چٹان تھی جس کے نیچے ایک غار تھا۔ یہاں یہ تینوں اپنا گھر بناتے اور اس میں کھیلا کرتے تھے۔ اگر اینک ایک دن مہمان ہوتا تو فلپ دوسرے دن لیکن اینی ہمیشہ میزبان کے فرائض ہی انجام دیتی۔ اکثر ایسا ہوا کہ اینک ایک ایک ہفتہ تک برابر اینی کا مہمان رہا۔ ایسے موقع پر اگر فلپ اینک سے چلے جانے کے لئے اصرار کرتا اور کہتا کہ اب میں مہمان ہونگا تو اینک جواب دیتا۔ "یہ میرا گھر ہے اور یہ میری چھوٹی بیوی ہے"۔ یہ جواب سنکر فلپ جھنجھلاتے ہوئے کہتا "مہربانی فرما کر اب آپ تشریف لے جایئے۔ اگر وہ آپ کی بیوی ہے تو میری بھی ہے"۔ اسی بات پر اکثر دونوں میں لڑائی چھڑ جاتی جس میں اینک کامیاب ہوجاتا۔ اس کی کامیابی کا خیال کرتے ہوئے فلپ کی نیلی آنکھیں اشک ہائے ندامت وحسرت سے تر ہوجاتیں اور اینک سے نفرت کرتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ جب اینی اینک کو کامیاب اور فلپ کو ناکام اور روتا ہوا دیکھتی تو وہ خود یہ خیال کرکے کہ کہیں دونوں کو

نہ کھو بیٹھوں رونے لگتی اور انہیں باہم لڑنے سے باز رکھنے کے لئے یہ کہہ کر کہ "میں تم دونوں کی بیوی بنوں گی۔ صلح کرا دیتی۔

جب وہ معصومیت کی پاکیزہ فضا سے نکل آئے اور انہوں نے جوانی ـــــــ زندگی کی رنگین پُر فضا لیکن سب سے زیادہ خطرناک منزل میں قدم رکھا تو اینک اور فلپ نے شباب کے گرم سورج کی تپش کو محسوس کیا اور دونوں نے اینی کی محبت کو حاصل کرنے کی پیہم کوششیں شروع کر دیں۔ اینک نے اظہارِ محبت سے اینی کو متاثر کرنا چاہا لیکن فلپ اپنے لبوں پر سکوت کی مہر لگائے اس سے خاموش محبت کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اپنی محبت کا اظہار کر کے اینی کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ غالباً یہ اس کے خاموش رہنے ہی کا ثمر تھا کہ اینی اس کی قدر کرتی تھی۔ گو اسے اینک سے غیر محسوس محبت تھی لیکن اس پر بھی اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر اینک مجھ سے دریافت کرے گا کہ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے ؟ تو میں اس کا نفی میں جواب دوں گی ـــــــ اینک نے اظہارِ محبت کے ساتھ ساتھ اپنی آمدنی میں سے کچھ حصہ پس انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس رقم سے میں کشتی خریدوں گا اور اینی کے لئے مکان بنواؤں گا۔

اب اینک ایک تجارتی جہاز پر چلا گیا اور ایک سال تک ملازمت کی۔ اتنے عرصہ میں اس نے فنِ جہازرانی میں کافی تجربہ حاصل کر لیا۔ اُسے سمندر میں تین دفعہ طوفان نے گھیرا لیکن وہ خوش قسمتی سے ہر مرتبہ بچ گیا ـــ جب اس نے زندگی کی بیس منزلیں طے کر لیں تو اس نے ایک اپنی کشتی خرید لی اور اینی کے لئے ایک صاف ستھرا مکان اُس گلی کے درمیانی حصہ میں بنا لیا جو فلپ کے باپ کی چکی تک چلی گئی تھی۔

موسمِ گرما کی ایک سنہری شام کو اینک اور اینی کھانے پینے کے تھوڑے بہت سامان کے ساتھ، بلوط کی قسم کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے باتیں کر رہے تھے فلپ نے ایک گھنٹہ بعد آنے کا وعدہ کیا تھا اس لئے کہ اس کا باپ بیمار تھا اور اس کی تیمارداری کی ضرورت تھی ـــ یہ دونوں اپنی باتوں میں اس قدر مشغول تھے کہ انہیں فلپ کے آنے کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے شراب پی لی ہے اور بہت زیادہ مقدار میں کہ جس نے انہیں بالکل مدہوش اور بے خبر بنا دیا ہے۔

فلپ ایک گھنٹہ بعد پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ جب اس جگہ پہنچا جہاں سے درختوں کا غیر متوازی سلسلہ شروع ہوتا تھا تو اُس نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے دیکھا اس منظر کا دیکھنا تھا کہ اس کی بھوری پلکوں والی آنکھیں اور موسم سے مرجھایا ہوا چہرہ محبت کی دھواں نہ دینے والی آگ سے جو قربان گاہ کی آگ کی طرح پاک تھی چمکنے لگا۔

فلپ نے اب ان کے احساسات اور جذبات کا ان کی آنکھوں اور چہروں سے جائزہ لینا شروع کیا اور اپنی قسمت کا لکھا پڑھ لیا۔

"اینک اور اینی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اس لئے اینی کی محبت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو" ـــ اس موقع پر اس نے ان کی

راحت میں خلل انداز ہونا مناسب نہ سمجھا حالانکہ یہ ممکن تھا کہ اس کے وہاں پہنچنے پر اینی اس کی جانب متوجہ ہو جاتی۔ ابھی وہ اپنی جگہ ہی کھڑا تھا کہ اسے ان دونوں کے چہرے ایک دوسرے کی طرف جھکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پہلے اسے خیال ہوا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکا ہوا ہے لیکن اس سے قبل کہ وہ اس تڑپا دینے والے منظر کو زیادہ غور سے دیکھتا اس نے ایک آہ بھری جس میں نہ معلوم کتنی حسرتیں اور کتنے ارمان تھے اور آہستہ سے ہٹ کر جھاڑیوں میں ایک مجروح جانور کی طرح گھس گیا اور وہاں جب کہ ہر چیز سے مسرت انبساط کی مسرور کن آوازیں بلند ہو رہی تھیں بہت دیر تک اکیلا بیٹھا اپنی قسمت پر افسوس کرتا رہا۔ اسے اینی کے کھو جانے کا رنج تھا اور اب اپنے کو بیوقوف ٹھہرا رہا تھا کہ کیوں نہ میں نے بھی اینک کی طرح اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اس کے اس خیال پر اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی اور وہ یہ کہتا ہوا کہ "اپنی اپنی قسمت ہے" اٹھا اور اپنے دل میں محبت کی نہ مٹنے والی خواہش لئے چلا گیا۔

(۲)

اینک اور اینی کی شادی ہوئے سات سال گزر چکے تھے یہ زمانہ انہوں نے نہایت آرام کے ساتھ گزارا۔۔۔ اس وقت تک ان کے گھر میں ایک نئی ہستی کا بھی اضافہ ہو چکا تھا یہ ایک لڑکی تھی جو ان کی پہلی اولاد تھی۔ اس لڑکی کی پیدائش نے اینک کو پھر روپیہ جمع کرنے کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس رقم سے وہ اپنی اولاد کو تعلیم دلانا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کی یا اینی کی طرح اچھی اور معقول تعلیم حاصل کرنے سے قاصر نہ رہے۔ انہیں دنوں اینک کی غیر موجودگی میں جبکہ وہ سمندر کے خوفناک پانیوں یا خشکی کے ہیبتناک اور پُر خطر رستوں پر سفر کر رہا تھا ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اینی اپنے وقت کا بیشتر حصہ اس کی خبرگیری میں گذارتی تھی اور اس سے بیحد محبت کرتی تھی۔

اینک کو بستی کے لوگ اکثر یاد کرتے تھے۔ اس کا سفید گھوڑا اور سمندر سے نکلے ہوئے درخت کی شاخوں سے بنی ہوئی ٹوکری جس میں سے بحری مچھلیوں کی بو آتی تھی۔ ان کو اکثر یاد آتی۔ خاص کر وہ اس واقعہ کو نہ بھولتے تھے کہ اینک جمعہ کے روز جس دن یسوع کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا اور جس دن عیسائی گوشت کے بجائے مچھلی استعمال کرتے ہیں بستی کے سردار کے مکان پر جایا کرتا تھا اور انہیں کھانے پر مدعو کیا کرتا تھا۔

آخر اینک اپنے سفر سے واپس آ گیا۔ چھوٹے بندرگاہ سے دس میل شمال کی جانب ایک اور وسیع بندرگاہ بنایا گیا جہاں اینک خشکی یا پانی کے راستے اکثر جانے لگا۔ ایک مرتبہ جبکہ وہ بندرگاہ میں ایک مستول کی رسّی کس رہا تھا غلطی سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گر گیا۔ جب اُسے سمندر سے نکالا گیا تو اس کا بازو ٹوٹ چکا تھا۔۔۔ ابھی وہ بلستر مرض پر ہی پڑا تھا اور اس کا علاج ہو رہا تھا کہ اس کی بیوی کے بطن سے ایک اور نحیف و ناتواں لڑکا پیدا ہوا۔ منحوس اولاد میں اس لڑکے کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس کے پیدا ہوتے ہی انہیں تجارت میں نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ کسی دوسرے شخص نے اُن کی تجارت میں رخنہ اندازی کی اور وہ ابستان خبیبہ تک کے لئے محتاج ہو گئے۔ اینک سنجیدہ آدمی تھا۔ خدا سے ڈرتا تھا لیکن اسے اس طرح بیکار پڑے رہنے نے مغموم

وتنگ بنا دیا۔ اپنی بیوی کو بھیک مانگتے اور اپنے بچوں کو بھوک سے بلکتے دیکھ کر وہ خیال کرتا گویا کہ میں کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ خدا سے دعا مانگتا تھا "اے خدا! ان کو غارِ مصیبت سے باہر نکال خواہ میرا کچھ ہی حال ہو"۔

ایک روز اس جہاز کا کپتان جس میں اینک نے ایک سال تک ملازمت کی تھی اس کی مفلسی اور مصیبت کا حال سنکر اس کے پاس آیا۔ کپتان اینک کی اچھی عادات وخصائل کی وجہ سے قدر کرتا تھا۔ وہ اپنا جہاز کچھ دنوں بعد چین لے جانے والا تھا۔ اُسے کشتی کے سامان کی نگرانی کے لئے ایک شخص کی خدمات کی ضرورت تھی اور اس کے لئے اس نے اینک کو منتخب کیا۔ اینک نے یہ سوچ کر کہ خدا نے میری بےکسی پر رحم کھایا ہے کپتان کی درخواست منظور کرلی

اینک کی مصیبت اب ختم ہورہی تھی ـــ وہ عہدہ کو قبول کرچکا تھا اور اس نے چلے جانے کا ارادہ بھی کرلیا تھا لیکن ایک خیال اس کے دل میں بسا ہوا تھا اور وہ یہ کہ اپنے اہل وعیال کو کس کی نگرانی میں چھوڑے۔ اُن کو اپنے ساتھ لے جانا کچھ زیادہ فائدہ مند نہ ہوتا اس لئے اب صرف دو ترکیبیں تھیں۔ پہلی یہ کہ اپنے بیوی بچوں کو کسی کے سپرد کرجائے یا اُن کے لئے ضروری سامان مہیا کردے کہ وہ اس سے اپنی زندگی کو قائم رکھ سکیں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنا سفر ملتوی کردے بسفر کا التوا اور اس جگہ کو چھوڑ دینا بہت زیادہ خطرناک تھا اس لئے کہ بیکار رہ کر مکھیاں مارنے سے یہ بہتر تھا کہ کچھ روپیہ کمایا جائے۔ غرض اس نے اپنا آخری خیال چھوڑ دیا اور اپنی بیوی اور بچوں کو خدا کے بھروسے پر چھوڑ جانے کے لئے تیار ہوگیا۔

وہ کسی جائداد کا مالک نہ تھا جس کی آمدنی سے اس کی بیوی گھر کا خرچ چلا سکتی۔ نہ اس کے پاس قیمتی چیزیں تھیں جن کو فروخت کرکے کام میں لایا جاسکتا ـــ اگر اس کے پاس کچھ تھا تو صرف ایک کشتی تھی جسے اس نے شادی سے قبل خریدا تھا جس میں اس نے برباد کن طوفانوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اور جسے وہ اتنی ہی اچھی طرح جانتا تھا جیسے ایک گھوڑے کا مالک اپنے گھوڑے کو جانتا ہے ـــ غرض اس نے اسے فروخت کردیا اور اس کی قیمت سے سامانِ تجارت خرید کر اپنی تجارت کرکے اپنا پیٹ پالنے کی طرف توجہ دلائی تاکہ وہ اس کی غیر موجودگی میں کسی کی نظرِ کرم کی محتاج نہ رہے۔

اس نے سوچا کیا باہر تجارت کرنے کے لئے نہ جانا چاہیئے؟ نہیں۔ ضرور جانا چاہیئے۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو تین مرتبہ بلکہ بھی ضرورت ہو مجھے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دینی چاہیئے یہاں تک کہ میں دولتمند ہوجاؤں اور بڑی کشتی خرید سکوں، اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلانے کا خرچ برداشت کرسکوں اور ان کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی بسر کرنے کے قابل ہوجاؤں۔

کشتی کی فروخت اور سامانِ تجارت مہیا کرنے کے بعد اینک اپنے مکان پر آیا جہاں اس کی بیوی نے مسرت سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اپنے بیمار بچہ کو جس کی تیمارداری میں وہ مشغول تھی اس کی گود میں لٹا دیا۔ اینک نے اسے پیار کیا اور اس کے بازوؤں کو ہلا کر اس کے وزن کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ اُسے اس بات کی جرأت نہ ہوئی کہ اینی کو اپنے ارادہ سے صبح سے پہلے آگاہ کرسکتا۔

جب سے اینی نے اینک کی پیش کی ہوئی سونے کی انگوٹھی سے اپنی انگلی کو زینت دی تھی اس کے بعد آج پہلی مرتبہ وہ اس سے لڑنا چاہتی تھی لیکن جنگجویانہ طریقہ سے نہیں بلکہ پیار اور محبت سے ——— اس نے اسے ایام گزشتہ کی یاد دلا کر اور اپنی اور اپنے بچوں کی محبت کا واسطہ دے کر جانے سے روکنا چاہا۔ لیکن اینک نے اس کی التجاؤں کی پروا نہ کر کے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا کیونکہ وہ اس کی اور اس کے بچوں کی خاطر ہی ایسا کر رہا تھا ——— اب اینک نے اپنے مکان میں نشست کے کمرہ کو جس کا رخ گلی کی جانب تھا اینی کی دکان کے لئے ٹھیک کرنا شروع کیا۔ اس نے کشتی فروخت کر دی تھی اور سامان خرید لایا تھا۔ اگر کمی تھی تو دکان کی جسے اب وہ پورا کر رہا تھا۔ اس نے نشست گاہ کو الماری وغیرہ سے بھی آراستہ کر دیا اور اس میں سامان رکھ دیا غرض تمام دن اوزاروں کی آوازوں سے ان کا مکان گونجتا رہا لیکن اینی کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے لئے پھانسی کا تختہ تیار ہو رہا ہے ——— اوزاروں کی آوازیں کسی آئندہ آنے والی مصیبت کی ترجمانی کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ——— کہ یہ شور و غل ختم ہو گیا اور اینی کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینے والا اینک تھکا ماندہ اوپر گیا اور صبح تک گہری نیند سوتا رہا۔

آخر کار جدائی کی تکلیف دہ اور روح فرسا گھڑی آ پہنچی۔ جسے اینک نے بہادری کے ساتھ برداشت کیا۔ اگر اینی اس کی نہ ہوتی اور خوف و ہراس اینی کا نہ ہوتا تو وہ اس پر اور اس کے خوف و ہراس پر قہقہے لگاتا۔ اینک خدا سے بہت ڈرتا تھا وہ اس کی عبادت کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہو گیا اور جبکہ عابد و معبود ایک ہو جاتے ہیں اس نے اینی اور اپنے بچوں پر رحمت کی بارش کی التجا کی۔ خواہ اس کی اپنی قسمت کا لکھا کچھ ہی ہو۔ اس کے بعد اس نے کہنا شروع کیا:۔

"اینی! یہ بحری سفر خدا کی مہربانی سے ہم سب کے لئے مسرت و شادمانی کی بہاریں لائے گا۔ میرے لئے صاف ستھرا مکان اور گرم آگ تیار رکھو۔ کیونکہ میں میری اینی! تمہارے اندازے سے پہلے واپس آموجود ہوں گا (آہستہ سے بچے کا جھولا ہلانے کے بعد) اور اس خوبصورت، بیمار اور چھوٹے بچے پر جس سے میں پہلے ہی سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں، خدا اپنی رحمت کرے۔ میری واپسی پر وہ میرے گھٹنوں پر بیٹھے گا اور میں اسے غیر ممالک کے قصے سناؤں گا جنہیں سن کر وہ خوش ہوگا۔ آؤ۔ اینی! آؤ مجھے خدا حافظ کہو ———"

اینک کو اس طرح پُر امید گفتگو کرتے ہوئے وہ سنتی رہی۔ اسے خود بھی اس کے بخیر واپس آنے کی امید تھی۔ لیکن جب اینک نے اپنی تقریر کا رخ بدلا اور خدا پر بھروسا رکھنے کی تلقین شروع کی تو اینی غافل ہو کر اسے سنتی رہی لیکن اس کا مطلب اخذ نہ کر سکی ——— وہ ایک دیہاتی لڑکی کی طرح جو اپنا برتن پانی کے دھارے کے نیچے رکھ دیتی ہے اور جب وہ بھر جاتا ہے تو پانی کے بہنے کی آواز اسے سنائی دیتی ہے لیکن وہ تخیلِ محبوب میں محو اس کی پروا نہیں کرتی اسے سن رہی تھی۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا اور وہ بول اٹھی۔

"اینک! تم عقلمند ہو۔ لیکن باوجود اس کے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں تمہاری صورت دوبارہ نہ دیکھ سکوں گی۔"

اینک نے کہا۔ "اچھا لیکن میں تو نہیں دیکھوں گا۔ میں جس جہاز میں جا رہا ہوں وہ یہاں سے ہفتے کے دن گزرے گا۔ تم دوربین لے کر اُس دن میرا چہرہ تلاش کرنا اور دیکھ لینا بس۔ اب تو اپنے خوف کو دُور کر دو"۔

لیکن جب ان آخری لمحات کا بھی آخری لمحہ آگیا تو اس نے یوں کہنا شروع کیا "اینی خوش رہو۔ ہمت نہ ہارو۔ بچوں کی نگرانی کرو اور جب تک میں واپس آؤں ہر ایک چیز ایسی ہی رکھو جیسے تختۂ جہاز پر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مجھے ضرور جانا ہے۔ میرا کچھ خیال نہ کرو۔ یا اگر تم ڈرتی ہو تو خدا کے رحم و کرم پر اپنے آپ کو چھوڑ دو جس طرح ایک کشتی رسے سے باندھ دینے کے بعد محفوظ ہوتی ہے، اسی طرح انسان خدا پر ایمان رکھنے سے محفوظ ہو جاتا ہے ——— کیا خدا یہاں سے دور مشرقی مقامات پر موجود نہیں ہے؟ اگر میں وہاں بھاگ جاؤں تو کیا میں اس سے بچ سکتا ہوں؟ سمندر کا مالک وہی ہے۔ سمندر اس کا ہے اسی نے اسے بنایا ہے"۔

اینک کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی مایوس و رنجیدہ بیوی کی گردن میں اپنے بازو حمائل کر دیئے اور اپنے متحیر بچوں کو پیار کیا۔ جب اینی سب سے چھوٹے بچے کو جو رات بھر بخار کی وجہ سے جاگنے کے بعد اس وقت سو رہا تھا جگانے لگی اس نے کہا "اسے نہ جگاؤ اسے سونے دو۔ یہ معصوم کیا یاد رکھے گا کہ میں نے اس موقع پر اسے خدا حافظ کہا تھا"۔ اور پھر اس نے اسے اسی حالت میں پیار کیا۔ اینی نے اس کی پیشانی سے ایک چھوٹا بال توڑا اور اُسے دے دیا جسے مستقبل میں اس نے اپنے پاس رکھا ——— اس نے اس کے بعد جلدی سے اپنا سامان اٹھایا، ہاتھ ملایا اور اپنا راستہ لیا۔

اینی نے اینک کے بتائے ہوئے دن کا انتظار کیا۔ اس نے دوربین عاریتہً لے لی اور مقررہ وقت پر اینک کے چہرے کو تلاش کرنا شروع کیا لیکن وہ اسے نہ دیکھ سکی۔ شاید اس نے دوربین کو ٹھیک نہ رکھا یا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوں گی یا اس کے ہاتھ فکر اور رنج کی وجہ سے کانپ رہے ہونگے جس لمحہ میں وہ اسے دیکھ سکتی تھی آخر وہ گذر گیا اور جہاز چلا گیا ——— آہ! وہ اپنے محبوب شوہر کے آخری نظارہ سے محروم رہ گئی۔

(۳)

جب تک جہاز اس کی نظروں کے سامنے تھا وہ جہاز کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے روتے ہوئے دوربین وغیرہ علیحدہ کر دی۔ حالانکہ اینک کی غیر موجودگی سے اُسے اتنا ہی رنج تھا جتنا اس کے مرجانے پر ہوتا پھر بھی اس نے خود کو کام میں مشغول و منہمک کر لیا۔ لیکن وہ اپنی تجارت میں کامیاب نہ ہو سکی اس لئے کہ وہ خرید و فروخت کے اصول نہ جانتی تھی ——— وہ اس نقصان کو کسی دوسرے طریقہ سے بھی پورا نہ کر سکی اس لئے کہ خریداروں کو کم تول کر دینا اور ان سے نرخ کے معاملے میں جھوٹ بولنا وہ پسند نہ کرتی تھی۔ خریداروں سے بڑھا کر قیمت کہہ دینا اور کم لینا مثلاً چار آنے کہہ کر چار پیسے میں فروخت کر دینا اس کی عادت نہ تھی ——— مصیبت کے زمانے میں اس نے اپنی چیزیں کم قیمت میں یعنی اس سے بھی کم قیمت میں جتنی میں خریدی تھیں فروخت کر دیں لیکن اس پر بھی اسے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اسے

اپنی ناکامی پر افسوس تھا۔ مگر وہ اینک کی کچھ خبر ملنے کی اب بھی امید رکھتی تھی لیکن اس کے متعلق کچھ معلوم ہی نہ ہو سکا ــــ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن پورے کرتی رہی اور گو اسے بہت رنج تھا لیکن اس نے کبھی اس کا اظہار کسی دوسرے کے سامنے نہ کیا۔

اینی کا تیسرا بچہ جو شروع ہی سے بیمار تھا، اسی حالت میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اینی اس کی ہر طرح خبرگیری رکھتی تھی لیکن پھر بھی وہ اینک کی طرح اس کے لئے فائدہ مند نہ تھی ــــ وہ ہر وقت اس کے پاس نہ رہ سکتی تھی۔ نہ اس کے پاس اتنا روپیہ تھا کہ وہ کسی طبیب کو بلا کر اس کی فیس ادا کر سکتی اور اس کی رائے سے فائدہ حاصل کر سکتی ــــ آخر وہ کچھ عرصہ بیمار رہ کر مر گیا۔

اینی نے اپنے لخت جگر کو جس ہفتہ سپرد خاک کیا اسی ہفتے فلپ نے اینی سے ملنے کا ارادہ کیا۔ فلپ نے کہا "یقیناً" میں اس سے اب مل سکتا ہوں ممکن ہے یہ ملاقات ہمارے لئے باعث تسکین ہو"۔ ایک روز وہ اینی سے ملنے گیا۔ وہاں خالی کمرہ سے گذر کر دروازہ پر کچھ دیر ٹھہرا رہا پھر تین مرتبہ دستک دی اور جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو وہ اندر داخل ہو گیا۔ اینی بچے کی وفات اور پیہم ناکامیوں سے اس قدر مغموم ہو گئی تھی کہ وہ اب کسی انسانی چہرے کو دیکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ فلپ کو آتا دیکھ کر اس نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا اور رونے لگی۔

فلپ نے کھڑے ہی کھڑے تیزی سے دریافت کیا" اینی! کیا میں تم سے مدد حاصل کر سکتا ہوں"۔

"مدد ــــ ایک رنجیدہ اور کس مپرس ہستی کی جیسی میں ہوں؟" اس جواب نے فلپ کو شرمندہ سا کر دیا۔

فلپ نے بیٹھتے ہوئے کہنا شروع کیا "میں تمہیں تمہارے شوہر اینک کی خواہش بتانے آیا ہوں میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ تم نے ہمارے درمیان نہایت کامیاب انتخاب کیا کہ ایک مضبوط آدمی کو جو جس کام کو شروع کرتا ہے اسے انجام تک پہنچا کر چھوڑتا ہے منتخب کیا۔ تمہیں معلوم ہے اس نے یہ سفر کیوں اختیار کیا ہے؟ تفریح کے لئے نہیں بلکہ اپنے بچوں کے لئے بہتر زندگی کے ــــ اس سے بہتر زندگی کے جیسی تم نے یا اُس نے بسر کی وزرائع مہیا کرنے کے لئے ــ بس یہی اس کی خواہش تھی۔ اگر وہ واپس آ جائے تو اسے یہ دیکھ کر کہ اُس کے بچوں کی زندگی کے ابتدائی قیمتی سال ضائع ہو گئے بہت رنج ہوگا اور یہ بات مرنے کے بعد اس کو قبر میں بھی چین نہ لینے دیگی کہ اُس کے تعلیم سے بے بہرہ اور بد تہذیب بچے آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں ــ بس اینی اب ــــ کیا ہم ایک دوسرے کو عرصہ سے نہیں جانتے یا کیا ہم ایک دوسرے پر بھروسا نہیں کر سکتے؟ میں تم سے اُس محبت کا جو تمہیں اینک اور اس کے بچوں سے ہے واسطہ دیکر درخواست کرتا ہوں کہ میری التجا کو قبول کر لو ــ اینک مجھے اس مہربانی کا بدلہ دے سکتا ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟ اینی! میں امیر ہوں۔ دولتمند ہوں اب مجھے اجازت دو کہ میں ان دونوں ــــ لڑکے اور لڑکی کو سکول میں داخل کرا دوں۔ بس یہی درخواست ہے۔ یہی التجا ہے اس التجا کو شرف قبولیت عطا کر دو"۔

اینی نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف سے پھیرتے ہوئے جواب دیا "میں اس وقت تم سے اچھی طرح بات نہیں کر سکتی اس وقت میری

طبیعت خراب ہے۔ تمہارے اندر داخل ہونے نے مجھے بحرِ حرماں میں غرق کر دیا۔ اور اب میں خیال کرتی ہوں تمہاری مہربانی مجھے متوجہ کرتی ہے۔ تمہارے نیک خیال کی میں قدر کرتی ہوں لیکن اینک زندہ ہے یہ میں محسوس کرتی ہوں۔ پھر بھی دولت واپس کی جا سکتی ہے نہ کہ مہربانی اور وہ بھی تمہاری جیسی"۔

فلپ نے دریافت کیا۔ "تب تو اجازت ہے اینی"؟

یہ سُن کر اینی کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر تک اپنی اشک آلود آنکھوں کو اس کے چہرے پر جمائے رکھا اور "خدا تمہیں اس کا اجر دے" کہہ کر اس کا ہاتھ اپنی سخت گرفت میں لے لیا اور اسے جس کے دل میں مسرت اور خوشی کا سمندر موجیں مار رہا تھا ساتھ لے کر باغ میں چلی گئی۔

فلپ نے ان دونوں معصوموں کو سکول میں داخل کر دیا۔ ضرورت کی کتابیں خرید دیں اور ان سے اپنے بچوں کا سا برتاؤ کرنے لگا اس نے اپنے کو ان کی محبت کے ہاتھ فروخت کر دیا ——— گو یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ ہر وقت اینی کے پاس رہے لیکن وہ وہاں بہت کم آتا جاتا تھا وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی زیادہ آمدورفت وہاں کے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ دے اور وہ اینی کو بدنام کریں۔ لیکن پھر بھی وہ بچوں کے ہاتھ پھل، ترکاریاں اور پھول بطور تحائف اکثر بھیجا کرتا تھا اور کبھی کبھی کسی نہ کسی بہانے سے کہ اینی خیرات نہ سمجھے وہ اپنی چکی کا بہترین پسا ہوا آٹا بھی بھیج دیا کرتا تھا۔

لیکن فلپ ابھی تک اینی کے خیالات معلوم نہ کر سکا۔ اس نے اپنی قلبی کیفیات کا اظہار نہیں کیا۔ شرم و حیا مانع تھی۔ فلپ اگر آتا تو وہ اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ تلاش کرتی لیکن اُسے الفاظ بہ مشکل ملتے تھے حالانکہ اس کا دل شکریہ ادا کرنے کے لئے بےچین رہتا تھا۔ فلپ اس کے بچوں کا دوست تھا، رہنما تھا اور طبیب بھی۔ جب وہ اُسے دُور سے آتا دیکھتے تو دوڑتے ہوئے اُس تک جاتے اور اُسے خوش آمدید کہتے۔ وہ اس کے دل کے مالک تھے۔ وہ اُن کے چھوٹے چھوٹے قصوں کو بخوشی سنتا تھا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ کھیلتے تھے اور اُسے اپنا باپ کہا کرتے تھے۔

غرض فلپ نے رفتہ رفتہ اُن کی محبت حاصل کر لی اور اینک نے چونکہ وہ وہاں موجود نہ تھا اسے کھو دیا۔ اینک اُن کے لئے ایک خواب نما ہستی تھی۔ وہ خواب جو شرمندۂ تعبیر نہیں اور وہ اُسے ایسا سمجھتے تھے جیسے کوئی سڑک کے آخری کنارے پر جھٹپٹے کے دھندلکے میں جاتا دکھائی دے معلوم نہیں کہاں ——— اینک کو گئے ہوئے دس سال گذر گئے لیکن اس کا کوئی پیام نہ آیا۔ جس سے معلوم ہو سکتا کہ وہ کہاں ہے اور کب تک واپس آئے گا۔

ایک شام کو اینی کے بچے گھاٹی میں اخروٹ جمع کرنے کے لئے جانا چاہتے تھے۔ اینی کا اُن کے ساتھ جانا ضروری تھا۔ انہوں نے فلپ سے بھی ساتھ چلنے کی التجا کی فلپ چکی کے آٹے سے سفید ہو رہا تھا جیسے شہد کی مکھی پھول کا شہد جمع کرتے وقت اس پر پڑی

ہوئی خاک وغیرہ سے سفید ہو جاتی ہے کہ ان بچوں نے اسے جا گھیرا اور اپنے ساتھ لے چلنے پر اصرار کرنے لگے۔ کہنے لگے "چلیئے بھی ہمارے ساتھ"۔ اس نے انکار کر دیا لیکن جب بچوں نے اس کا کوٹ اور ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا تو وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اینی سے ملاقات اور گفتگو کا اس سے بہتر موقع اور کب مل سکتا تھا؟

آدھا راستہ طے کرنے کے بعد جب بن کا سلسلہ شروع ہوا تو اینی نے اس جگہ پہنچ کر جہاں سے فلپ نے کھڑے ہو کر اسے اور اینک کو راز و نیاز کی باتوں میں مشغول پایا تھا آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور کلفت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا "مجھے آرام لینے دو۔" فلپ نے بخوشی اسے منظور کر لیا۔ دونوں بچے اخروٹ جمع کرنے چلے گئے۔ درختوں کے پاس پہنچ کر انہوں نے اخروٹ جمع کرنے شروع کر دیئے اور درختوں کی مضبوط شاخوں کو توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو آواز دیتے ہوئے وہ ادھر ادھر کھیل کود رہے تھے۔

فلپ اینی کے قریب بیٹھا تھا لیکن وہ اس کی موجودگی کو بالکل بھول گیا۔ وہ اس وقت کو یاد کر رہا تھا جبکہ وہ ایک مجروح جانور کی طرح درختوں کے سایہ میں چلا گیا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی آنکھیں اٹھاتے ہوئے کہا "دیکھو اینی وہ کتنے خوش ہیں۔" "تھک گئیں اینی؟" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا اس لئے کہ اسے کوئی جواب نہ ملا تھا۔

"کیا تھک گئیں؟" اس نے افسردہ آواز سے کہا۔ "جہاز ڈوب گیا۔ جہاز ڈوب گیا۔ اس کا خیال چھوڑ دو۔ تم ایک کی خاطر اپنے کو کیوں مارے ڈالتی ہو اور بچوں کو یتیم بنانا چاہتی ہو۔"

اینی نے جواب دیا "میں اس کا خیال نہیں کر رہی تھی"۔ "لیکن میں سمجھ نہیں سکتی کہ بچوں کی آوازیں مجھے مغموم کیوں بنا دیتی ہیں"

فلپ نے قریب ہوتے ہوئے کہا "اینی! میرے دماغ میں ایک خیال ہے جو بہت زمانے سے چکر لگا رہا ہے اور گو مجھے یاد نہیں کب سے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسے بغیر ظاہر کئے نہیں رہ سکتا — اینی! جس نے تمہیں دس سال ہوئے خیرباد کہی تھی اس کے اس دنیا میں ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اس لئے مجھے آزادی کے ساتھ کہنے دو — مجھے تمہیں مفلس اور کس مپرس دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ میں تمہاری حسب خواہش مدد نہیں کر سکتا جب تک ..... " (وہ کہنا چاہتا تھا کہ جب تک تم مجھ سے شادی نہ کر لو لیکن نہ کہا) "— لوگ کہتے ہیں عورت بہت جلد دوسرے کا مطلب سمجھ لیتی ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں میں اپنے کو تمہارے بچوں کا باپ ثابت کرنے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ مجھ سے باپ ہی جیسی محبت کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے میں ان سے ایسی محبت کرتا ہوں جیسے میں اپنی اولاد سے کرتا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اس عہد مصیبت کے بعد بھی اگر تم میری بیوی بن جاؤ تو ہم اتنے ہی مسرور ہوں گے جتنی مسرت خدا اپنے دوسرے بندوں کو عنایت کرتا ہے۔ اس پر غور کرو۔ میں دولت کا مالک ہوں۔ میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ مجھے کوئی فکر نہیں۔ مجھ پر کوئی بوجھ نہیں سوائے تمہارے اور تمہاری اولاد کے۔ ہم کو لو

ایک دوسرے کو شروع سے اچھی طرح جانتے ہیں ——— میں تم سے تمہارے جاننے سے پہلے سے محبت کرتا ہوں"۔

اینی نے جواب دیتے ہوئے نرمی سے کہنا شروع کیا "تمہیں خدا نے ہماری مصیبت دور کرنے کے لئے منتخب کیا اور تم ایک فرشتہ بن کر ہماری مدد کے لئے آئے۔ خدا کی تم پر رحمت ہو۔ خدا تمہیں اس کا انعام دے فلپ! مجھ سے بہتر انعام ——— کیا دو مرتبہ محبت کی جاسکتی ہے؟ کیا میں تم سے اینک جیسی محبت کرسکتی ہوں؟ پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

فلپ نے جواب دیا "میں اینک سے کم محبت کئے جانے کے لئے تیار ہوں"۔

اُس نے کہا "اچھا۔ پیارے فلپ! کچھ عرصہ انتظار کرو۔ اگر اینک آجائے۔۔۔ لیکن اینک نہیں آئیگا پھر بھی ایک سال اور انتظار کرنا چاہیئے ——— ایک سال کوئی زیادہ عرصہ نہیں ——— یقیناً مجھے ایک سال میں اینک کا مفصل حال معلوم ہو جائے گا ——— کچھ عرصہ توقف کرو"۔

فلپ نے رنجیدہ ہو کر کہا "اینی جس طرح میں اتنے عرصے تک انتظار کرتا رہا میں کچھ عرصہ اور منتظر رہ سکتا ہوں"۔

وہ کہنے لگی "نہیں میں زبان دے چکی۔ میں وعدہ کر چکی ——— ایک سال میں۔۔۔۔ کیا تم ایک سال صبر نہیں کرسکتے۔

فلپ نے جواب دیا "میں ایک سال گذاروں گا"۔

انہوں نے اپنی گفتگو ختم کر دی۔ فلپ نے سر اٹھایا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ رات کی آمد اور سردی کا خیال کرتے ہوئے وہ اُٹھا اور بچوں کو آواز دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُن کے پاس پہنچ گئے اُن کے دامن اخروٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ آخر سب اینی کے مکان کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر فلپ نے کچھ دیر دروازے پر کھڑے رہنے کے بعد ہاتھ ملاتے ہوئے آہستہ سے کہا "اینی جب میں نے تم سے گفتگو کی اس وقت تم نقاہت محسوس کر رہی تھیں۔ اس قابل بھی نہ تھیں کہ اپنی رائے اچھی طرح ظاہر کرسکتیں۔ میں نے غلطی کی۔ میں ہر وقت تمہارا ہوں لیکن تم آزاد ہو۔ خواہ وعدہ پورا کرو یا نہیں"۔

اینی نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اپنا وعدہ پورا کروں گی"۔

(باقی)

دیوانہ مصطفےٰ آبادی

دوست کے ساتھ وفاداری اس میں نہیں کہ ہم اُس کے لئے سب کچھ کرنا چاہیں۔ بلکہ فقط اس میں کہ ہم وہ کریں جو اس کے نزدیک پسندیدہ ہو اور اس کے لئے مفید اور اس کا علم اگر اُسے ہو جائے تو ہمارے بتائے سے نہیں بلکہ اتفاق سے۔

سادگی

زندگی کے دام کو بندِ گراں سمجھا تھا میں
اپنے دل کی کشمکش کو رائیگاں سمجھا تھا میں

دادرِ محشر نے میری بات بھی پوچھی نہ حیف
عرصۂ محشر میں اپنا امتحاں سمجھا تھا میں

آہ تو بھی تا نشیمن آ کے اُلٹی پھر گئی
تجھ کو گھر کی رونق اے برقِ تپاں سمجھا تھا میں

غیر کی محفل میں آخر کھل گیا میرا بھرم
اے دلِ ناداں تجھے کیوں رازداں سمجھا تھا میں

سادگی میری غضب ہے، اُس کی پرکاری غضب
اُس وفا دشمن کو یارب مہرباں سمجھا تھا میں

دل کی بربادی نے کی تعمیر اک دنیائے درد
اُس پہ مرمٹنے کو اشرف رائیگاں سمجھا تھا میں

علی اشرف

جہان و جہاں آفریں

برقِ نظر سے بزم کو کیوں خاک کر دیا؟
کیوں کائناتِ عشق کو خاشاک کر دیا؟

مقصد اگر عتاب تھا اے پردہ دار کیوں
دنیا کو محوِ عشوۂ چالاک کر دیا؟

سمجھے تھے ہم سیاہیٔ شب کو کمالِ غم
دامانِ صبح کو بھی مگر چاک کر دیا؟

دکھلائی پہلے بادۂ ہستی کی اک جھلک
پھر چُور چُور شیشۂ ادراک کر دیا؟

اُس مُو قلم کو جس سے بنا نقشِ کائنات
نقاش ہی نے خنجرِ سفاک کر دیا

عزیز احمد

بکھرے موتی

لُوز کا ٹرکا

سمندر کی وسعتوں سے مسیحا نفس نسیم سحری کی ایک موج آئی

اس نے دنیا کو دیکھا اور کہا "تاریکی چلی جا! اور میرے لئے جگہ خالی کر!"

پھر جہازوں کی طرف پلٹی۔ "جہازیو!

اپنا سفر شروع کرو۔ رات چلی گئی"۔

زمین کی طرف چلی۔ پکارتے ہوئے

"بیدار ہو! کہ دن نکل آیا"۔

ریت کے صحرا میں وہ چلائی۔ "کارواں والو!

رختِ سفر باندھو کہ تمازتِ آفتاب پھر تمہیں بڑھنے نہ دیگی"

جنگل کی جانب رخ کیا۔ "اُٹھ!

اور اپنے پتوں کی تالیاں بجا بجا کر صبح کا استقبال کر"!

اس نے نرمی سے پرندے کے پر تھپکے

"جاگ پرندے۔ چہچہا"۔

گاؤں کی طرف منہ پھیرا۔ "اے کسان!

بیلوں کو ہانک! کہ روشنی پھیل گئی"

اس نے اناج بھرے کھیتوں سے سرگوشی کی۔

"پودو! آفتاب کے آگے اپنے سر تعظیماً خم کرو"۔

گھنٹہ گھر میں گونجی

"گھنٹے ہل! اور صبح کی آمد کا اعلان کر!"

لیکن آہ ــــ جب شہرِ خموشاں سے گذری تو دھیمی غمزدہ سی

آواز میں اس نے کہا:۔

"ابھی نہیں۔ تمہارا وقت ابھی نہیں آیا۔ انتظار کرو!

اپنے جاگنے کے لمحے کا خاموش صبر آزما انتظار"

(لانگ فیلو)

باغ میں ــــ!

بچہ پھول دیکھتا ہے۔

بچے کی آنکھ

اس سے زیادہ حسین مناظر دیکھتی ہے جو ہمارے خواب وخیال

کے مکمل حسن سے زیادہ حسین ہیں۔

بچہ پرندوں کا نغمہ سنتا ہے۔

بچے کے کان

اس سے زیادہ شیریں نغمے سنتے ہیں جو ہمارے شیریں ترین

راگوں سے زیادہ شیریں ہوتے ہیں۔

بچہ سمندر کا شور سنتا ہے۔

بچے کا چہرہ

سنجیدہ تر شان کا حامل ہوتا ہے

تعجب کے ساتھ کہ آخر یہ غل کیسا ہے؟

بچہ ستارہ دیکھتا ہے

بچے کا ہاتھ

کھلتا ہے ــــــــ گرم اور کشادہ

اس خاموش دعوے کے ساتھ کہ کل حسین اشیا اس کی ملکیت ہیں

بچہ، گھڑی کے دس گھنٹے گنتا ہے۔

بچے، کا سر

جھک جاتا ہے نیند کے بوجھ سے

یہ وہ وقت ہے جب پھول پتے بھی سکڑ جاتے ہیں

بچہ،، صداقت و نور کا ایک پھول

سوتا ہے اور دیکھتا ہے۔

حسین اور روشن خواب

جنکے آگے خوشگوار دن خوشگوار تر شب کو وداع کرتا ہے

(سون برن)

رات

مغرب کی طرف سے آ!

اے رات کی ملکہ!

مشرق کے تاریک غار سے نکل!

جہاں دن کی روشنی کے طویل وقفہ میں تو خوف و مسرت

کے خواب بنایا کرتی ہے جو تجھے کسی کے لئے خوفناک اور

کسی کے لئے خوش آئند بنا دیتے ہیں ——

اپنی رفتار تیز کر!

اور اپنے عریاں جسم کو نیلے لباس سے ڈھانک جس میں

تارے ٹکے ہوں۔

سیاہ زلفوں کا سایہ ڈال کر دن کی آنکھوں کو اندھا بنا دے

اور تعاقب کر کے اس کو بھگا۔

پھر شہروں جنگلوں اور سمندروں پر گھوم

اپنے سلا دینے والے عصا سے سب کو چھوتے ہوئے

آ! کہ میں تیرا منتظر ہوں۔

جب میں نے بیدار ہو کر طلوع صبح کا منظر دیکھا

میں نے تیری یاد میں بے اختیار آہ سرد بھری

جب دن چڑھنے لگا اور شبنم غائب ہونے لگی اور

پھولوں اور درختوں پر دھوپ چمکنے لگی اور تھکا ماندہ دن

رخصت کی تیاریاں کرنے لگا —— پس و پیش کرتے

ہوئے، جیسے کوئی ناخواندہ مہمان۔ تو تیری یاد میں

بے اختیار میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس پر تیری

بہن موت آئی اور کہنے لگی۔

”کیا تو مجھے یاد کرتا ہے؟“

تیری پیاری بیٹی نیند اپنی خمار آلود آنکھوں سے مجھے

اشارے اور سرگوشیاں کرنے لگیں۔

”کیا تو نے مجھے یاد کیا؟“

تو میں نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ تم دونوں میں سے کسی

کو نہیں۔“

موت تو اس وقت آتی ہے جب انسان مرجاتا ہے گو وہ

وقت کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو ——

نیند اس وقت آئیگی جب دن بھر کی محنت شاقہ کے بعد آدمی

خستہ حال ہو جاتا ہے۔

”نہیں میں تم دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں مانگتا،“

”ہاں! اگر طلبگار ہوں تو صرف تیرا۔

“اے میری پیاری رات!

جلد آ! جلد آ!

کہ میں تیرے انتظار میں ہمہ تن اضطرار بنا ہوا ہوں“

(شیلی) **تنویر قریشی دہلوی**

غزلیات

(۱)

کسی کے دل کو جو درد آشنا بنا نہ سکے
وہ لفظ بار الٰہی زباں پہ آ نہ سکے

کٹی ہے لطف و مسرت میں زندگی لیکن
تمہارے درد کی لذت کو ہم بھلا نہ سکے

نگاہ کیا جسے جلووں کا انتظار رہے
وہ دل ہی کیا جسے چاہے حسیں بنا نہ سکے

زمانہ دیکھ رہا ہے مری خموشی کو
ہے دل میں بات ہی ایسی کہ لب پہ آ نہ سکے

دیا بھی تو نے جو مجھ کو تو کیا دیا آخر
وہ دل کہ بارِ تجلی ترا اٹھا نہ سکے

ہنسی اڑائے گی دنیا تری خدائی کی
جو تجھ کو دیکھ سکے تو اسے بنا نہ سکے

(محمد ابراہیم خیال)

(۲)

اے ذوقِ شاعری یہ تری خوش ادائیاں
اے طبعِ خوردبیں وہ زمانے اب کہاں

لازم ہے کچھ زمانہ کی رفتار کو بھی دیکھ
بیکار ہیں تمام تری جانفشانیاں

وہ دن گئے کہ تیری تعلّی پسند تھی
سنتے تھے لوگ شوق سے یہ لن ترانیاں

ہوگی تجھے نصیب نہ اب چین کی جگہ
وہ شاخ ہی نہیں ہے جہاں تھا وہ آشیاں

کبکِ دری کو چاہئے بدلے اب اپنی چال
اب کوئی دیکھتا نہیں نازک خرامیاں

خاموش ہو کے ہم بھی نہ بیٹھیں تو کیا کریں
اکثر ہیں نیک فکر میں بھی سو خرابیاں

حافظ ولایت اللہ

(۳)

غیروں کے سامنے یہ تری بے نیازیاں
یہ بے نیازیاں ہیں کہ دشمن نوازیاں

آئینہ دارِ ناز مرا ذوقِ عجز ہے
حاصل تھیں ورنہ کب تجھے یہ سرفرازیاں

اِک آرزو نے مجھ کو سکھا دیں عبادتیں
ورنہ کہاں میں اور کہاں پاکبازیاں

کیا لطفِ زندگی جو نہ ہو سوز و سازِ عشق
زندہ ہے دل کہ حسن میں ہیں دلگدازیاں

سلیم فارانی

(۴)

کہتے ہو کہ اب مجھ پہ جفا بھی نہ کرو گے
اے جانِ وفا! خوفِ خدا بھی نہ کرو گے

غیروں سے بڑھاؤ گے رہ و رسمِ محبت
کیا مجھ کو گرفتارِ بلا بھی نہ کرو گے

توڑو گے سوا مجھ پہ ستم اور وفا پر
یعنی مجھے ناشادِ وفا بھی نہ کرو گے

مانا کہ مٹا دو گے مرے قلبِ حزیں کو
مانا کہ مجھے رہنِ جفا بھی نہ کرو گے

یہ سب مجھے تسلیم مگر یہ تو کہو تم
کیا میرے دل و جان میں بسا بھی نہ کرو گے

اے ذوقِ وفا! اے اثرِ جذبِ محبت
کیا اس کو پشیمانِ جفا بھی نہ کرو گے؟

ہمنشیں

نواہائے راز

غیروں کے لبوں پر بھی جاری ہے فغاں میری
اب لاج تمہیں رکھنا اے دردِ نہاں میری

کچھ سُوجھ نہیں پڑتا، ہر سمت اندھیرا ہے
حیران ہوں پھر کیوں ہیں آنکھیں نگراں میری

مجبوری و مختاری، پابندی و آزادی
صد رنگ قیامت ہے اور ایک یہ جاں میری

اے راہِ تمنا اب خاکِ رہِ منزل کر
یا جلد وہاں پہنچا، منزل ہے جہاں میری

تقدیر مری حسرت، تدبیر مری حسرت
یا موت مری حسرت، یا روح رواں میری

اے درد مرے کب تک یہ حسرتِ ہمدردی؟
بکتی نہیں دنیا میں یہ جنسِ گراں میری

ہر داغ سے واقف ہے وہ محرمِ غم میرا
پھر کس لئے اے حامد یہ آہ و فغاں میری

حامد علی خاں

محفلِ ادب

غزل

حُسن کے رازِ نہاں شرحِ بیاں تک پہنچے

آنکھ سے دل میں گئے دل سے زباں تک پہنچے

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے اُن سے کہہ دی

بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عِشق پہلے ہی قدم پر ہے یقین سے واصل

انتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے

کعبۂ و دیر میں تو لوگ ہیں، آتے جاتے

وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

آنکھ سے آنکھ کہے دل سے ہوں دل کی باتیں

وائے وہ عرضِ تمنّا جو زباں تک پہنچے

'معارف'

گلاب

اگست کے آخری دن تھے ..... خزاں آرہی تھی۔

آفتاب غروب ہورہا تھا۔ اچانک گرجے چمکے بغیر پانی کا ایک جھالا ہمارے میدان پر برستا ہوا گزر گیا۔

گھر کے سامنے باغ کے ڈھلے ہوئے درختوں میں سورج کی آخری شعاعوں نے ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ وہ گول کمرے میں اپنی میز کے پاس بیٹھی تھی اور نیم وا دروازے میں سے اپنی خواب آلود آنکھوں سے مسلسل باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں جانتا تھا کہ اس کے دل میں اس وقت کون سا خیال ہے؛ میں جانتا تھا کہ ایک مختصر سی مگر درد انگیز کشمکش کے بعد وہ اس وقت اس جذبے سے مغلوب ہوگئی ہے جسے وہ اب اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتی۔

یکایک وہ اُٹھی، تیزی سے باہر باغ کی طرف چل دی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا ..... پھر دوسرا؛ وہ واپس نہ آئی۔

اب میں بھی اُٹھا اور گھر سے نکل کر اس روش پر چلنے لگا جس پر سے وہ گزری تھی۔ اگرچہ جاتے ہوئے میں نے اسے دیکھا نہ تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اسی راستے سے گئی ہے۔

میرے آس پاس تمام اندھیرا چھا رہا تھا؛ اب رات ہو چکی تھی لیکن روش کی گیلی گیلی ریت پر کوئی گول گول سُرخ سُرخ چیز پڑی ہوئی رات کے دھندلکے میں بھی نظر آرہی تھی۔

میں نے جھک کر دیکھا۔ یہ گلاب کا ایک تازہ اور نوشگفتہ پھول تھا۔ اب سے دو گھنٹے پہلے میں نے اسی پھول کو اس کے سینے پر لگا ہوا دیکھا تھا۔

میں نے اس پھول کو کیچڑ پر سے نہایت احتیاط کے ساتھ اٹھا لیا، اور گول کمرے میں جاکر اس کی میز پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ آگئی اور نہایت سبک رفتار کے ساتھ سارے کمرے کو طے کرکے اپنی میز کے پاس جا بیٹھی۔

اس کا چہرہ اب پہلے سے زیادہ زرد اور زیادہ روشن تھا؛ اُس کی جھکی ہوئی آنکھیں جو اب پہلے سے کچھ چھوٹی نظر آرہی تھیں پُرمسرت گھبراہٹ میں جلدی جلدی اِدھر اُدھر حرکت کرنے لگیں

اُس نے گلاب پر ایک نگاہ ڈالی پھر اُسے اُٹھا کر اُس کی کچلی ہوئی گرد آلود پنکھڑیوں کو دیکھا، اس کے بعد مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کی آنکھیں جو اب یکایک مجھ پر جم گئی تھیں آنسوؤں سے روشن ہوگئیں۔

میں نے کہا "تم کیوں رو رہی ہو؟"

اس نے جواب دیا "آہ، اس گلاب کو دیکھو۔ اس کا کیا حال ہوگیا ہے!"

اس پر مجھے ایک بلیغ فقرہ کہنے کا خیال آیا۔ میں نے معنی خیز انداز سے کہا "تمہارے آنسو اس آلائش کو دھوڈالیں گے"۔

اس نے کہا "آنسو دھوتے نہیں وہ جلا ڈالتے ہیں"۔ اور آتشدان کی طرف مڑ کر اس نے گلاب کو بجھتے ہوئے شعلوں میں ڈال دیا۔

پھر جوش کے ساتھ کہنے لگی "آگ آنسوؤں سے بھی بڑھ کر جلانے والی ہے" اور اس کی خوبصورت آنکھیں جو ابھی آنسوؤں سے چمک رہی تھیں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ بھی ایک آگ میں جل رہی تھی۔

کیسے خوبصورت کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

بہت عرصہ ہوا میں نے کبھی کہیں ایک نظم پڑھی تھی۔ وہ جلد ہی بھول گئی۔۔ لیکن پہلا مصرع میرے ذہن میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

کیسے خوبصورت کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

اب سردی کا موسم ہے! کھڑکیوں کے شیشوں پر پالا جم گیا ہے! تاریک کمرے میں تنہا ایک بتی جل رہی ہے میں ایک گوشے میں دبکا بیٹھا ہوں اور میرے دل میں بار بار یہ مصرع گونج رہا ہے:-

کیسے خوبصورت کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

پھر میں اپنے آپ کو روس کے ایک دیہاتی مکان کی نیچی سی کھڑکی کے سامنے پاتا ہوں۔ بہار کی شام آہستہ آہستہ رات میں تبدیل ہو رہی ہے خوشگوار ہوا لکھٹوں اور سنگتروں کے پھولوں سے مہکی ہوئی ہے کھڑکی میں ایک نوجوان لڑکی اپنا سر اپنے کندھے پر جھکائے ایک بازو پر جھکی بیٹھی ہے اور خاموشی کے ساتھ ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے گویا نئے ستاروں کے نکلنے کا انتظار کر رہی ہے اس کی خواب انگیز آنکھوں میں کیسی پاکیزگی ہے کیسا سحر ہے! اس کے ہونٹوں پر جو مستفسرانہ انداز میں کھلے ہوئے ہیں کیسی معصومیت کھیل رہی ہے' وہ اٹھتا ہوا ابھرا ہوا دوشیزہ سینہ کس سکون کے ساتھ سانس لے رہا ہے کتنا معصوم اور نازک ہے اس کے نوخیز چہرے کا ایک ایک نقشہ! مجھے اس سے بولنے کی جرأت نہیں ہوتی، مگر مجھے اس سے کتنی محبت ہے میرا دل کس طرح دھڑک رہا ہے!

کیسے خوبصورت کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

کمرے میں اندھیرا چھائے جا رہا ہے۔۔۔ شمع دھیمی دھیمی جل رہی ہے اور بہے جا رہی ہے رقصاں سائے نیچی چھت پر لرز رہے ہیں باہر پالے کی بے دردانہ کڑکڑاہٹ اور اندر بڑھاپے کی اداس آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

کیسے خوبصورت کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

شمع ٹمٹما کر بجھ جاتی ہے۔۔۔ یہ بھاری اور رکھوکھلی آواز سے کون کھانس رہا ہے؟ میرا بوڑھا کتا میرا تنہا رفیق سمٹ سمٹا کر میرے قدموں میں بیٹھا کانپ رہا ہے۔۔۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میں ٹھٹھر رہا ہوں۔۔۔ اور وہ سب مر چکے ہیں۔۔۔ مر چکے ہیں۔۔۔۔

کیسے خوبصورت کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

ادبی دنیا

مطبوعات

مولانا شبلی اینڈ عمر خیام - یہ جناب رستم سپتن جی بھاجی والا کی انگریزی کتاب ہے جو ایک سو اٹھارہ صفحات پر بہ حسن اہتمام شائع ہوئی ہے دیباچے اور تمہید کے صفحات اس پر مستزاد ہیں مؤلف کے والد ماجد کی تصویر کے علاوہ علامہ شبلی اور حکیم عمر خیام کی تصاویر بھی زینتِ کتاب ہیں مؤلف پارسی ہیں اس لئے قدرۃً انہیں فارسی زبان سے خاص دلچسپی ہو کتاب کے مطالعہ سے فارسی ادبیات کے متعلق اُن کی گہری واقفیت کا پتا چلتا ہے تمہید اور دیباچہ کے بعد پچاس صفحات میں مولانا شبلی کے حالات نہایت قابلیت و تحقیق سے جمع کئے گئے ہیں اس موضوع پر اس سے قبل غالباً اس سے بہتر کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ اس کے بعد خیام کے متعلق شعرالعجم سے مولانا کے مضمون کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب خیام شبلی اور فارسی زبان کے قدردانوں کے لئے بہت مفید اور دلچسپ ہے اور مصنف نے قابلِ تعریف کام کیا ہے جس کی امید ہے کہ قدر کی جائے گی قیمت مجلد للعہ ر۔ جناب مصنف سے امپاواڑی۔ مزرے گاں ممبئی ۱ سے منگوائیے۔

رازِ - یہ مسٹر کے ایم یوسف الدین کی انگریزی تصنیف ہے جس میں ساٹھ ستر کے قریب چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں مضامین کا موضوع بیشتر حقیقی اور مجازی محبت ہے مضامین کو پڑھتے ہوئے خیال خودبخود ٹیگور کی طرف چلا جاتا ہے۔ کتاب انگلستان میں چھپی ہے مصنف سے گورنمنٹ ہائی سکول جالنہ دکن کے پتے سے منگوائیے۔

تیمور ہمیں بہت مسرت ہے کہ دہلی کے شاہی خاندان کے دو قابل افراد مرزا صلاح الدین صاحب گورگانی اور مرزا ہمایوں اختر صاحب گورگانی نے تیمور کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا ہے سرورق پر لال قلعے کی اور شاہجہاں کی تصویر ہے اور یہ مصرع طرازِ عنواں ہے "جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں" خدا کرے کہ یہ پیشگوئی پوری ہو اور تیمور شاہی خاندان کے شیرازۂ پریشاں کو جمع کر کے پھر اسی معراج کمال تک پہنچانے میں کامیاب ہو جہاں تک اس کے جلیل الشان آباد اجداد پہنچے تھے۔ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کو اس رسالے کی خاص طور پر سرپرستی کرنی چاہیئے مغلیہ خاندان کے اکثر شہزادوں کے مضامین اس رسالے میں شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن بہتر یہ ہو کہ وقتاً فوقتاً تیموریں خاندانِ مغلیہ کے تمام ان پریشان روزگار افراد کی تصاویر اور حالات شائع ہوں جو ہندوستان کے مختلف اقطاع میں گمنامی اور مصیبت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے ساتھ ہی ان کی حالت بہتر بنانے کے لئے تجاویز سوچی جائیں۔ اس سے نہ صرف رسالہ بہت دلچسپ بن جائیگا بلکہ خاندان کی اصلاح و ترقی میں بھی بہت مدد ملیگی۔ اس خاندان نے ہندوستان پر جو احسانات کئے ہیں وہ حدِ شمار سے باہر ہیں اور اگر اہلِ ہند اس رسالے میں دلچسپی لے کر اسے کامیاب بنانے میں دریغ کریں تو سخت افسوسناک بات ہوگی رسالہ کی کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ سرورق بہت خوبصورت ہے رسالے میں اچھی اچھی تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں چندہ صرف دو روپے سالانہ ہے۔ دفتر رسالہ تیمور کرہ بنگش دہلی سے منگوائیے۔

محشرستان - یہ جناب محشر عابدی بی اے کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو خوبصورت سرورق کے ساتھ بہت اہتمام سے شائع ہوا ہے حجم ۲۳۵ صفحات ہے "ہمایوں" میں حضرتِ محشر کے بعض افسانے شائع ہو چکے ہیں اس لئے اُن کو ناظرین سے روشناس کرانے کی ضرورت نہیں۔ افسانے دلچسپ ہیں قیمت فی جلد غیر مجلد عہ مکتبہ عہد آفریں معرفت دفتر مالگذاری حیدرآباد دکن سے منگوائیے۔

فہرستِ مضامین

ہمایوں بابت ماہِ دسمبر ۱۹۳۳ء

تصاویر:- (۱) پھول بازار (۲) شادی کے بعد

قیمت فی پرچہ ۸ر — چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے مع محصول — ششماہی ۳ر مع محصول

طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آنرس)، مدیر "ہمایوں" کی تازہ تصنیف کے متعلق

اہلِ ملک کی رائیں

میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لا صدر بلدیہ لاہور

"طلسمِ زندگی" کے ملتے ہی جلد اور چھپائی کی خوبصورتی دیکھ کر جب فہرست مضامین پر نظر ڈالی تو دل نہ چاہا کہ اس کتاب کو بغیر پڑھے اور ختم کئے چھوڑا جائے اور نہ چھوڑا جا سکتا ہے میں نے اس کتاب کو اپنی میز پر رکھ لیا ہے تاکہ وقتاً فوقتاً اس کے کسی نہ کسی مضمون کو دوبارہ سہ بارہ بلکہ متواتر پڑھا جائے یہ ایک خوبصورت چھوٹے چھوٹے مگر قیمتی موتیوں کی لڑی ہے۔ آپ نے صرفِ کثیر سے اس کو مرتب کر کے شائع کیا ہے اور حضرتِ ہمایوں مرحوم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ خدا آپ کو اس کا صلہ بخشے۔

میر سعادت حسین صاحب نجیب مہتمکندہ حیدرآباد دکن

"طلسمِ زندگی" آرائشِ ظاہری کے باعث بیحد نظر افروز اور حسنِ معنوی کی وجہ سے نہایت روح افزا ہے کتاب کو دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی اور جی باغ باغ ہو گیا۔

چودھری محمد ضیاء الدین صاحب شمسی جرنلسٹ

میں مفصل رائے تو ساری کتاب پڑھ کر لکھوں گا لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مرقع چغتائی کے بعد یہ پہلی کتاب ہے جو اس شان کے ساتھ شائع ہوئی ہے اسے دیکھ کر میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک زندہ مصنف کی زندہ زبان میں زندہ رہنے والی تصنیف ہے۔

کتابت، طباعت، تصاویر، جلد ہر چیز نظر فریب اور دیدہ زیب ہے، اور آپ کے حسنِ مذاق کی شاہد۔

کاش آپ کا اندازِ تحریر میرے مقدر میں بھی ہوتا!

قیمت ——— پانچ روپے ——— علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ } سید عبداللطیف۔ دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور

جنوری ۱۹۳۴ء میں "ہمایوں" کی بارہویں سالگرہ ہے۔ اس مسرت انگیز تقریب پر اس دفعہ "ہمایوں" کا سالگرہ نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا جائیگا۔ یہ پرچہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے خود "ہمایوں" کے سالگرہ نمبروں میں بھی ممتاز ہوگا۔ ظاہری و معنوی محاسن کے اعتبار سے یہ نفیس اور ضخیم مجموعۂ ادب کتب خانوں کی زینت بننے کے قابل ہوگا:۔

سرورق۔ کسی حیرت کار مصوّر کے انوکھے خیال کا مرقع ہوگا۔

تصاویر۔ جو عرصۂ دراز کی تحقیق اور جستجو کے بعد بصرف زرِ کثیر حاصل کی گئی ہیں۔ اپنی مثال آپ ہوں گی۔

علمی و ادبی مضامین ایسے گراں پایہ ہونگے کہ خود "ہمایوں" کو اُن پر ناز ہوگا۔

افسانے جو سحر طراز افسانہ نگاروں کے سرمایۂ ناز کارناموں سے منتخب ہوں گے دنیا کے کاروبار سے تھکے ہوئے دماغوں کو شعر و ادب کی پُرسکون اور کیف انگیز طلسماتی فضاؤں میں لے جائیں گے۔

حصۂ نظم۔ بہترین نقادوں اور شاعروں کا انتخاب اور جادو نگار شعرا کے دلآویز تخیل کا عطر ہوگا۔

مزاحیہ مضامین اور حکیمانہ نکتے اہلِ ذوق کی تفریح کا سامان فراہم کریں گے

سالگرہ نمبر کے دوسرے محاسن نظر پرور اور روح افزا ہوں گے۔

"ہمایوں" میں پاکیزگیٔ مذاق اور لطافتِ خیال کا بہت اہتمام ہوتا ہے۔ مخربِ اخلاق تصاویر، اشتہارات اور مضامین وغیرہ اس میں شائع نہیں ہوتے اسی لئے یہ رسالہ بہ تعدادِ کثیر خواتین اور طلبہ کے ہاتھوں میں جاتا ہے۔

مفت

سالگرہ نمبر کی قیمت کم از کم ایک روپیہ فی جلد ہوگی لیکن اگر آپ ۱۵ دسمبر تک پانچ روپے چھ آنے مع محصول سالانہ چندہ بھیج کر خریدار بن جائیں تو یہ پرچہ آپ کو مفت ملیگا اور اس کے علاوہ دسمبر ۱۹۳۴ء تک "ہمایوں" جیسا موقر ادبی رسالہ آپ کو مطالعہ کے لئے ملتا رہے گا۔ جو حضرات تین روپے مع محصول ششماہی چندہ بھیجیں گے انہیں بھی سالگرہ نمبر مفت ملیگا۔ آج ہی درخواستیں بھیج دیجئے کیونکہ پرچہ محدود تعداد میں شائع ہوگا اور ختم ہوجانے پر کسی قیمت میں بھی نہ ہو سکے گا۔

سید عبد اللطیف مینجر رسالہ "ہمایوں" ۲۳ لارنس روڈ لاہور

جہاں نما

وحشیانہ تفریحات

مرغ بازی

"چیمبرز جرنل" میں "انسان کے بہیمانہ کھیل" کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے۔ راقم نے لکھا ہے کہ تقریباً ہر ملک میں تفریح کا یہ وحشیانہ طریقہ رائج ہے کہ لوگ دو جانوروں کو باہم لڑا کر ان کی ہلاکت کے تماشے سے اپنے تفنن طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

انگلستان میں اب تک مرغ بازی کا رواج ہے اور عدالتوں میں جو مقدمات اس سلسلے میں طے ہوتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر طبقے کے لوگ مرغوں کی لڑائی سے دلچسپی رکھتے ہیں چنانچہ مرغ بازوں کی خوب حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور لڑائی کے لئے اچھے سے اچھے مرغ پال کر تیار کئے جاتے ہیں۔

بعض دفعہ دو حریف اپنی طرف سے ایک سے زائد مرغے لڑائی کے لئے پیش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک حریف اپنے حریف کے تیرہ مرغوں کے مقابلے میں اپنے تیرہ مرغے پالی میں لاتا ہے کبھی کبھی ایسے موقعوں پر ایک ایک ہزار پاؤنڈ کی شرط باندھی جاتی ہے۔

سگ بازی

انگلستان میں ایک اس سے بھی زیادہ وحشیانہ کھیل رائج ہے۔ اسے سگ بازی کہہ سکتے ہیں۔ یہ مرغ بازی سے بھی زیادہ ظالمانہ تفریح ہے۔ سگ بازی کے لئے عموماً بُل ٹیریر پالے جاتے ہیں۔ ان کتوں میں بُل ڈاگ کی جرأت اور ٹیریر کی تندی اور جوش مل کر انہیں اس مقصد کے لئے خاص طور پر موزوں بنا دیتا ہے۔ یہ تندمزاج کتے لڑائی کے لئے خاص طور پر تیار کئے جاتے ہیں اور ابھی یہ پلّے ہی ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے کو چیرنے پھاڑنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ کتوں کی لڑائی اس قدر وحشیانہ ہوتی ہے کہ اس کو بیان کرنے سے قلم قاصر ہے۔ یہ انتہائی بربریت کا نظارہ اُس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ ایک کتا مر نہیں جاتا یا کم از کم مرنے کے قریب نہیں ہو جاتا۔

ہاتھیوں کی لڑائی

مرغوں اور کتوں کی لڑائی ہندوستان کے طبقۂ ادنیٰ میں بھی رائج ہے۔ لیکن ہاتھیوں کی لڑائی سے امرا بھی لطف اندوز

ہوتے ہیں۔

ہاتھیوں پر مہاوت سوار ہوتے ہیں اور دونوں ہاتھیوں کے درمیان ایک نیچی سی دیوار حائل ہوتی ہے۔لڑائی اُس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک ایک ہاتھی ہار کر بیٹھ نہ جائے۔

لیکن ہاتھیوں کی حقیقی لڑائی اس سے بہت زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ اس صورت میں اُن پر مہاوت سوار نہیں ہوتا بلکہ دونوں ہاتھی نہایت خونخوار طریقے سے باہم لڑائے جاتے ہیں اور جب تک ایک ہاتھی دوسرے ہاتھی کو اپنے دانتوں وغیرہ سے چیر پھاڑ نہ ڈالے لڑائی جاری رہتی ہے۔ بعض اوقات کسی چیتے یا گینڈے کو بھی ہاتھی سے لڑا دیتے ہیں۔

جھینگروں کی لڑائی

چین اور فلپائن میں ایک عجیب وغریب تفریح رائج ہے۔ اس میں مرغوں، کتوں یا ہاتھیوں کے بجائے دو جھینگر باہم لڑائے جاتے ہیں چینیوں میں عوام کو یہ کھیل بہت مرغوب ہے۔ چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسے دیکھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ اس کھیل کی نوعیت کے پیش نظر سب لوگ بہ چشم خود کھیل کا نظارہ نہیں کرسکتے صرف رئیس اور منصف ہی کھیل کو دیکھتے ہیں اور جس طرح فٹ بال وغیرہ کے بڑے میچوں میں ریڈیو کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً کھیل کی حالت سے لوگوں کو مطلع کیا جاتا ہے اسی طرح جھینگروں کی لڑائی کے متعلق بھی ساتھ ساتھ اعلان ہوتا رہتا ہے۔ جھینگروں کی لڑائی عموماً مٹی کی ایک چھوٹی سی تشتری میں ہوتی ہے۔ اور چوہے کی مونچھوں کے برش سے چھو کر وہ لڑنے پر آمادہ کئے جاتے ہیں۔ یہ لڑائی بھی اُس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک ایک جھینگر مر نہ جائے۔ کیونکہ جو لوگ جھینگروں کی لڑائی پر شرطیں باندھتے ہیں وہ اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے جھینگر کی ہار جیت کا فیصلہ موت نہ کردے۔

گھوڑوں کی لڑائی

جزائر فلپائن میں ایک اور کھیل سے بہت دلچسپی لی جاتی ہے۔ یہ گھوڑوں کی لڑائی ہے۔ مقامی امرا اس مقصد کے لئے گھوڑوں کی خاص طور پر تربیت کرتے ہیں۔ یہ لڑائی اس لحاظ سے عجیب ہوتی ہے۔ کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لئے گھوڑوں کے پاس بجز دانتوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ گھوڑوں کو لڑائی پر اکسانے کے لئے ایک نوجوان گھوڑی درمیان لائی جاتی ہے۔ یا ان کی آنکھوں پر سورج کی روشنی کا عکس ڈالا جاتا ہے۔ گھوڑے عموماً ایک دوسرے کو گردن پر کاٹتے ہیں۔ اور جب ایک گھوڑا ہار جاتا ہے تو لڑائی ختم ہو جاتی ہے۔

حکومت امریکہ اس کھیل کے سدباب کی کوشش میں مصروف ہے۔

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی

جدید تعلیمی ادارات اور تعلیم کا روز افزوں شوق

حکومتِ دکن کی رپورٹ بابت سنہ ۱۳۴۰ فصلی میں دکن کی تعلیمی ترقی کی روئداد بہت امید افزا اور قابلِ تعریف ہے۔ نہ صرف تعلیمی اداروں کی تعداد میں ترقی ہوئی ہے بلکہ طلبہ کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دکن نہایت سرعت کے ساتھ تعلیم و تہذیب کے بلند مدارج پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے کل ۴۲۵۶ تعلیمی ادارات تھے۔ اب ان کی تعداد ۴۲۸۵ ہے۔ طلبہ کی کل تعداد پہلے ۲۹۱۹۲۰ تھی اور اب ۲۹۹۹۶۳ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہ حیثیتِ مجموعی ۲۹ مدارس اور ۸۰۴۳ طلبہ کا اضافہ ہوا۔

شعبہ جات تعلیم پر بہ حیثیتِ مجموعی جو خرچ ہوتا ہے۔ وہ ۹۰۹۷۰۸۱ روپے سے بڑھ کر ۹۸۹۹۹۱۳ روپے ہوگیا ہے ۴۲۸۵ مدارس میں سے ۳۵۹۸ لڑکوں کے لئے ہیں اور ۶۸۷ لڑکیوں کے لئے ہیں ان کے طلبہ اور طالبات کی تعداد علی الترتیب ۲۵۶۲۹۴ اور ۴۳۵۶۹ ہے۔ گزشتہ سال کی رپورٹ سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ لڑکوں کے مدارس میں ۲۶ کا اضافہ ہوا اور ۵۸۰۴ طلبہ بڑھے۔ لڑکیوں کے مدارس میں تین کا اضافہ ہوا۔ اور ۲۱۸۵ نئی لڑکیاں مدارس میں داخل ہوئیں۔ لڑکیوں کی تعداد میں یہ سریع اور اہم اضافہ نہایت امید افزا ہے۔

تعلیمی ادارات کی تفصیلی تشریح حسبِ ذیل ہے:-

(۱) دس کالج

(۲) تئیس مدارسِ فوقانیہ

(۳) ایک سو تئیس [۱۲۳] مدارسِ وسطانیہ

(۴) چار ہزار اکتالیس ابتدائی مدارس

(۵) اکسٹھ مدارسِ خاص

بجز انگریزی ہائی سکولوں کے جن کے طلبہ میں ۱۷۴۲ کی کمی ہوئی باقی تمام تعلیمی ادارات میں گزشتہ سال کے مقابلہ میں طلبہ کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

مختلف تعلیمی ادارات میں طلبہ کا فیصدی تناسب حسبِ ذیل ہے۔

(۱) کالجوں میں :- ۴ر

(۲) مدارسِ فوقانیہ میں :- ۷

(۳) مدارس وسطانیہ میں :- ۱۰

(۴) ابتدائی مدارس میں :- ۸۱

(۵) مدارس خاص میں :- ۱ر۶

پھول بازار
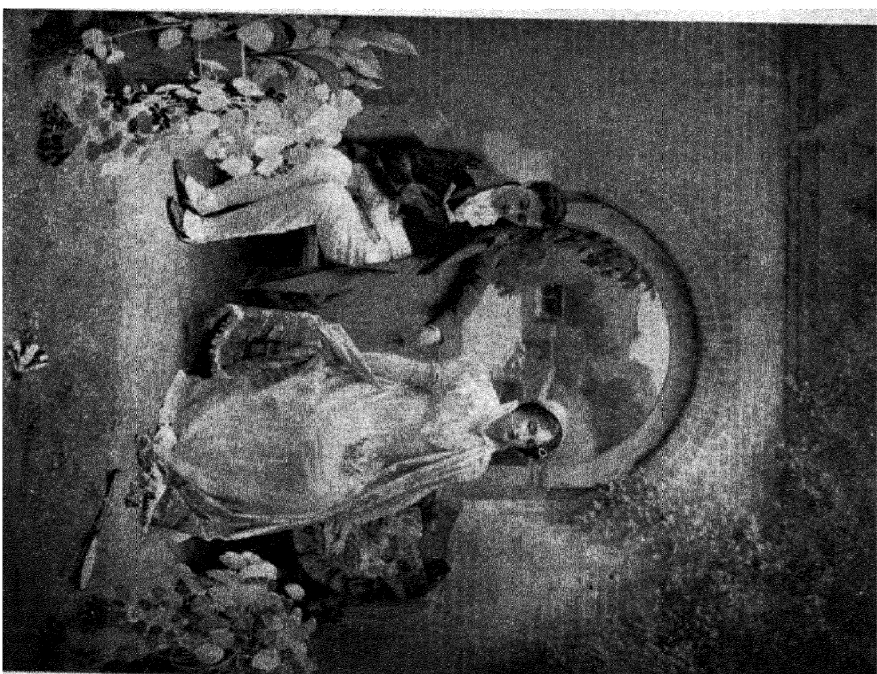
شادی کے بعد

نواہائے راز

بیداد تری چرخِ جفا جُو نہیں جاتی

میں چُپ ہوں پرانی یہ مری خُو نہیں جاتی

مینا ہے وہی اور وہی بادۂ رنگیں،

اِس دل سے تری یاد پری رُو نہیں جاتی

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے

پھولوں سے ابھی تک تری خُوشبو نہیں جاتی

سو جلوے سے محروم ہے میری نگہِ تنگ

تو سامنے ہر سُو ہے یہ ہر سُو نہیں جاتی

میں اور جنوں محرمِ منزل ہیں پر اے عقل

جب جاتے ہیں اُس بزم میں ہم تُو نہیں جاتی

حامد علی خاں

جرمنی میں نسلی منافرت کی تحریک

نازیوں کی حکمتِ عملی کا تجزیہ

حال ہی میں دنیا کی توجہ جرمنی کی اُس زبردست تحریک کی طرف منعطف ہوگئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہودی النسل لوگ جرمن شہریّت کے حقوق سے یک قلم محروم کردیئے جائیں۔ نازی حکومت نے نہ صرف یہودی ڈاکٹروں کو ہسپتالوں سے خارج کردیا ہے یہودی ججوں کو اپنی عدالتوں سے نکال دیا ہے، یہودی وکیلوں کو وکالت کرنے سے روک دیا ہے اور یہودی استادوں اور پروفیسروں کو تعلیمی اداروں کی رکنیت سے جواب دے دیا ہے۔ بلکہ یہودی طلبہ کا داخلہ بھی صنعتی مدارس میں ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اِس طرح جرمنی کے دس لاکھ سے زائد یہودی باشندے اڈولف ہٹلر کی اس زبردست معاندانہ تحریک سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئے جس کا بیڑا اس نے یہودیوں کے خلاف اٹھا رکھا ہے۔ ڈاکٹر کمار پال نے حال ہی میں نہایت قابلیت سے نازیوں کے نقطۂ نظر کی توضیح کی ہے اور موجودہ صورتِ حالات پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں: "۱۹۲۵ء کی مردم شماری سے معلوم ہوا تھا کہ صرف ریش میں ۵۶۴۳۷۹ یہودی آباد تھے اور اب کچھ عرصہ قبل اندازہ کیا گیا کہ اُس وقت سے لے کر اب تک اس آبادی میں صرف چند ہزار کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں یہودی ریش کی کُل آبادی کا .۹ فیصدی حصّہ تھے۔ جرمنی میں یہودیوں کی سب سے زیادہ آبادی پرشیا میں تھی۔ جہاں اُن کی تعداد ۴۰۵۹۶۹ یعنی آبادی کے .۷ فیصدی حصے سے زیادہ تھی۔ دوسرے ملکوں کی طرح جرمنی کے یہودی بھی زیادہ تر شہروں ہی میں آباد تھے تقریباً اُن کا دوتہائی حصّہ ایسے شہروں میں رہتا تھا جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھی اور دس ہزار یا اس سے کم آبادی کے قصبوں میں صرف ۷،۱ فیصدی یہودی تھے۔ یہ تناسب دوسری جرمن آبادی سے مقابلہ کرنے پر عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ۱۹۲۵ء میں کل جرمن آبادی کا ۵۳ فیصدی حصّہ دس ہزار یا اس سے کم آبادی کے شہروں میں آباد تھا۔ نازیوں کے برسرِ اقتدار ہونے سے پہلے نظامِ حکومت میں یہودیوں کو مساوی شہری اور سیاسی حقوق حاصل تھے۔ ریش کے نظامِ حکومت کا ضابطہ ۱۳۶ حسبِ ذیل ہے "شہری اور سیاسی فرائض کی انجام دہی نہ تو مذہبی آزادی سے کسی طرح متاثر ہوسکتی ہے اور نہ اس سے اُن پر کسی قسم کی قیود عائد ہوتی ہیں۔ شہری اور سیاسی حقوق کا دروازہ بلا امتیازِ مذہب و ملّت ہر شخص کے لئے یکساں کھلا ہے۔" اس سے پہلی دفعہ صاف طور پر کہتی ہے کہ "ریش کے تمام باشندوں کو مذہب اور عقائد کی آزادی حاصل ہے اور خود نظامِ حکومت پوری مذہبی آزادی کا ذمہ لیتا ہے" کہتے ہیں کہ ان تحفظات کے باعث نازی اقتدار سے پہلے یہودیوں کو پوری قانونی مساوات حاصل تھی۔ اگرچہ اُس زمانے میں بھی کسی حد تک معاشری اور اقتصادی امتیاز روا رکھا جاتا تھا لیکن اس قسم کے کھلے ہوئے معاندانہ جذبات کا جو آج کل یہودیوں کے خلاف بھڑک اُٹھے ہیں کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جرمنوں نے موجودہ طرزِ عمل اختیار کرنا کیوں جائز سمجھا۔

ایک نئی قومیّت پرستی

نازیوں کے طریق کار اور جرمنی کے موجودہ واقعات کو سمجھنے کے لئے وہ مقولہ پیش نظر رکھنا چاہیئے جس کے متعلق ولیم جیمز نے کہا تھا کہ میں نے آج تک

اس سے زیادہ فلسفیانہ قول نہیں سُنا وہ مقولہ یہ ہے :۔ "آدمی آدمی میں تھوڑا ہی فرق ہے لیکن جتنا بھی ہے خوفناک حد تک اہم ہے" اگر یہاں آدمی کے بجائے ہم نسل یا قوم کا لفظ رکھ دیں اور پھر اُن مفروضات پر غور کریں جو نازی نظامِ عمل کے محرک ہیں تو ہم جرمنی کے موجودہ طرزِ عمل کو سمجھنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ نیڈر جو ہٹلر کا ایک روحانی باپ اور نازی تحریک کا سرچشمہ ہے کہتا ہے کہ ہمارے اور اغیار (غیر نازیوں) کے درمیان ایک آتشیں شمشیر کا ناقابل عبور پل حائل ہے یہ شمشیر ہمارا عمومی نقطۂ خیال ہے۔ ہر روزن برگ کہتا ہے کہ جرمن قوم ایک مخصوص قوتِ عمل اور ایک خاص نسلی امتیاز کی حامل ہے ہم خالص جرمن تہذیب و تمدن کے وارث ہیں۔ وہ عظیم الشان سلطنت جو جرمنوں نے قائم کر رکھی تھی اور جو چار سال کے طویل عرصے تک دنیا بھر کا مقابلہ کرتی رہی محض اس لئے شکست کھا گئی کہ اُسے روحانی "زہروں" نے کمزور کر دیا تھا۔ ان زہروں (مثلاً عالمگیر تہذیب کا عقیدہ بمقابلہ جرمن تہذیب کے، بین الاقوامیت، امنیت اور صلح جوئی وغیرہ) نے نازیوں کی محبوب خالص اشتراکیت سے مل کر ایک شیطانی مرکب تیار کیا جسے مارکسین ازم کا نام دیتے ہیں۔ اس کی مدد سے بین الاقوامی یہودی سرمایہ داری نے جو دنیا بھر پر چھا رہی ہے۔ جرمنی کی مزدور پیشہ جماعت کو بھی اُلّو بنا کر صحیح راستے سے بھٹکا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے مزدوروں کی بہترین کوششیں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔ مارکس کی تعلیم میں جو جماعت کے مقابلے میں موجد اور ذہین افراد کی حیثیت تسلیم نہیں کرتی نازیوں کو مادیت کی انتہا نظر آتی ہے اس لئے وہ انتہائی اشتراکیت سے لے کر معتدل اصلاحیت تک مارکس کے ہر نظریے کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ تنہا یہی علاج اس وقت تک کافی نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُس جرثومے کو بھی ہلاک نہ کر دیا جائے جس نے جرمن خون کو مسموم کر کے جرمنوں کی روح کو مردہ کر دیا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ یہودیوں کے خلاف ایک بے رحمانہ جنگ کا آغاز ضروری ہے۔ ہر روزن برگ کا قول ہے کہ یہودیوں کے اثر و رسوخ کے ازالے کے بعد طبقۂ متوسط اور مزدوروں کا اتحاد ممکن ہو سکے گا۔ طبقۂ متوسط کو بین الاقوامی سرمایہ داری نے تباہ کر کے ایک ایسی جماعت میں تبدیل کر دیا ہے جو مادیت اور افادیت کی روح سے یکسر عاری ہے۔ جرمن مزدور اب کبھی یہ خلاف قومیت غلطی نہ کریں گے کہ وہ ملکی آجروں کے مقابلے میں غیر ملکی مزدوروں سے رشتۂ موافقت استوار کریں۔ آئندہ جرمن تہذیب اور قومیت کی عمارت خالص نسلی اور قومی نقطۂ نظر کی بنیاد پر کھڑی ہوگی۔

جدید نسلی حکمتِ عملی

جرمنی کے گزشتہ شش سالہ اقتصادی اور سیاسی بحران، عہد نامۂ ورسائی کی عارضی اور دائمی ناانصافیوں اور ہٹلر کی زبردست اور پُرجوش فصاحت نے ایک دور رس نتائج پیدا کرنے والی روحانی تحریک کو نشوونما دی ہے۔ جرمنوں نے لاتعداد ایسی کتابیں لکھی ہیں جو قومی اشتراکیت کی مختلف صورتوں کے ارتقا کا باعث ہوئی ہیں اور اب جرمنی کے دشمنوں کے خلاف ایک مقدس جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی ہے۔ آج کل خالص نسلی امتیازات کے لئے بھی جواز کے نیم علمی دلائل پیدا ہوگئے ہیں۔ جرمنی کے وطن پرست نازیوں کی ہر اصلاح کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ماہرین اقتصاد فریڈرش لسٹ کے مداح ہو رہے ہیں اور وہ اب اس نظریے کے حامی بن گئے ہیں کہ قوم کو اپنی اقتصادی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کا دست نگر نہ ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس تحریک کے حامی اٹلی سے قریبی رشتہ پیدا کر رہے ہیں اور وہاں کی فاسی

تحریک کا بہ غور معائنہ کرتے رہے ہیں لیکن ہٹلر نے نازی نظام عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور یہ نظام عمل اب بھی وہی ہے جو ۱۹۲۰ء میں تھا۔ جرمن معاشرہ کو از سر نو منظم کرنے کے لئے نازیوں کی تحریک میں جو ۲۴ تجاویز مدِ نظر رکھی گئی ہیں وہ فرداً فرداً اور اجتماعاً یہودیوں اور ان کے اثر کے قلع قمع ہی پر منتج ہوتی ہیں۔ پانچ کا تعلق قومی اور سیاسی مقاصد سے ہے اور تیرہ کا معاشری اور اقتصادی نظریوں سے پہلی پانچ تجاویز پر عمل شروع کر دیا گیا ہے اور دوسری تیرہ تقریباً معرضِ عمل میں آ چکی ہیں۔ باقی سات تجاویز معاشری حکمتِ عملی کی روح ہیں جن پر عمل کرنے سے بہت سی مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہودیوں کے خلاف عناد کا جو طوفان اٹھا تھا کے پہلے ریلے بعد کے مقابلۃً معتدل ریلوں سے بدرجہا زیادہ زبردست تھے۔ نظامِ عمل کی وہ سات تجاویز جن کا تعلق براہِ راست یہودیوں اور دوسرے "نامطبوع لوگوں" سے ہے حسبِ ذیل ہیں :-

(۴) صرف ہماری قوم (Volksgenosse) کے رکن ہی شہری کہلا سکتے ہیں۔ ہماری قوم کے لوگ صرف وہی ہیں جن کی رگوں میں جرمن خون دوڑ رہا ہے خواہ ان کا کچھ ہی عقیدہ کیوں نہ ہو۔ اس لئے کوئی یہودی ہماری قوم میں شامل نہیں ہو سکتا۔

(۵) ہر وہ شخص جو شہری نہیں جرمنی میں بطور مہمان کے رہ سکتا ہے اور اس پر وہ تمام قوانین عائد کئے جائیں گے جن کا تعلق اجنبیوں سے ہے۔

(۶) صرف شہریوں ہی کو قائد کے انتخاب اور قوانینِ سلطنت کے انضباط کا فیصلہ کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ اس لئے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہر عام ادارہ خواہ وہ کسی نوع کا ہو ریش میں ہو یا ریاستوں میں یا مجالس میں صرف شہریوں ہی سے پُر کیا جائے۔

(۷) ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ سلطنت شہریوں کے روزگار کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پوری آبادی کو خوراک بہم پہنچائے۔ غیر شہری ریش سے خارج کر دیئے جائیں۔

(۸) غیر جرمن آئندہ ملک میں سکونت اختیار کرنے سے قطعاً روک دیئے جائیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام غیر جرمن جو ۲۔ اگست ۱۹۱۴ء سے لے کر اب تک جرمنی میں آباد ہوئے ہیں۔ ریش سے خارج ہونے پر مجبور کئے جائیں۔

(۲۳) ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ سیاسی دروغ گوئیوں اور جرائد کے ذریعہ سے ان کی نشر و اشاعت کا قانونی طور پر سدِ باب کیا جائے۔ جرمن صحیفہ نگاری کی طاقت کے استحکام کے لئے ہمارے مطالبات حسب ذیل ہیں :-

الف۔ جرمن زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کے ایڈیٹر اور کارکن صرف ہماری قوم کے افراد ہونے چاہئیں۔ غیر جرمن اخبارات حکومت کی اجازت کے بغیر شائع نہ ہو سکیں۔

ب۔ کسی جرمن اخبار میں غیر جرمن سرمائے کی حصہ داری یا کسی اور قسم کا اثر قانوناً ممنوع ہو۔ خلاف ورزی کی صورت میں اخبار کی ضبطی اور اس غیر جرمن کے ریش سے اخراج کی سزا دی جائے۔

وہ اخبارات جو قومی مفاد کے خلاف کام کریں بند کر دیئے جائیں۔ فنونِ لطیفہ اور ادبیات میں تمام اس قسم کے اثرات کی روک تھام کی جائے جو ہماری قومی زندگی پر مضر اثرات ڈالتے ہیں اور وہ تمام ادارے جو اس قسم کے اثرات پیدا کر رہے ہوں بند کر دیئے جائیں۔

(۲۴) ہم سلطنت میں تمام مذاہب اور فرقوں کی کامل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں بشرطیکہ ان کا وجود یا اُن کے افعال سلطنت یا جرمن نسل کے رسوم و اخلاق کے نقیض نہ ہوں۔

جرمنوں کی یہ جماعت ایک قسم کی وسیع المعنی عیسائیت کی دعوٰی دار ہے جس کا کسی خاص فرقے یا عقیدے سے تعلق نہیں یہ یہودی سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرنا چاہتی ہے اور اسے یقین ہے کہ جرمن قوم کی نجات کا راز اسی کی پیش کردہ تجاویز میں پنہاں ہے۔

یہودیوں میں دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کی خصوصیّت

جرمنی میں نسلی مسئلے کی سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ انگلستان وغیرہ کی طرح وہاں کے یہودی جرمن قوم میں نہیں سما سکے۔ انگلستان کے یہودیوں میں قوم پرست انگریزوں ہی کی سی ذہنیت پیدا ہو چکی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ انگریزی قوم میں پوری طرح جذب ہو چکے ہیں لیکن انگلستان اور جرمنی میں ایک فرق ہے۔ جرمنی مشرقی یہودیت (یعنی پولینڈ۔ آسٹریا اور ہنگری) اور مغربی یہودیت کے درمیان ایک درمیانی منزل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے جب اشتراکی جمہوری حکومت نے مشرقی ساحل کے دروازے کھول دیے تو جرمنی میں مشرقی یہودیت کا تلچھٹ باقی رہ گیا۔ بدقسمتی سے یہ لوگ بآسانی اس قوم میں جذب نہ ہو سکے جس نے اپنا دسترخوان ان کے لئے وسیع کیا وہ قومی زندگی میں ایک اجنبی عنصر بن کر رہتے ہیں اگرچہ مشرقی یہودی جرمن زبان اور جرمن رسوم و عادات اختیار کر چکے ہیں لیکن اُن کی ذہنیت اور ان کی تہذیب کبھی جرمن نہیں ہو سکی یہی وجہ ہے کہ وہ جرمنوں کے قول کے مطابق قوم کے خلاف تحریکات میں حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گیبلز نے لکھا ہے کہ اشتراکی جمہوریت کی ضمانت میں مشرقی یہودیوں نے اخبارات سنیما اور رائے عامہ کے ذریعے سے تباہ کن بدامنی پھیلا دی ہے۔

یہ سب اُس آزادی کا نتیجہ ہے جو یہودیوں کو جرمنی میں حاصل تھی اگر تم یہودیوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں پر نظر ڈالو اور اس کے بعد قومی زندگی میں ان کی روز افزوں تعداد کو دیکھو اور ساتھ ہی یہ مشاہدہ بھی کرو کہ ملکی اداروں اور مناصب پر اپنی آبادی کے تناسب سے کس قدر زیادہ یہودی قابض ہیں تو تم یہودیوں سے جرمنی کی موجودہ نفرت کی وجوہ بآسانی سمجھ جاؤ گے۔ صورتِ حال کو اس بات نے اور بھی خراب کر دیا ہے کہ یہودی اپنے آپ کو دوسری آبادی سے الگ تھلگ رکھتے ہیں مثلاً برلن کے متمول یہودی تاجر کرسٹن ڈم میں رہتے ہیں اور یہودیوں کا مقابلتہً غریب حصہ گرینڈ برسٹراس میں مقیم ہے۔ یہ حصے خالص یہودی آبادی کے لئے مخصوص ہیں۔

جرمنی کے خلاف معاندانہ تحریکات

جرمنوں کے خیال کے مطابق عموماً انہی حصوں میں کمیونسٹ تحریک کے علمی اور عملی نظامات ترتیب پاتے تھے۔ یہودیوں کے ان غیر جرمن رجحانات نے قدرۃً لوگوں کے جذبات ان کے خلاف بھڑکا دیئے۔ انہی جذبات کو حکومت نے مناسب طریقے سے قانون کا جامہ

پہنچایا اور مزید خطرات کی روک تھام کے لئے ایک خاص تناسب مقرر کر دیا جس سے زیادہ ملازمتیں قانونی اور طبی ادارات میں یہودیوں کو نہ مل سکتی تھیں۔ جرمنوں کے اس خلاف یہودیت طرز عمل سے ناراض ہو کر یہودیوں نے جرمنی کے خلاف سلطنت سے باہر تحریر و تقریر کا جہاد شروع کر دیا۔ جب جرمنوں کو ٹھیک طور پر معلوم ہو گیا کہ اس جہاد کی کل جرمن یہودیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جن میں وہ لڈوگ آئن شٹائن اور فوش وینگر جیسے لوگوں کا نام لیتے ہیں تو اُن کو اپنی حفاظت کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنی پڑیں نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کا عام مقاطعہ شروع ہو گیا۔ اگر حکومت خود دخل دے کر اس نازک موقع پر مقاطعہ کو قانوناً تسلیم نہ کر لیتی اور اسے منظم راستوں پر ڈال نہ دیتی تو جرمنوں کے قول کے مطابق نفرت کے یہ جذبات بہت خوفناک نتائج پیدا کرتے۔ حکومت نے اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے کر عدیم النظیر تنظیم سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جرمن قوم اب اس تحریک کو ملتوی کرنے کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ یہودی اس کو تنہا چھوڑ دیں۔ اس پیچیدہ عقدے کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس صورت حال کو پیش نظر رکھا جائے جو نازیوں کے برسرِ حکومت ہونے سے پہلے پیدا ہو گئی تھی اور پھر اس کا مقابلہ بعد کے واقعات سے کیا جائے۔ اس کے علاوہ جو خطرناک حالات پہلی صورت میں پیدا ہونے والے تھے اُن کا مقابلہ حکومت کے طریق کار سے کیا جائے۔

نازی اور دنیا کی رائے عامہ

جرمنی ایک انقلاب سے دوچار ہو رہا ہے یہ ایک ایسا انقلاب ہے جو کسی اور ملک میں برپا ہوتا تو بہت سی جانیں تلف ہو جاتیں لیکن جرمنی کا موجودہ انقلاب بہ حیثیت مجموعی خون کے دھبوں سے پاک رہا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس سیاسی بھونچال کے آغاز میں عوام کے جوش و ہیجان کی وجہ سے بعض زیادتیاں بھی ہوئیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ بہ حیثیت مجموعی یہ انقلاب پُرامن رہا ہے۔ اگرچہ اب ریش کی حکومت اور صوبوں اور شہروں کے نظامِ حکومت میں نومبر ۱۹۱۸ء سے بھی زیادہ تغیر و تبدل ہوا ہے لیکن لوگوں نے اِس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا ہے۔ اس خیر مقدم کا سبب یہ ہے کہ جرمن قوم جمہوریت کو زیادہ پسند نہ کرتی تھی گو اس کے ماتحت جرمنوں نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اپنی حالت درست کر لی جمہوریت کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جرمن اسے عہد نامۂ ورسائی کا نتیجہ قرار دیتے تھے خود ہٹلر کی کامیابی کا ایک راز جرمن قوم کی یہ خواہش قرار دی جا سکتی ہے کہ وہ عہد نامہ ورسائی کی بیڑیوں سے جلد از جلد رہا ہو جانا چاہتی تھی اور اب جب کہ یہ قوم ایک نئی پیدائش کا درد برداشت کر رہی ہے یہ قدرتی بات ہے کہ وہ غیر مصلح عناصر کے خلاف سخت سے سخت تدابیر اختیار کرے۔ یہودیوں کے خلاف یہ تحریک جرمنوں کی قومی نشاۃ الثانیہ کا ایک جزو لاینجزی ہے۔

بہر حال یہ بہت افسوسناک بات ہے کہ جرمنوں جیسی مہذب قوم کی نشاۃ الثانیہ کا نسلی منافرت سے اس قدر گہرا تعلق ہو جرمنوں کی سخت سے سخت مجبوری کے باوجود اُن کے نام پر ان افعال کی وجہ سے دیر تک ایک بدنما دھبا رہے گا لیکن جب ایک نئی حکومت کی تشکیل معرض عمل میں ہو تو اُس کے افعال کو ہدفِ تنقید بنانا قرین دانش نہیں ہمیں امید ہے کہ دنیا کی رائے عامہ ہٹلر کے افعال پر ٹھنڈے

دل سے غور کرے گی۔ اگر آخر کار وہ یہودیوں کے خلاف حکومت کی روش بدلنے میں کامیاب ہوگیا تو دنیا اس بات کو بھول جائے گی کہ اُس نے سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے جرمنی کے خلافِ یہودیت جذبات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ دنیا کی نظریں اس وقت ہٹلر کے طرزِ عمل پر ہیں اور اگر برلن کی حکومت قانونی اور اقتصادی معاملات میں اپنی خلافِ یہود حکمتِ عملی کی حامی رہی تو جرمنی بین الاقوامی تعلقات کے اعتبار سے گھاٹے میں رہے گا۔ یہ بات نہ صرف اس لئے یقینی ہے کہ دنیا میں یہودی سرمائے کو زبردست طاقت حاصل ہے بلکہ اس لئے بھی کہ دنیا کی تمام جمہوری حکومتوں نے جرمنی کی اس یہود آزار حکمتِ عملی کو بیسویں صدی عیسوی کی تہذیب کے منافی قرار دیا ہے جرمنوں کی اس روش کے خلاف دنیا کی رائے عامہ نے حال ہی میں جو احتجاج کیا ہے اُس پر عہدِ حاضر کی انسانیت بجا طور پر ناز کرسکتی ہے۔

حامد علی خاں

حقیقتِ حُسن

شیلے نے اپنی نظم "سکائی لارک" ۱۸۲۰ء میں لیگھارن کے مقام پر لکھی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں ہارڈی بھی حسنِ اتفاق سے اسی مقام پر ٹھہرا چنانچہ اُس نے اسی ماحول میں شیلے کی غیر فانی نظم سے متاثر ہوکر ذیل کی نظم تحریر کی۔ اس نظم میں یہ حقیقت نہایت حُسن و خوبی سے ظاہر کی گئی ہے کہ حسین چیز اگرچہ فنا ہو جاتی ہے مگر اس کے حُسن کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔ حسن متواتر دیگر دلفریب صورتوں میں نمایاں ہوتا رہتا ہے ——— مترجم

زمین کی فراموش کردینے والی آغوش میں کہیں ایک مٹھی بھر خاک ——— غیر مرئی اور غیر محفوظ ——— پڑی ہوئی ہے جس نے ایک شاعر کے تخیلات کو عرش کیا تھا! وہ خاک اُس سکائی لارک کی ہے جس کا وجد آفریں نغمہ شیلے نے سنا اور جس کو اس نے زندۂ جاوید کردیا ——— اگرچہ اس پرندے نے عام پرندوں کی طرح زندگی کے دن گزارے اور اگرچہ وہ اِس حقیقت سے بالکل ناآشنا رہا کہ وہ لازوال کر دیا گیا ہے اُس نے نہایت سادہ اور قناعت کی زندگی گزاری اور بالآخر زمین پر گر پڑا ——— پوست و استخواں کا ایک ڈھیر ——— وہ کس طرح مرا کس طرح اس نے اپنا وداعی نغمہ گایا، اور اس کی خاکستر کس جگہ بکھری پڑی ہے ——— یہ تمام چیزیں نامعلوم ہیں۔

شاید اُس کی خاک سامنے والی زرخیز زمین پر پڑی ہو ——— یا سبزۂ عشق پیچہ میں متشکل ہو ——— یا سامنے کی پُر ثمر انگور کی بیل کے دلفریب رنگ میں مستور ہوجائے ——— اے پریو! ——— جاؤ اور ڈھونڈ نکالو اُس بیش قیمت مٹھی بھر خاک کو۔ اور ایک سیمیں ڈبیا میں بھر لو جو سونے اور جواہرات سے مرصع ہو! ہم اسے تبرک کے طور پر محفوظ رکھیں گے ——— ایک لامحدود وقت تک ——— کیونکہ یہ اُس پرندے کی خاک ہے جس نے ایک عظیم الشان شاعر کے تخیل کو رفعتِ پرواز بخشی تھی۔

عبدالغفور طاہر قریشی

بادل

مختلف الوان میں دھندلاہٹوں کا امتزاج
کوہساروں پر تخیّل زاد رعنائی کا راج

موجِ کیف و رنگ میں رومان سی اٹکے ہوئے
جس طرح پریوں کے آنچل خواب میں جھٹکے ہوئے

مستیاں اور مستیوں میں عالمِ کیف و جنوں
بادلوں کی خواب گوں دھندلی ضیاؤں کا فسوں

دلنشیں گیتوں کی اک سیال رو محوِ خرام
بیخودی کے روپ میں موسیقیوں کا حسنِ تام

ابر بن کر ایک میگوں راگنی چھائی ہوئی
سب فضا اک گیت کے مانند لہرائی ہوئی

جھاگ کے مینار قائم رفعتوں کے دوش پر
یا سمندر کے تموّج کا سماں پیشِ نظر

خود بہ خود رنگوں کا اک شہ کار سا بنتا ہوا
بادلوں کا پردۂ زرتار سا بنتا ہوا

اک دھواں سا جس سے کیا کیا صورتیں بنتی ہوئیں
کیف و مستی کی روپہلی مورتیں بنتی ہوئیں

آسماں اک نیلگوں پردہ ہے جس پر دم بہ دم
صرف گلکاری ہے نقاشِ ازل کا موقلم

عدمؔ

دنیائے محبّت میں

اس درد کو فطرت کا پیغام بھی کہتے ہیں
ہم کفرِ محبّت کو اسلام بھی کہتے ہیں

دل والوں سے لالے بھی سرگوشیاں کرتے ہیں
خاموش ستارے کچھ پیغام بھی کہتے ہیں

الزام سکوں کیوں ہے دل ہے تو سکوں کیسا
کیا مرگِ مسلسل کو آرام بھی کہتے ہیں

جو تنگ نظر ہیں وہ نیرنگ جنوں سمجھیں
ہم اُن کی تمنا کو الہام بھی کہتے ہیں

یہ شمع کے پروانے یا نجد کے ذرے ہیں
یہ حسُن سے اُلفت کا پیغام بھی کہتے ہیں

آغازِ محبّت کا انجام نہیں کوئی
آغازِ محبّت کو انجام بھی کہتے ہیں

جلووں کے تلاطم کو، بے ساز ترنّم کو،
خاموش تکلّم کو، الہام بھی کہتے ہیں

زیبا تری ہستی کیا دنیائے محبّت میں
ہے نام بڑا لیکن گمنام بھی کہتے ہیں

زیبا عثمانیہ

میر اور اُن کے بہتّر نشتر

مدت سے آرزو تھی کہ میر کے ضخیم دواوین کا انتخاب کروں اور اس انتخاب میں سے بہتّر (۷۲) ایسے اشعار الگ جمع کر دوں جن پر "نشتر" کا اطلاق ہو سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دیرینہ آرزو پوری ہو گئی انتخاب کلام کے ساتھ ایک مبسوط مقدمہ شامل کرنا چاہتا ہوں اس لئے اس کی اشاعت میں تو ابھی کچھ دیر لگے گی لیکن اس "دو آتشہ" کے لئے مقدمہ کا التزام چنداں ضروری نہیں اس لئے خدا کا نام لے کر یہ اشعار اُن اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں جن کے سینے میر کے نشتروں کے لئے ہمیشہ بے تاب رہتے ہیں۔

میر کے کلام میں ایسے اشعار جن پر "نشتر" کا اطلاق ہو سکے، بہتّر سے کہیں زیادہ ہیں لیکن میں اس معاملہ میں "سلفِ صالحین" کے نقشِ قدم پر چلنا پسند کرتا ہوں اور کسی بدعت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔

یہ ضروری نہیں کہ میرا انتخاب ہر شخص کو پسند آئے، بلکہ اگر ناظرین میں سے کسی کو بھی پسند نہ آئے تو بھی مجھے نہ حیرت ہوگی نہ شکایت۔ حیرت تو اس لئے نہیں ہوگی کہ ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہے۔ علاوہ بریں ایک ہی شے مختلف افراد پر مختلف تاثرات مرتب کرتی ہے! اور شکایت اس لئے نہیں ہوگی کہ میں نے ناظرین کے مذاق کو تو ملحوظ ہی نہیں رکھا پھر شکایت کیسی لیکن میر کی عظمت میں ضرور اضافہ ہو جائیگا کیونکہ ناظرین کو کم از کم یہ تو ماننا پڑیگا کہ میر کا کلام اپنے اندر ضرور کوئی کشش رکھتا ہے یا اُس میں ایسی خوبیاں مضمر ہیں جن کی وجہ سے، شعر و سخن کے دلدادہ اُس کا انتخاب کرتے چلے آئے ہیں متعدد انتخابات شایع ہو چکے ہیں لیکن ہنوز دلچسپی کا وہی عالم ہے۔

ممکن ہے بعض نکتہ سنج، یہ فرمائیں کہ جب حال یہ ہو کہ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا" تو انتخاب شایع کرنا کیا ضرور تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فرمانروائے اقلیم سخن کے حضور میں خراجِ تحسین ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اپنی سمجھ کے موافق اُس کے کلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے؟

میر جس طرح گویّوں میں کسی راگنی کے سروپ پر اتفاق آرا بہت مشکل سے ہوتا ہے اور راگنیوں کی "چال" کے متعلق ہمیشہ آپس میں جنگ رہتی ہے، اُسی طرح طبقۂ شعرا میں کسی خاص شاعر کے متعلق، تمام اساتذۂ فن کا متفق الرائے ہونا، نادرات میں سے ہے۔

باایں ہمہ میر کو سب نے "خدائے سخن" اور غزل گو شعرا کا امام تسلیم کیا ہے:-

غالب۔ ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

ذوق۔ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

سودا۔ سودا تو اس زمیں میں غزل درغزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

اثر۔ بیشک کوئی ولی تھا اثر میرِ نکتہ سنج
سب شاعروں سے خاص ہے اس با خدا کا رنگ

رند۔ تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے
عاشق ہیں ہم تو رند اسی بول چال کے

شیفتہ۔ نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے

حالی۔ حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے،
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

جلال۔ کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز
لیکن سخنِ میر تقی میر کی کیا بات!

مصحفی۔ اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعوے
پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میر کے اوپر

دریافت طلب امر یہ ہے کہ میر کے کلام میں وہ کون سی بات ہے جس نے اُسے "خدائے سخن" بنا دیا۔

ذوق کے نزدیک وہ چیز "انداز" ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا اور اس میں شک نہیں کہ "اندازِ بیان" یا "اسلوبِ بیان" ہی وہ چیز ہے جو سننے والے کو تڑپا دیتی ہے اور نظم کو نثر سے ممتاز کرتی ہے۔ انداز کی کئی صورتیں ہیں "غالب کا اندازِ بیاں" اور" ہے۔ میر کا اندازِ بیاں اور ہے۔ اسی اندازِ بیان میں اختلاف کی وجہ سے غالب کے بیشتر اشعار پڑھ کر انسان "فرہنگ انجمن آرا" یا "شرح اشارات" کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن میر کے بیشتر اشعار پڑھ کر بے اختیار سر دھننے لگتا ہے۔

غالب کے یہاں دقت پسندی، فارسی تراکیب، اور نازک خیالی مضمون آفرینی وغیرہ سے کام لیا گیا ہے اور انہی کے مجموعہ کا نام غالب کا اندازِ بیان ہے۔ میر کے یہاں سوز و گداز اور درد و غم کارفرما ہیں اور انہی کے اظہار کا نام میر کا اندازِ بیان ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شے میر کے کلام کو جملہ شعرا کے کلام سے ممتاز کرتی ہے وہ یہی سوز و گداز ہے جو بقول شبلی شاعری اور علی الخصوص غزل سرائی کی جان ہے۔

ذوق اس لئے شعر کہتے ہیں کہ انہیں ایک محاورہ باندھ کر دکھانا ہے۔ کبھی "روزمرّہ" کو خوبصورتی کے ساتھ مصرعہ میں کھپا کر داد لینی ہے کبھی سنگلاخ زمین کو پامال کرنا ہے غیر مانوس قوافی استعمال کر کے فریقِ ثانی پر اپنی شاعری کا سکہ جمانا ہے کبھی صنعتِ شعری کا اظہار مقصود ہے، ناصحانہ رنگ اختیار کر کے سعدی کا ہم رنگ بننا منظور ہے، یا دشاہِ وقت کا تقرب مدِ نظر ہے۔ یا غالب بیچارے کو یہ دکھانا ہے کہ "دیکھو سخنور لوگ اس طرح سہرا کہتے ہیں"۔ یا دو غزلہ کہنا ہے لہٰذا مجبور ہیں کہ شعر پر شعر کہے جائیں، لیکن میر اس لئے شعر کہتا ہے کہ "جذبۂ دل" اُسے شعر کہنے پر مجبور کرتا ہے میر اُس وقت بھی شعر کہتا اگر کوئی سننے والا

نہ ہوتا، لیکن ناسخ، انشا، وزیر وغیرہ کی شاعری مشاعروں اور درباروں کی "واہ وا" اور "سبحان اللہ" کے سہارے قائم تھی انھوں نے ہنگامہ گرم کرنے کے لئے شاعری کے کوچہ میں قدم رکھا، میر نے وارداتِ قلبی کے بیان کرنے کی خاطر شعر کہا :-

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا ، وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

یہ لوگ "زبان کو مانجھتے تھے" میر سوزِ دردنی کا اظہار کرتا تھا۔ اُن کے لئے شاعری ذریعۂ افتخار تھی، میر کے لئے مشغلۂ حیات تھی۔ یہ لوگ شاعر تھے، میر صاحبِ درد و غم تھا :-

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میر ازل ہی سے دردمند دل لے کر آئے تھے، ان کو دنیا میں سوائے رنج و الم کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، چنانچہ خود لکھتے ہیں :-

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ ،
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ کھول کر مصیبت ہی مصیبت دیکھی، دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہوا، بڑے بھائی نے برادرانِ یوسفی کا سا برتاؤ کیا، عنفوانِ شباب ہی میں مجبوراً تلاشِ معاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ دلی میں جب تک رہے تکالیف ہی کا سامنا رہا، خان آرزو نے بھی اچھا سلوک نہ کیا۔ روزی کا مستقل ٹھکانا نہ تھا آج گھر میں اناج، تو کل نانِ شبینہ کو محتاج

بعض اوقات فاقہ کی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ کلام میں بھی اس کی جھلک موجود ہے :-

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کی وضع یاد ہے ہم کو
بہت سعی کیجے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

پھر دلی کی بربادی، اقربا اور شرفا کی تباہی، آئے دن کے انقلاب، مرہٹوں اور جاٹوں کی دستبرد، یہ سب نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قلم سے لکھا :-

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج تخت کا

(ماخوذ از تاریخ ادب اردو)

اس پر طرہ یہ ہوا کہ اُن کے دل پر ابتدا ہی سے عشق کا چرکا لگ چکا تھا اور عمر بھر یہ زخم مندمل نہ ہوا اگرچہ یہ ایک ایسا راز ہے کہ عام طور پر مشہور نہیں لیکن صاحب "بہارِ بے خزاں" نے اس کو فاش کر دیا ہے :-

"بشہر خویش باپری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردۂ تعشق طبع و میلِ خاطر داشت۔ آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ میخواست کہ بخیہ بچارسوئے رسوائی می کشد و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری درآید از ننگ افشائے راز وطن اقربا بادلے بغل پر وردۂ حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد دست و گریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ براندازیہا بشہر لکھنؤ رسید

"ہمیں جا بصد حسرت جانکاہ جلا وطنی و حرماں نصیبی
از دیدار یار و دیار، جاں بجہاں آفریں داد، تا بقید
رشتۂ حیات بود طوق محبت بگردن و سلسلۂ دیوانگی
بپا داشت از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیدا است
کہ صد آرزو بخاک بردہ۔"

میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی در پردہ اس کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :-

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ان کے بعض اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے فن شعر کو انہی عاشقانہ جذبات کے اظہار کے لئے اختیار کیا تھا جو رفتہ رفتہ ان کا مستقل مشغلۂ حیات بن گیا :-

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا (شعر الہند حصہ اول)

میر صاحب کے سوز و گداز کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ایک طبیعت ہی دردمند پائی تھی اوپر سے عشق کا چرکا لگ گیا گویا بقول میر "سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا"۔

اگر میر کے دواوین کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عشق و عاشقی میں، ایک انسان کے دل پر جو حالتیں گزر سکتی ہیں وہ سب اشعار کے پردہ میں بیان کر دی گئی ہیں۔ ان اشعار سے ہر سمجھدار آدمی، عاشقوں کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ با آسانی کر سکتا ہے۔

میر نے دل لگا کر کبھی سکھ نہ پایا، کسی گھڑی راحت نظر نہ آئی، زندگی برباد ہو گئی :-

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

اگرچہ فراق یار ہی میں عمر بسر ہو گئی لیکن، راز افشا نہیں کیا، اللہ رے سمائی! یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ جب تک حال دل احباب سے بیان نہیں کر لیتے چین نہیں پڑتا ہے۔

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر اس دنیا سے "نامراد" گئے :-

نامرادی کی رسم میر سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

میر کو اپنے محبوب کی لگن لگی رہتی تھی لیکن جانتے تھے کہ ہر دم یاد کرنے سے اس کا خیال اس طرح رگ و پے میں سما جائیگا کہ پھر بھلانا امکان سے باہر ہو جائیگا۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر، باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

تنگ آکر، میر بانیٔ رسم عاشقی کو بددعا دینے لگتے ہیں اور یہ بالکل انسانی فطرت کے مطابق ہے :-

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

ہوش سنبھالتے ہی میر کسی کی زلف پیچاں کے اسیر ہو گئے تھے اور بقیہ عمر اسی اضطراب میں گزری :-

نمود کر کے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا ؛ کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

دل دینے کے بعد، اک طرفہ مصیبت کا سامنا ہوتا ہے بلکہ نئی مصیبت پڑتی ہے انسان چونکہ اس آفت سے خبردار نہیں ہوتا لہذا بہت گھبراتا ہے، لیکن آگے چل کر پھر آفتیں نہیں آتیں بلکہ پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں:۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیو ہوتا ہے کیا

عاشق کی کوئی مراد پوری نہیں ہوتی اور اگر کسی کی ہوئی بھی ہو تو کم از کم میر کی نہیں ہوئی:۔

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

میر کی روتے ہی گزرتی تھی:۔

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

عاشق اگر مسجد یا مندر میں جاتا ہے تو وہاں بھی خیالِ محبوب سے غافل نہیں ہوتا:۔

طوفِ حرم میں بھی میں بھولا نہ تجھ کو اے بت
آتا تھا یاد تو ہی میرا خدا ہے شاہد

عاشق کی نظر میں موت، محبت کو ختم نہیں کر سکتی:۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر حسرتِ دیدار اپنے ساتھ قبر میں لے گئے کیونکہ خواہشِ دید کا اظہار افشائے راز کا موجب تھا:۔

موا جس کے لئے اُس کو نہ دیکھا، نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم

عاشق پہلے تو آرزوئے وصال میں جینے کا خواہشمند ہوتا ہے لیکن جب ایک مدت تک پے در پے صدمے اٹھاتا ہے تو کہتا ہے کہ دل لگتے ہی مر جاتا تو اچھا تھا۔

ہوتا نہ دل کا تا یہ سرانجام عشق میں
لگتے ہی جی کے مرگئے ہوتے بلا سے ہم

تھوڑی دیر رونے سے بجائے سکون ہونے کے اور اضطراب ہوتا ہے، عاشق چاہتا ہے کہ خوب روئے تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے اور یہ بالکل قدرتی بات ہے:۔

متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

محبت میں سمجھانا غضب ہے، جس قدر روکو، اسی قدر اس طرف جانے کو دل ہوتا ہے۔

کہنے سے میرے اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

کچھ عرصہ تک روتے رہنے یا اس کی یاد میں تڑپنے یا خیال میں باتیں کرتے رہنے سے عاشق اس طرزِ زندگی کا خوگر ہو جاتا ہے اور سوال یہ ہے کہ اگر عاشق، ان باتوں پر عمل نہ کرے تو اور کیا کرے اُسے دنیا کی باتوں سے تو دلچسپی باقی رہتی ہی نہیں۔

کڑھیئے نہ روییئے تو اوقات کیونکہ گزرے
رہتا ہے مشغلہ سا بارے غم و الم سے

انسان بالطبع جویائے راحت ہے۔ مسلسل صدمے اور پیہم تکالیف برداشت کرنے کے بعد کہیں جاکر دل جفا کا

کا خوگر ہوتا ہے:۔

کیا کیا تعب اٹھائے کیا کیا عذاب کھینچے

تب دل ہوا ہے اتنا خوگر ترے ستم سے

کبھی کبھی عشق میں چُپ لگ جاتی ہے انسان ہفتوں کسی سے بات نہیں کرتا اور نہ کرنا چاہتا ہے:۔

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت

کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے؟

عاشقِ مہجور کو دیکھ کر قدرتی طور پر دل بھر آتا ہے اور انسان اس کے لئے کُڑھنے لگتا ہے:

میر صاحب رُلا گئے سب کو

کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

فرقت کی حالت میں عاشق کے سامنے اگر کوئی شخص محبوب کا نام لیتا ہے تو سنتے ہی تڑپ جاتا ہے اور اس کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور یہ بالکل قدرتی بات ہے:۔

کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی

کہ سنیئے نام ترا اور چشم تر کرئیے

میرؔ کے اشعار اور اُن کے "انداز بیان" سے وہی شخص بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جو اُن کا سا کمال رکھتا ہو یعنی صاحبِ ذوقِ سلیم ہو اور اُس کا دل بھی چوٹ کھایا ہوا ہو۔

سمجھے اندازِ شعر کو میرے۔

میرؔ کا سا اگر کمال رکھے

میرؔ نے وصالِ یار کی بہت کوشش کی لیکن کبھی کامیابی کا امکان بھی پیدا نہ ہوا:۔

بہت سعی کیجے تو مر رہیئے میرؔ

بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

انسان جب بہت آشفتہ حال اور سرگشتہ ہو جاتا ہے جب مدتوں تک موردِ آفات و مصائب رہتا ہے تو کبھی کبھی گھبرا کر کہہ اٹھتا ہے۔

پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہ ہم کو میرؔ

تن میں ہمارے جان کبھی تھی بھی یا نہ تھی

اگرچہ عاشق کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے لیکن وہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی راحت میں کوئی پہلو ایسا نکل آئے جس سے اغیار کو محبوب سے قُربِ نصیب ہو جائے۔

ہنگامہ میری نعش پہ تیری گلی میں ہے۔

لے جائیں گے جنازہ کہاں یاں سے کب مجھے[۱]

عاشق، حد درجہ شکی ہوتا ہے وہ اپنے معشوق کو خدا کے سپرد بھی نہیں کرنا چاہتا کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ عشق است و ہزار بدگمانی۔

غیروں کا ساتھ موجبِ صد وہم ہے بتاں!

اس باب میں خدا بھی کہے تو نہ مانیئے[۲]

عاشق مرنے سے جان نہیں چراتا، لیکن آرزوئے وصل اُسے زندہ رہنے پہ مجبور کرتی ہے وہ کہتا ہے شاید کل وصل نصیب ہو جائے۔

اسی آرزوئے وصل نے مشکل کیا مرنا مرا

ورنہ گزرنا جان سے اتنا نہیں دشوار ہے

---

[۱] یہ شعر بھی اسی رنگ کا ہے:۔ اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل ؛ میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے۔

[۲] غالب کہتے ہیں:۔ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب ؛ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

میں نے صرف ایک دیوان سے اس قدر اشعار سرسری طور پر پیش کر دیئے، اگر تفحص کیا جائے تو ایک مستقل مضمون اس عنوان پر لکھا جا سکتا ہے۔

میر نے اپنے اشعار میں تمام تر اپنے سوز دروں کا اظہار کیا ہے:-

جہاں سے دیکھئے ایک شعرِ شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

میر نے اپنا جگر خون کر کے اشعار کہے ہیں:-

مصرع کوئی کوئی کبھی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

آگرہ سے دلی گئے، اور دلی سے لکھنو گئے لیکن "اداسی" ہر جگہ ساتھ رہی۔

لکھنو، دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس
میر کو سرگشتگی نے بیدل و حیران کیا

میر نے جوانی میں کوئی ایسا کاری صدمہ اٹھایا تھا کہ مرتے دم تک اس کا اثر زائل نہ ہو سکا:-

کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

میر کی زندگی ہی میں اُن کے اشعار کی قدر ہو گئی تھی، لوگ ان میں سے اپنی پسند کے موافق انتخاب کر لیا کرتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ انتخاب اُسی شاعر کے کلام میں سے کیا جاتا ہے جس کے اشعار دلپذیر ہوں:-

اشعارِ میر سب نے چن چن کے لکھ لئے ہیں
رکھیں گے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

میر کے کلام کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی:-

دکھن، اتر، پورب، پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ
اُدھم میرے حرف و سخن نے چاروں اور مچایا ہے

میر کو اپنے کلام کے پُر تاثیر ہونے کا یقین تھا کیونکہ "آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد":-

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
پڑھتے کسو کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

صدمۂ ہجر نے میر کو "بے دماغ" اور زود رنج بنا دیا تھا اور ناز اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی تھی:-

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے
گلگشت کو جو آیئے آنکھوں پہ آیئے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھائیے

مریضِ عشق اچھا نہیں ہوتا۔ یہ وہ مرض ہے کہ دمہ کی طرح دم کے ساتھ جاتا ہے:-

اچھا ہوتا نہیں مریضِ عشق
ساتھ جی کے ہے دل کی بیماری

لکھنو والوں نے اُن کے کلام کی قدر جیسی وہ چاہتے تھے نہیں کی:-

مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں

ذیل میں چند اشعار ایسے نقل کئے جاتے ہیں جن سے میر کا اندازِ بیان بخوبی ظاہر ہو سکے گا:-

میرے منہ پہ رکھا ہے رنگ اب تلک
ہزار آفریں چشمِ خونبار کو

عشق میں ہم نے جان کنی کی ہے
کیا محبت نے دشمنی کی ہے،

لوگوں نے پائی خاک کی ڈھیری مری جگہ
اک شعلہ میرے دل ہی اٹھا تھا جلا گیا

کافر کا بھی رویہ ہوتا نہیں ہے ایسا
ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے؟

دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت
گالیاں کھایئے دعا کریئے

اجڑے نگر کو دل کے دیکھوں ہوں جب کہوں ہوں
اب پھر بسے گی ایسی بستی خراب کیونکر؟

شہر میں گھر خراب ہے اتنا،
آتے ہیں یاں اب اس نشاں سے لوگ

مبارک نہیں میر ہو عشق کرنا،
بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

وفا لوگ آپس میں کرتے تھے آگے
یہ رسمِ کہن آہ تم نے اٹھا دی

رہتی ہو تم آنکھوں میں پھرتے ہو تمہیں دل میں
مدت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو

بلبل کو مُوا پایا کل پھولوں کی دکان پر
اُس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چمن کا تھا؟

وہ دن گئے کہ اٹھ کر جاتے تھے اُس گلی میں
اب سعی چاہیئے ہے بالیں سے سر اٹھاتے

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم،
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں،

منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی
جو حق کہے ہے اس کو یاں دار کھینچتے ہیں

جنوں تیری منت ہے مجھ پہ کہ تو نے
نہ رکھا میرے سر پہ بارِ گریباں

مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم
بالفعل اب ارادہ تا گور ہے ہمارا

ہر کیف اب ہم اُن کے بہتّر نشتر اپنی پسند کے موافق ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:-

(۱) ہر ذرّہ خاک تیری گلی کا ہے بیقرار
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں مل گیا؟

(۲) یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصّہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

(۳) دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے،
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

(۴) پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

(۵) دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے،
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

(۶) دمِ آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا،
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

(۷) متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

(۸) عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے،
آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو

(۹) ہائے اس زخمیٔ شمشیرِ محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

(۱۰) حسرتِ وصل و غمِ ہجر و خیالِ رخِ دوست
مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

(۱۱) یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

(۱۲) نہ رکھی مری خاک بھی اُس گلی میں
شکایت مجھے ہے نہایت صبا سے

(۱۳) سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی
کہ اُس سست پیماں میں بو تھی کسی کی

(۱۴) اپنی خبر بھی ہم کو اب دیر پہنچتی ہے
کیا جانے یار اُس کو کب تک خبر کریں گے،

(۱۵) شاید کہ خونِ دل کا پہنچا ہے وقت آخر
تھم جاتے ہیں کچھ آنسو راتوں کو آتے آتے

(۱۶) جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

(۱۷) آگے بھی تیرے عشق سے کھینچے تھے درد و غم
لیکن ہماری جان پہ ایسی بلا نہ تھی

(۱۸) کہاں تک شب و روز آہ و درد دل کہئے
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

(۱۹) پہنچا تو ہوگا سمعِ مبارک میں حالِ میر
اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے

(۲۰) دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

(۲۱) چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے
اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے

(۲۲) مصائب اور تھے، پر دل کا جانا،
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

(۲۳) تھی چشم دمِ آخر وہ دیکھنے آوے گا
سو آنکھوں میں دم آیا پر وہ نہ نظر آیا

(۲۴) روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

(۲۵) شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے،
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

(۲۶) کہنے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

(۲۷) ہوئیں رسوائیاں جس کے لئے چھوٹا دیار اپنا
ہوا وہ بے مروت بے وفا ہرگز نہ یار اپنا

(۲۸) سب گئے، ہوش و تاب و صبر و تواں
دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا

(۲۹) کس طرح جی سے گزر جاتے ہیں آنکھیں موند کر
دیدنی ہے رہ روندوں کے بھی مرجانے کی طرح

(۳۰) جدائی کے حالات میں کیا کہوں
قیامت تھی اک ایک ساعت کے بعد

(۳۱) پوچھیں ہیں وجہ گریۂ خونیں جو مجھ سے لوگ
کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اُس منہ کا رنگ

(۳۲) تربتِ میر پر چلے تم دیر،
اتنی مدت میں واں رہا کیا خاک

(۳۳) یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے،
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

(۳۴) اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(۳۵) چمن میں جا کے بھرو تم گلوں سے جیب و کنار
ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں

(۳۶) پُرخوں ہمارے دل سی کہتی ہے تو مشابہ
شاید کلی تجھے بھی اُس گُل کی آرزو ہو

(۳۷) ہمیشہ چشم ہی نمناک ہاتھ دل پر ہے
خدا کسی کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

(۳۸) آغاز تو ہے یہ کچھ روتے ہیں خون ہر دم
کیا جانئے عاشقی کا یارو مآل کیا ہے

(۳۹) چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
اک آگ سی لگی ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

(۴۰) ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینہ میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

(۴۱) کیا جانئے کہ عشق میں خوں ہو گیا کہ داغ
چھاتی میں اب تو دل کی جگہ ایک درد ہے

(۴۲) عشق آدم میں نہیں کچھ چھوڑتا،
ہولے ہولے کوئی کھا جاتا ہے جی

(۴۳) جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی،
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے

(۴۴) پھر اس سال سے پھول سونگھا نہیں نے،
دِوانہ کیا تھا مجھے تیری بو نے

(۴۵) دیدنی ہے شکستگی دل کی،
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

(۴۶) عشق بھی ہم میں ہائے تصرف کیسے کیسے کرتا ہے
دل کو چاک جگر کو زخمی آنکھوں کو خونبار کیا

(۴۷) بھرے رہتے ہوں ہر دم پھول ہی جس کے گریباں میں
وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں

(۴۸) کیسی وفا و اُلفت کھاتے عبث ہو قسمیں
مدت ہوئی اٹھا دیں تم نے یہ ساری رسمیں

(۴۹) رہا تھا دیکھ اُدھر میر چلتے،
عجب اک ناامیدی تھی نظر میں

(۵۰) قصور اپنے ہی طولِ عمر کا تھا
نہ کی تقصیر اُس نے تو جفا میں

(۵۱) ہے دور ادب سے، تم کھڑے میں پا کشیدہ ہوں
مت آیو جنازے کی میرے نماز کو،

(۵۲) پہلے دیوانے ہوئے پھر میر آخر ہو گئے،
ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

(۵۳) کڑھتے ہمیشہ رہنا ہم کو بغیر اُس کے،
کیا روگ عاشقی نے جی کو لگا دیا ہے

(۵۴) چپکے کچھ ہو جاتے ہو پھر آنکھیں بھر بھر لاتے ہو
میر گزرتی ہے کیا جی پر؟ کڑھا کرو ہو اکثر تم

(۵۵) دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اُس سے لگ پڑیاں
مار رکھا سو اُن نے مجھ کو کس ظالم سے جا لڑیاں

(۵۶) ہم فقیروں کو کچھ آزار تمہیں دیتے ہو،
یوں تو اس فرقہ سے سب لوگ دعا لیتے ہیں

(۵۷) جان و جہاں سے گزرا میں میر جن کی خاطر
بچ کر نکلتے ہیں وے، میرے مزار سے بھی

(۵۸) دل کی نہیں بیماری ایسی، جس میں ہو امید کبھی،
کیا سنبھلے گا میر ستمکش وہ تو مارا غم کا ہے

(۵۹) فرصت ہے کم رہنے کی یاں بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

(۶۰) خواہش دل سے جی کی تاب گئی،
آنکھیں اُس سے لگیں سو خواب گئی

(۶۱) اُسے ڈھونڈتے میر کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف،

(۶۲) دیکھیں تھیں اک روز تری مست انکھڑیاں
انگڑائیاں ہی لیتے ہیں جب سے خمار میں

(۶۳) کافر کا بھی رویہ ہوتا نہیں ہے ایسا
ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے؟

(۶۴) تیرے بندے ہم ہیں، خدا جانتا ہے
خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے،

(۶۵) وہ بے وفا نہ آیا بالیں پہ وقت رفتن
سو بار ہم نے دیکھا سر کو اٹھا اٹھا کر

(۶۶) اس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے چلا جاتا ہوں
دل کی پھر دل ہیں لئے چپکا چلا آتا ہوں

(۶۷) بے تاب دل نہ دفن ہوا ے کاش میرے ساتھ
رہنے نہ دیگا نعش کو کوئی دن مزار میں

(۶۸) گھر کو اُس کے خراب ہی دیکھا
جس کے یہ چشم و دل مشیر ہوئے

(۶۹) لب پہ مرے آن کر بارہا پھر پھر گئی،
جان کو یہ اضطراب دیکھئے کب تک رہے

(۷۰) آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے
اب آئے تم تو فائدہ؟ ہم ہی نہیں رہے

(۷۱) وہ دن گئے کہ آٹھ پہر اُس کے پاس تھے
اب آ گئے تو دور سے کچھ غم سنا گئے

(۷۲) راہ آنسو کی کب تلک تکیے؛
خون دل ہی کا اب مزہ چکھیے

آخر میں میر صاحب کے سوانح حیات مختصر طور پر ایراد کئے دیتے ہیں:-

میر محمد تقی نام میر تخلص غالباً ۱۱۳۵ھ میں بمقام اکبر آباد (آگرہ) پیدا ہوئے۔ تذکروں میں والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے، مگر "ذکر میر" میں میر صاحب نے اُن کے نام کی تصریح نہیں کی، صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ "میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے، درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ رہے۔ شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے علم ظاہری و باطنی حاصل کیا جوان صالح اور عاشق پیشہ تھے۔ علی متقی کے عرف سے مشہور ہوئے"۔

میر کے دادا اکبر آباد میں فوجداری کے عہدہ پر ممتاز

تھے۔ اور چونکہ خاندانی لحاظ سے سید تھے اس لئے شہر میں کافی عزت تھی۔ میر نے اسی عز و جاہ کی طرف اشارہ کیا ہے:-

پھرتے ہیں میر خوار، کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

میر کے والد نے دنیا کے عوض دین اختیار کیا، گویا دنیوی وجاہت دادا کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

افسوس کہ ۱۱۴۵ھ کے لگ بھگ جبکہ میر کی عمر صرف دس سال کی تھی، اُن کا بھی انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسین نے میر صاحب کے ساتھ بڑی بے مروتی کی اور باپ کے ترکہ میں سے اُن کو ایک پیسہ نہ دیا۔ جب ہوش سنبھالا تو میر صاحب کو اپنی ذلت کا احساس ہوا کہ بھائی کے ٹکڑوں پر پڑا ہوں اور وہ ٹکڑے بھی بڑی ذلت کے ساتھ نصیب ہوتے ہیں۔ یہیں سے اُن کی "الم دوستی" کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسان بعض خصائص ماں کے پیٹ ہی سے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن "ماحول" اور حوادث روزگار کا بھی انسان کی طبیعت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اگر میر صاحب ذکی الحس نہ ہوتے تو شاید بھائی کی جوتیاں کھاتے رہتے لیکن وہ فطرت کی طرف سے ایک زبردست قوتِ احساس لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ترکِ وطن ہی کو بہتر خیال کیا۔ چنانچہ ۱۱۵۰ھ کے قریب دلّی آئے اور ایک دوست کی وساطت سے نواب صمصام الدولہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ میر صاحب چین سے رہتے؟ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ ہندوستان کی صورت پر نازل ہوگیا، نواب موصوف مقابلہ کے لئے نکلے اور میدانِ جنگ میں مارے گئے۔ میر دوسری دفعہ یتیم ہوگئے۔ ابھی باپ کی وفات کا صدمہ دور نہ ہوا تھا کہ فلکِ کجرفتار نے ایک چرکا اور لگا دیا:-

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلّاد نے جاتے جاتے

مجبوراً پھر آگرہ چلے گئے اور چند سال جوں توں کرکے وہاں گزارے۔ غالباً اسی زمانہ میں حضرتِ عشق علیہ الرحمۃ نے اُن کی نوجوانی پر ترس کھا کر انہیں اپنی آغوشِ محبت میں لے لیا ہوگا۔ اسپنوزا ناکام ہو کر فیلسوف ہوگیا تھا میر صاحب اس مرتبہ پر پہنچ کر "شاعر" ہوگئے جب دریاتِ عشق سے فراغت پائی تو جیسا کہ اس فن کے ماہرین کا دستور ہے "تلاشِ معاش کے پردے میں" "دیارِ حبیب" سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور ایسے نکلے کہ پھر جانا نصیب نہ ہوا۔

دوبارہ دلّی آئے اور خانِ آرزو کے یہاں مقیم ہوئے، چند روز گزرے تھے کہ اُن کے بڑے بھائی کو جو شقاوتِ قلبی میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، یہ حال معلوم ہوا، اُس نے خان صاحب کو لکھا کہ عمو لیصاحب! یہ غضب!! آپ کا خون ایسا سفید ہوگیا، میرے سگے بھائی کے ساتھ آپ اس محبت سے پیش آتے ہیں، شاید ست جگ میں ایسا ہوتا ہو کلجگ میں تو یہ طریق عمل سراسر نامناسب ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خانصاحب موصوف بھی میر صاحب کے درپئے آزار ہوگئے اس کج خلقی اور غیر متوقع ایذارسانی نے میر صاحب پر زبردست اثر کیا، مہینوں دیوانوں کی سی حالت رہی۔ سچ ہے جب اپنے پرائے ہوجائیں تو میر جیسے انسان

کو جس قدر صدمہ ہو تھوڑا ہے۔ یہ چوتھا وار تھا۔ ایک تو ویسے ہی فلک کے ستائے ہوئے تھے اور پے در پے یہ مصائب و آلام!!! کوئی تعجب نہیں اگر ایسے حالات ایک ذکی الحس انسان قنوطی (Pessimist) ہو جائے!!! ممکن ہے دنیا میں راحت، عیش، آرام اور خوشی کا وجود ہو لیکن میر کے حصہ میں سوائے رنج و الم اور کلفت و غم کے اور کچھ نہ تھا۔ یہی رنگ اُن کے کلام میں جھلکتا ہے۔ شوپن ہار (جرمن فلاسفر) کو بھی حالات اور حوادث روزگار ہی نے قنوطی بنا دیا تھا۔ اگر اس کی ماں اُس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتی تو وہ کبھی عورتوں سے اس قدر بدظن نہ ہوتا!

بہرکیف، ایک رئیس رعایت خان نامی نے انہیں اپنا مصاحب بنا لیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد کسی بات پر ناراض ہو کر ملازمت ترک کر دی۔ اس کے بعد یعنی سنہ ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا سلسلہ شروع ہوا اُدھر جاٹوں اور مرہٹوں نے تاخت و تاراج شروع کی۔ دلی پر پے در پے آفتیں نازل ہوئیں ہزاروں خاندان برباد ہو گئے۔ میر صاحب نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس دہر فانی کی بے ثباتی کا نقش دل پر جم گیا چنانچہ خانہ نشین ہو گئے لیکن غزلوں کا شہرہ دور و نزدیک پھیل گیا تھا۔ آصف الدولہ والیٔ اودھ نے بڑی قدردانی کے ساتھ طلب کیا اور "اُن کے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔"

لکھنؤ آ کر اگرچہ اُن کے سوز دروں میں کمی نہ ہوئی لیکن ایک حد تک آسودگی ضرور نصیب ہو گئی یعنی فکر معاش جاتی رہی جسے "آسودگی" کہتے ہیں وہ تو بادشاہوں کو بھی بمشکل نصیب ہوتی ہے، میر تو در پردہ چوٹ کھائے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کو تو "نہ خاک بھی خاک آرام ہوگا۔"

"پیری و صد عیب" ایک مشہور بات ہے لیکن جن لوگوں کی جوانی پریشانی میں گزرتی ہے اُن کی "پیری" قابل دید ہوتی ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے اپنی حالت یوں لکھی ہے "اس زمانہ میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے، یاروں کی ملاقات ترک کر دی ہے، بڑھاپا آ پہنچا عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو گی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اُٹھائی، ضعف بصر سے عینک لگائی۔ دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں؟ آخرکار، دل کڑا کر کے، ایک ایک کو جڑ سے اکھڑوا دیا، غرضکہ ضعف قویٰ، بے دماغی، ناتوانی دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہونگا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے بس اس قدر آرزو ہے کہ خاتمہ بالخیر ہو۔"

ان کی وفات سنہ ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔ اُن کا مزار "عیش باغ" لکھنؤ میں زیارت گاہِ خاص و عام تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد "زائرین" کا رُخ سرکاری دفاتر کی طرف پھر گیا، مجبوراً "بی این۔ ڈبلیو۔ آر" نے مزار کو اپنی نگہداشت میں لے لیا نتیجہ یہ ہے کہ آج نشان قبر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔

میر کو نشانِ قبر کے محفوظ رہنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں، صاحبانِ کمال کا مزار تو "سینہ ہائے عارفاں" میں ہوتا ہے۔ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی میر کا نام بھی زندہ رہے گا۔ وہ تو خود ہی فرما گئے ہیں:-

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

یوسف سلیم

دریائے لُطف

مغربی، مشرقی تہذیب میں جو فرق ہے وہ قطعی ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اُس قسم کا ایک لفظ نہیں جو پادری صاحبان کے وعظ کے خاتمے پر یوں شروع ہوتا ہے۔

"ایک آخری لفظ۔ دنیا و مافیہا کی ذمہ داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی بہبودی کے زریں اصول کو نہ ہمارے بزرگوں نے بھلایا ہے نہ ہمیں بھلانا چاہیئے۔" وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک آخری لفظ کبھی صفحوں پر دراز ہوتا ہے۔ سننے والے انگڑائیاں لیتے ہیں کہ خدا کرے کہ اس ایک آخری لفظ کی جان نکلے اور ہم چندہ دے کر گھر کو سدھاریں۔

سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جہاں اور بہت کچھ لکھ گئے ہیں اس ایک لفظ کو بھی استعمال کر گئے ہیں وہ لفظ

لُطف

ہے اور سعدی جیسا ناصح ضد کرتا ہے کہ ؎

لطف کُن لُطف، کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اہلِ چین نے تو اس پر یہاں تک عمل کیا کہ مخاطب کے جوتے کا ذکر کرنا مقصود ہو تو اس سے کم نہ کہتے تھے کہ "آنجناب کا آنریبل بوٹ" اور اپنے گھر کو بدیں الفاظ یاد کرتے تھے کہ اس ذرّہ بے مقدار ہیچ ابن ہیچ کی تنگ شہر جھونپڑی یعنی مخاطب کے جوتے اور بولنے والے کے گھر کا نقشہ غالب مرحوم کے اس شعر میں کھنچتا ہے

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ——— کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کیا جوتا ہوگا کیا گھر ہوگا مگر "لطف" میں شک نہیں۔ یہ لطف اہلِ مغرب کو نصیب نہیں۔

کاغذاتِ مال کی بعض اصطلاحیں نہایت پُرلطف ہیں۔ یورپ والوں کے ہاں کسی جدول کا کوئی خانہ خالی ہو تو اسے بلینک (Blank) لکھ دیتے ہیں۔ اس قدر کمبخت اکھڑ ہیں کہ (Blank) کو (blank) ہی لکھتے ہیں۔ ایشیائی ایسا اکھڑ کیوں ہونے لگا کہ خالی کو خالی لکھے یا کہے چنانچہ کاغذاتِ مال میں اگر کوئی خانہ خالی ہو تو اس میں لفظ "معمور" لکھا جاتا ہے۔ ایسے خانوں کی ہستی نیستی سے آباد ہوتی ہے بلطف ہوا نا کہ خلا کو آباد کر دیا۔ اسی طرح غیر آباد دیہہ کو محض بے مذاقی سے "غیر آباد" نہیں لکھا جاتا بلکہ مقررہ اصطلاح ہے کہ "بے چراغ" لکھا جائے۔ اس "لطف" میں شاعری بھی ہے۔ لاہور کا میلہ چراغاں مشہور ہے۔ ایک شاعر کا مصرعہ

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

زندۂ جاوید ہے اور مرزا غالب کا مصرعہ :۔

"جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے"

تو بجائے خود ایک نہ مٹنے والا ہنگامہ ہے۔ مگر پٹواری کا کسی گاؤں کو "بے چراغ" کہنا اور لکھنا ایشیائی تہذیب "لطف" کا کمال ہے نہ انسان ہوں گے نہ چراغ جلیں گے مگر یہ نہیں کہا کہ گاؤں میں باشندے نہیں۔

اس قسم کے لطف کی کوئی حد نہیں۔ ایشیا میں کبھی کوئی بیمار ہی نہیں ہوتا ہمیشہ دشمنوں کی طبیعت علیل رہتی ہے ہر قسم کے حوادث نصیب اعدا ہوتے ہیں کبھی کسی قسم کا گھاٹا نہیں ہوتا۔ "دل گیا ہاتھ سے لوگوں نے کہا دل آیا"۔

زندگی کے ہر شعبے میں اس لطف کا ظہور ہے! اولاد کو والدین کا سایہ عزیز ہے۔ ماتحت کے لئے افسر "حضور"۔ "خداوند" سے کم نہیں۔ بادشاہ "جہاں پناہ ظل الٰہی" ہے۔ درزی "خلیفہ" ہے۔ حجام "راجہ" ہے بھنگی "مہتر" ہے۔

اس لطف کی داستان طویل ہے ایشیائی زندگی قلیل ہے۔ کاش ہمارے بزرگ اس لطف کے سمندر کے علاوہ کچھ اور بھی چھوڑ جاتے۔ فارسی میں "دریا" سمندر کو کہتے ہیں اور فلک پیما سعدی کے اس شعر پر اس تحریر کو ختم کرتا ہے ؎

بہ دریا در منافع بے شمار است ۔۔۔ دگر خواہی سلامت بر کنار است

فلک پیما

بہارِ بے خزاں

بہار آئی ہے اس رنگیں ادا کو پھر سنورنا ہے ۔۔۔ میرے دعوائے ضبطِ عشق کو مجروح کرنا ہے

الٰہی ہر تمنّائے دروں کا خون ہو جائے! ۔۔۔ کہ تصویرِ وفا میں اور ابھی کچھ رنگ بھرنا ہے

یہ کلیاں جن کی رعنائی ہے وجہِ زینتِ گلشن ۔۔۔ انہیں اک روز اجزائے خزاں بن کر بکھرنا ہے

سنبھلنے دے مجھے اے گریۂ احساسِ آزادی

قفس میں بند رہ کر گلستاں تعمیر کرنا ہے

محمد جمیل خاں راز

عمر خیّام

کیونکر

مرتے مرتے بچا

حکیم عمر خیّام کے نام کا ڈنکا آج مشرق و مغرب میں بج رہا ہے۔ اگرچہ مشرق کی بوالعجبی کا یہ عالم ہے کہ اب اکثر یہ مغرب ہی کے توسط سے اپنے اکابر کو پہچانتا ہے۔ اگر رباعیاتِ خیّام اتفاق سے مغرب میں نہ جا پہنچتیں اور وہاں بھی ایک ہنر شناس کی نظر چڑھ کر ان کی قدر نہ کھلتی تو کوئی اس گنجینۂ معنی کو کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہ پوچھتا۔ ایک مغربی ادیب نے اس اجمال کی تفصیل حوالۂ قلم کی ہے اور یہ مضمون اُسی کا مفاد ہے۔ بلا شبہ اگر فٹز جیرلڈ رباعیاتِ خیّام کا ترجمہ نہ کرتا تو شاید دنیا خیّام کی حقیقی عظمت سے اُتنی بھی نہ ہوتی۔ آج مغرب میں خیّام کی رباعیات کے بیسیوں مطلا اور مذہب نسخے شائع ہو چکے ہیں اور مصوّروں نے ان رباعیات کی تصویریں کھینچ کھینچ کر بجائے خود ایک بوقلموں نگار خانہ پیدا کر دیا ہے۔ یقیناً فٹز جیرلڈ کو اپنی محنت کی قیمت رباعیات کی اس آفاق گیر مقبولیت کی صورت میں وصول ہو گئی ہے۔

ایڈورڈ فٹز جیرلڈ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک متمول زمیندار تھا جس کی میراث نے اُس کو اپنی افتادِ طبیعت کے مناسب بافراغت زندگی گزارنے کے قابل بنا دیا۔ فٹز جیرلڈ نے گاؤں کے کُنجِ عافیت کو شہر کی پُر شور و شغب فضا پر ترجیح دی اور اپنے تخیلات میں گم راہبانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی خوراک صرف سبزی ترکاری تھی۔ گویا اپنے دوست ٹینی سن کے الفاظ میں وہ دودھ گندم اور گھاس پر گزارا کرتا تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جو تقریباً سب کی سب طاق نسیاں کی زینت ہو چکی ہیں۔ ہاں نظم کی ایک کتاب ضرور مستثنےٰ ہے اور اُسی نے فٹز جیرلڈ کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اُس نے چوالیس سال کی عمر میں ایران کے شاعر اور حکیم عمر خیّام کی رباعیات کے ترجمے کا کام شروع کیا۔ خیام خود بھی فٹز جیرلڈ ہی کی طرح زندگی کے گلستان زاروں کا ایک بےفکرا تماشائی تھا۔ سالہا سال کی محنت کے بعد فٹز جیرلڈ نے اپنا مسودہ "فورٹ نائٹلی ریویو" کے ایڈیٹر کے سپرد کیا لیکن ایڈیٹر صاحب نے سال بھر یہ مسودہ اپنے پاس رکھ کر آخر مترجم کو واپس بھیج دیا کہ یہ ہمارے معیارِ ادب کے مطابق نہیں ہے۔ ناچار فٹز جیرلڈ نے خود اس کو چھپوایا لیکن چونکہ اُسے اس کا کوئی بھی گاہک نہ مل سکا اس لئے اُس نے تمام جلدیں ایک کتب فروش "برنارڈ کوارِش" کو ہدیتہً دے دیں۔ کتب فروش نے پہلے تو کتاب کی قیمت پانچ شلنگ سے نصف کرا دی اور اُس کے بعد ایک شلنگ اور آخر دکان سے باہر ہاٹ لگا کر ایک ایک پینی میں فروخت کرنی شروع کر دی۔ قسمت کا کھیل دیکھئے کہ رباعیات کا ایک نسخہ اتفاقاً

روزیٹی نے بھی خریدا۔ چند اوراق اُلٹ کر دیکھتے ہی وہ اِس کا اتنا مداح ہوگیا کہ اُس نے اپنے تمام دوستوں کو اس کے خریدنے کے لئے دوڑایا۔ سون برن نے چار جلدیں حاصل کیں اور یوں اس کتاب کی مانگ شروع ہوگئی۔ اب تو یہ خیال بھی عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اگر روزیٹی کی جوہر شناس نظر اتفاقاً اس پر نہ جا پڑتی تو انگریزی شاعری کے خزانے کا ایک گوہر بے بدل ہمیشہ کے لئے کھو جاتا۔

اس چھوٹی سی کتاب میں اس کے غیر معمولی شعری حسن کے علاوہ دو اور خصوصیات ہیں جنہوں نے اس کو اس درجہ مقبولِ انام بنا دیا ہے ان میں سے ایک تو اِس کا محبوبِ عام فلسفۂ زندگی ہے۔ جسے ہم ہیرک کے گیت سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں:۔

پھول کچھ چن لو کہ پل میں بیت جاتی ہے بہار

یا نظیر اکبرآبادی کے ان الفاظ سے کہ:۔

زندگی دو دن کی ہے اے جان ہنس لے، بول لے ‏ ‏ ‏ حُسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے، بول لے

اور دوسری خصوصیت اِس کے مشرقی نظاروں کا گہرا اور شوخ آبی رنگ ہے! اُس وقت سے لے کر جب صبح سلطان کے قصر کے کنگروں کو نور کی ایک چھڑی سے چھونے کے لئے آتی ہے اُس وقت تک جب ساحرِ شفق چاروں کھونٹ اپنے حیرت زا حُسن کا افسوں پھونکنے لگتا ہے اور چاند کا عظیم الہیئت قرص اُن شمیم انگیز گلستانوں پر بالکل قریب ہی معلق نظر آتا ہے جہاں مہمان گلاب کے ہار پہنے، بادۂ گلرنگ کے جام ہاتھوں میں لئے گھاس کے سبز فرش پر بیٹھے بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح معلوم ہوتے ہیں آنکھیں ایک حیرت ناک جنّت کے پُراسرار خواب دیکھتی رہتی ہیں۔

ٹینی سن نے موسیقی حسنِ ادا اور رنگینی کے اعتبار سے اس کو دنیا کا بہترین ترجمہ قرار دیا تھا۔ یہاں میں چند اشعار انگریزی سے اردو میں منتقل کئے دیتا ہوں جو ٹینی سن کو بھی تمام بالغ نظر سخن شناسوں کی طرح خاص طور پر محبوب تھے۔

آ، تو بھی مئے ارغواں سے اپنا ساغر لبالب بھر لے۔
اور جامۂ توبہ کو تار تار کر کے بہار کی شعلہ بار منقل میں جھونک دے۔
طائرِ وقت کو تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنا ہے۔
اور دیکھ اُس کی پرواز شروع بھی ہو چکی ہے۔

سایہ دار درخت ہو اور گیتوں کی ایک کتاب،
اور مینا ئے مے، اور روٹی کا ایک ٹکڑا ـــــــ اور تو
میرے پہلو میں بیٹھی جنگل کی فضا کو اپنے نغموں سے معمور کر رہی ہو۔

آہ پھر جنگل جنگل کہاں رہے، جنت ہو جائے"

لوگ کہتے ہیں، جہاں جمشید کے نغمے قلقلِ مینا سے ہم آہنگ رہتے تھے۔
وہاں اب چھپکلیاں اور لگڑ بگڑ دربار لگاتے ہیں۔
اور جنگلی گدھے بہرام جیسے عظیم الشان شکاری کے سر پر دولتیاں چلاتے ہیں۔
لیکن وہ اِس قیامت کی نیند سویا ہے کہ پہلو بھی نہیں بدلتا

ہائے ہائے! بہار بھی پھول کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے۔
اور صحیفۂ شباب کا آخری مشکبار ورق بھی الٹ جاتا ہے۔
ابھی جو بلبل ڈال ڈال پات پات چہکتا ہوا نظر آتا تھا۔
وہ کدھر اڑ کر چلا گیا۔ اور وہ کہاں سے آیا تھا ———— کون بتائے؟

آہ اے میرے محبوب اگر تو اور میں تقدیر سے مل کر سازش کر سکتے۔
اور اِس المناک صورتِ حالات پر قابو پا لیتے۔
تو اے میرے پیارے ہم کس طرح اِس کے پرخچے اڑاتے
اور پھر حسبِ منشا اِسے اپنی آرزوؤں کے قالب میں ڈھال لیتے۔

شعر کا یہ گنجِ شایگاں ضائع ہوتے ہوتے بچا۔ اہلِ مغرب کا دل اب اِس امکان کے شائبے سے بھی لرز جاتا ہے اور مشرق تو شاید اب بھی خیّام کی حقیقی منزلت سے ناواقف ہے۔ کوئی کیا کہے؟

حامد علی خاں

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا	موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا	مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

مئے دو آتشہ

حکیم عمر خیام

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور، یا با صنمے سادہ رخ خنداں خور
بسیار مخور، ورد مکن، فاش مساز، اندک خور و گہ گاہ خور و پنہاں خور

ترجمہ

جب بادہ پیو، با صنم چیدہ پیو، یا ہمرہِ دوستانِ سنجیدہ پیو،
ایسا نہ ہو، یہ مشغلہ رسوا ہو جائے، کم کم پیو، گہہ گہہ پیو، پوشیدہ پیو،

حکیم عمر خیام

اے آنکہ پدید گشتم از قدرتِ تو، پروردہ شدم بہ ناز از نعمتِ تو
صد سال بہ امتحاں گنہ خواہم کرد، یا جرمِ من ست بیش یا رحمتِ تو

ترجمہ

اے میری بقا کا راز قدرت تیری، اے میرے لئے ہر ایک نعمت تیری
سو سال گناہ کر کے یہ دیکھوں گا، عصیاں ہیں مرے سوا کہ رحمت تیری

حکیم عمر خیام

تا باز شناختم من ایں پائے ز دست، ایں چرخ فرومایہ مرادست بہ بست
افسوس! کہ در حساب خواہند نہاد، عمرے کہ مرا بے مئے و معشوق گزشت

ترجمہ

انصاف کرو، قضا سے کس طرح پٹے، جب تک یہ ستمگر اپنی ضد سے نہ ہٹے
کیا ظلم نہیں، حساب میں داخل ہو، وہ عمر کہ جو بے مئے و معشوق کٹے

حکیم عمر خیام

سر دفترِ عالمِ معانی عِشق ست، سر بیتِ قصیدۂ جوانی عِشق ست
اے آنکہ خبر نہ داری از عالمِ عشق، ایں نکتہ بداں کہ زندگانی عِشق ست

ترجمہ

سر دفترِ عالمِ معانی ہے تو عِشق، سر بیتِ قصیدۂ جوانی ہے تو عِشق
اے عالمِ رازِ عشق سے ناواقف! یہ نکتہ سمجھ کہ زندگانی ہے تو عِشق

آزاد انصاری

شعرائے اردو کا ایک قدیم تذکرہ

میرے محترم عنایت فرما جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی کے قیمتی ذخیرۂ کتب میں اردو شاعروں کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ اس کے شروع اور آخر کے چند ورق غائب ہیں اس لئے کتاب اور مصنف دونوں کا نام معلوم نہیں ہو سکتا۔ میر تقی میر کے ذکر میں مصنف لکھتا ہے "تا حالتِ تحریر این گلشن سخن کہ سن یک ہزار دیک صد و نود و چہار ہجریست بسلامت استقامت دارد" اس عبارت سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس تذکرے کا نام "گلشن سخن" ہے لیکن سیاقِ عبارت سے یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے اس نظر سے کہ یہ کتاب منتخب اشعار کا مجموعہ بھی ہے اس کو استعارہ کے طور پر گلشنِ سخن قرار دیا ہو۔

مصنف کا جو جملہ اوپر نقل کیا گیا ہے وہ بتاتا ہے کہ یہ تذکرہ سنہ ۱۱۹۴ھ میں لکھا گیا۔ اس کے علاوہ سنِ تالیف کا ذکر اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے مثلاً :-

"الحال کہ سنہ ۱۱۹۴ھ است در زمرۂ متوسلان نواب مبارک الدولہ بہ پریشانی بسر می بُرد" (حال ہیبت قلی خان میر محمد حیات حسرت)

"تاحال کہ سنہ ۱۱۹۴ ہجری نبولیت در قیدِ حیات است" (حال مرزا جعفر علی حسرت)

"تا این زمان کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری است گوشۂ انزوا اختیار نمودہ بہرہ یاب فیوضات نامتناہی الٰہی است" (حال خواجہ میر دردؔ)

"الحال کہ سنہ ۱۱۹۴ ہجری یک ہزار و یک صد و نود و چہار است در عظیم آباد بوارستگی تمام بلا تعین مکان زندگانی میکند" (حال میر ہمزہ علی رندؔ)

"تاحال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری ست در لکھنؤ استقامت دارد" (حال مرزا سوداؔ)

"تا این زمان کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری ست در لکھنؤ می گزراند" (حال میر سوزؔ)

"تا این زمان کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجریست در بلدہ مذکور (عظیم آباد) بشغل وجد و حال اکثر می باشد" (حال شاہ رکن الدین عشقؔ مشہور بشاہ گھسیٹا)

پوری کتاب میں جہاں کہیں مولف نے دورانِ تالیف کے کسی واقعے کا زمانہ بتایا ہے وہاں ہمیشہ سنہ ۱۱۹۴ھ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ اسی سن میں شروع ہوا اور اسی میں ختم ہوا۔

اردو شعرا کے جتنے تذکروں کا حال اب تک معلوم ہو چکا ہے ان میں سے کوئی سنہ ۱۱۹۴ھ کا تصنیف کیا ہوا نہیں ہے جو تذکرہ اس سنہ سے

قریب ترین زمانے میں لکھا گیا وہ نواب علی ابراہیم خاں کا تذکرہ گلزار ابراہیم ہے جس کی تصنیف کا سال ۱۱۹۶ھ ہے۔

مصنفِ تذکرہ کا نام تو خیر معلوم ہی نہیں اُن کے وطن کے متعلق بھی کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ ذیل کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا قیام دہلی میں رہا تھا:۔

"ذاکر شمس میر حسین دوست ابن میر علی دوست متوطن مراد آباد سنبھل چند سال در شاہجہان آباد دیر مسطور مدرسِ خسرو پور ہائے راقم مرزا محمد رفیع خان و بدیع الزماں خاں بود"۔

"رسوا نامش مہتاب رائے ۔ ۔ ۔ ۔ راقم ویرا بارہا ۔ ۔ ۔ ۔ در دہلی دید"۔

"میر عبدالحی تاباں دہلوی ۔ ۔ ۔ میر مسطور را فقیر ہم در عہد محمد شاہ مغفور دیدہ بود"

اسی طرح عبارتِ ذیل بتاتی ہے کہ مصنف کا کچھ وقت مرشد آباد میں گزرا تھا:۔

"صانع بلگرامی ۔ ۔ ۔ ۔ از آشنایان ایں راقم آثم است در مرشد آباد زمان ثروت نواب میر محمد جعفر خان اکثر باتفاق ہم غزلہا طرح می شد"

ذیل کی عبارت میں "از دہلی بہ مرشد آباد آمد" کے فقرے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مصنفِ تذکرہ یہ عبارت لکھتے وقت مرشد آباد میں موجود تھا۔

"دردمند شمس فقیہ ۔ ۔ ۔ حسب الطلب نواب شہامت جنگ از دہلی بہ مرشد آباد آمد"

اسی طرح عبارتِ ذیل میں "بہ عظیم آباد آمدہ" کا فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت مصنفِ تذکرہ کا قیام عظیم آباد میں تھا:۔

"میر شاہ علی خاں دہلوی ۔ ۔ ۔ در عہد نواب سراج الدولہ بہ بنگالہ رسید ۔ ۔ ۔ ۔ بزمانہ دولتِ نواب عالیجاہ میر محمد قاسم خان بہ عظیم آباد آمدہ چندے ملازم نواب بودہ بدکھن رفت"۔

جو عبارتیں اوپر نقل کی گئی ہیں اُن سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مصنفِ تذکرہ کے دو سالے مرزا محمد رفیع خاں اور بدیع الزماں خاں دہلی میں ہی تھے اور اُن کو میر حسین دوست ذاکر سنبھلی نے کئی سال پڑھایا تھا۔ اور یہ بھی کہ مصنف سے صانع بلگرامی سے دوستی اور مہتاب رائے رسوا دہلوی سے ملاقات تھی۔ مصنف نے اپنے دوستوں اور شناساؤں کا ذکر اور بھی کئی جگہ کیا ہے متعلقہ عبارتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

"راقم حروف نے (سید انشا) را در صغرسن ہنگام دولتِ نواب میر محمد جعفر خان بہادر دیدہ بود و بوالد ایشاں آشنا بود۔ در نیولا مسموع شد کہ مرد مستعد و بحلیۂ خوبی ہا مزین است"۔

"سلسلۂ نسبِ ایشاں (مرزا عباس علی) بہ نواب علی مردان خان مغفور می رسد با راقم خانِ مذکور دوستی و مہربانی مفرط داشت"۔

"ندوی دہلوی نامش مرزا محمد علی مشہور بہ مرزا بھچو ۔ ۔ ۔ ۔ ذہنش در ریختہ گوئی رسا و با راقم آشنا"۔

"میر غلام علی آذر دہلوی شاگرد میر شمس الدین فقیر بودہ شعر فارسی خوب می گفت و با فقیر ہم دوستی داشت"۔

خانِ موصوف (نواب بہادر رستم علی خاں رستم) مع برادر خُرد رفیق نواب والاشان سعادت علی خان بہادر اند در بنارس

رحلِ اقامت انداختہ اند، راقم را یک مرتبہ اتفاقِ ملاقات ہر دو صاحبان شدہ۔"

"تفیرِ احوالِ ایشاں رمحمد روشن جوشش مفصل از بھگونت رائے خلف جسونت رائے کہ فی مابین خصوصیتہا و دوستی ہاست معلوم نمود۔"

مصنف تذکرہ مذہبًا شیعہ تھا جیسا کہ ذیل کی عبارت سے ظاہر ہے جو مرزا جانِ جاناں مظہرؔ کے متعلق لکھی گئی ہے:-

"تعصبِ مذہب سنت جماعت بدیں حد جاں گاہ در دلش نمودہ بود کہ مردم را منع از تعزیۂ سید الشہدا علیہ السلام می کرد۔ صد سال عمر یافت و در ہمیں ضلالت بسر برد۔ قبل ازیں مسموع شد کہ یکے از ساکنانِ دہلی وبراکشت دلبنرائے کہ وارش رسانید۔"

مرزا مظہرؔ کا ذکر جن لفظوں میں کیا گیا ہے اُن سے مصنف تذکرہ کا متعصب شیعہ ہونا ظاہر ہوتا ہے لیکن حقیقت شاید اس کے خلاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مرزا مظہرؔ سے بیزاری صرف اس بنا پر تھی کہ وہ تعزیہ داری کی مخالفت کرتے تھے اور یہ بات ایسی ہے جس کو ہر شیعہ انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے میرے اِس خیال کی تائید اُس عبارت سے ہوتی ہے جس میں مصنف نے ایک دوسرے اہلِ سنت صوفی بزرگ یعنی خواجہ میر دردؔ کی خوب دل کھول کر عقیدتمندانہ انداز میں تعریف کی ہے۔ وہ عبارت حسب ذیل ہے:-

"خواجہ میر دردؔ خلف الصدق خواجہ ناصر دہلوی ست۔ مرکز دائرۂ اہلِ کمال، سخن سنج، نکتہ رس، شیریں مقال، قطع نظر از مہارتِ فنونِ سخن کہ در مرتبۂ آن والا مقام است در خدا پرستی و تحمل مصائب و تسلیم نوائب نظیر خود ندارد۔ سید عالی منزلت، مقیم گوشۂ عزلت، رہرو شہرستان تفرید، و سائر کوچہ تجرید، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در شاہجہاں آباد تا ایں زماں کہ سن یک ہزار و یک صد و نود و چار ہجری است گوشۂ انزوا اختیار نمودہ بہرہ یاب فیوضات نامتناہی الٰہی است۔"

مصنف تذکرہ نے میر تقی میرؔ کے تذکرہ شعرا کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔ "تذکرۂ مختصرے مشتمل بر احوال و انتخاب اشعار ریختہ گویاں تالیف نمودہ" ایک دوسری جگہ جنونؔ دہلوی کے اشعار نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے "ایں ابیات کہ از تذکرۂ میر محمد تقی میرؔ نقل نمود بہ تحریر می آرد" اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے میرؔ کا تذکرہ دیکھا تھا اور وہ اس تذکرے کی تصنیف کے وقت اُس کے پیشِ نظر تھا کسی اور تذکرے کا ذکر کہیں نہیں ہے البتہ مرزا سوداؔ کے شاگرد میر فخر الدین فخرؔ کے والد اشرف علی خاں کو "تذکرہ نویس" لکھا ہے مگر معلوم نہیں کہ یہاں تذکرے سے تذکرۂ شعرا مقصود ہے یا کچھ اور

عام تذکروں کی طرح اس میں بھی صرف غزل گو شعرا کا حال ہے۔ غزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن جن میں شعرا نے طبع آزمائی کی ہے اُن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ جعفر علی خاں ذکیؔ اور میر غلام حسین شورشؔ کی مثنویوں، مرزا جعفر علی حسرتؔ، سوداؔ اور شورشؔ کے قصیدوں میر سوز مظلوم، میر محمد علی صبرؔ اور خلیفہ سکندر کے مرثیوں، حمایت علی مجنوںؔ اور بقیہ دردمند کے ساقی ناموں کا ذکر ضمناً آ گیا ہے اور فدویؔ لاہوری کے متعلق لکھا ہے "گویند یوسف زلیخا بزبانِ ریختہ نظم کردہ" بڑی بات یہ ہے کہ تین شاعروں کی نظم کے ساتھ اُن کی نثر کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ میر حبیب اللہ علی تسلیؔ کے متعلق لکھا ہے کہ "در نثر سلیقہ دارد" معلوم نہیں کہ وہ فارسی نثر لکھتے تھے یا اردو۔

اسی طرح محمد روشن جوشش کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ "در نظم و نثر صاحبِ استعداد" البتہ محمد علی حشمت کی اردو نثر نگاری کی صراحت ان لفظوں میں کردی ہے۔ "در انشائے ریختہ سلیقہ نیکو داشت و تاباں در ایں فن بہرہ وافی ازو برداشت"۔ آخری جملے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر عبدالحی تاباں نے حشمت سے اردو انشا پردازی سیکھی تھی۔

مصنف تذکرہ نے میر سعادت علی سعادت کے متعلق لکھا ہے "وطنش امروہہ مرید شاہ ولایت اللہ، مداح ائمہ ہدا است و در شعر ریختہ طرز ایہام اکثری ورزد"۔ عجب نہیں کہ یہ وہی میر سعادت علی امروہوی ہوں جنھوں نے میر تقی میر کو اردو میں شعر کہنے کی ترغیب دی تھی اور جن کا ذکر میر نے اپنی کتاب ذکرِ میر میں اس طرح کیا ہے :-

"بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امروہہ بود برخوردیم۔ آں عزیز مرا تکلیفِ موزوں کردنِ ریختہ کہ شعریست بہ طور شعر فارسی بزبان اردوے معلیٰ بادشاہ ہندوستان و در آں وقت رواج داشت کرد۔ چندے بلیغ کردم مشق خود بہ مرتبۂ رسانم کہ موزونانِ شہر را مستند شدم۔ شعرِ من در تمام شہر دوید و بگوش خرد و بزرگ رسید" (ذکر میر مطبوعہ ص۶۶)

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ زیرِ نظر نسخہ ناقص ہے۔ شروع میں حرفِ الف سے شروع ہونے والے تخلص کے کچھ شعرا اور آخر میں حرف م سے شروع ہونے والے کچھ اور ن، و، ہ اور ی سے شروع ہونے والے کل شعرا کا حال غائب ہے۔ اس سے مصنفِ تذکرہ کے متعلق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شاعر تھا اور غالباً تھا، تو اس کا تخلص الف، م، ن، و، ہ یا ی سے شروع ہوتا ہوگا۔ اگر کسی اور حرف سے شروع ہوتا تو اُس کا ذکر اس موجودہ نسخے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتا۔

زیرِ بحث تذکرے کے اس نامکمل نسخے میں ۳۰۸ صفحے ہیں۔ ہر صفحے میں ۱۱ سطریں ہیں اور دو سو نو (۲۰۹) شاعروں کا نہایت مختصر حال اور اُن کے کلام کا انتخاب ہے۔ ان شاعروں کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

اصل تذکرے میں شعرا کے تخلص حروفِ تہجی کے اعتبار سے درج کئے گئے ہیں مگر ان کی ترتیب میں صرف ابتدائی حرف کا اعتبار کیا گیا ہے۔ ذیل کی فہرست میں سب حرفوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس طرح ہر تخلص کی ایک مخصوص جگہ معین ہوگئی ہے جن شاعروں کے تخلص معلوم نہیں صرف نام معلوم ہیں اُن کے نام گو نام ہی کے خانے میں لکھے گئے ہیں مگر ان کی ترتیب تخلصوں کے سلسلے میں رکھی گئی ہے

شمار	تخلص	نام	شمار	تخلص	نام	شمار	تخلص	نام	شمار	تخلص	نام
۱	اثر	•	۵	احسن	مرزا احسن علی	۹	آشنا	•	۱۳	الہام	شیخ شرف الدین
۲	اجمل	محمد اجمل	۶	احمدی	شیخ احمد	۱۰	اظہر	میر غلام علی	۱۴	انشا	انشاء اللہ خان
۳	•	(خواجہ) احتشام حسین	۷	•	اسدیار خان	۱۱	افسوس	میر شیر علی	۱۵	انصاف	محمد یحییٰ
۴	احسان	میر شمس الدین	۸	آشفتہ	مرزا رضا قلی	۱۲	الم	خلف خواجہ میر درد	۱۶	اولیا	میر اولیا

نمبر	تخلص	نام	نمبر	تخلص	نام	نمبر	تخلص	نام	نمبر	تخلص	نام
۱۷	آہ	میر مہدی	۴۲	تمنا	مرزا علی رضا	۶۷	حسن	خواجہ حسن	۹۲	دوست	غلام محمد
۱۸	بسمل		۴۳	ثابت	اصالت خان	۶۸	حسن	میر غلام حسن	۹۳	دیوانہ	سرب سنگھ
۱۹	بسمل	میر جبار علی	۴۴	ثاقب	شجاعت اللہ خان	۶۹	حشمت	سید محتشم علی خان	۹۴	ذاکر	میر حسین دوست
۲۰	بقا	بقاء اللہ	۴۵	ثاقب	شہاب الدین	۷۰	حشمت	محمد علی	۹۵	ذہین	میر مستعد
۲۱	•	بہاری لال	۴۶	جرأت	میر شیر علی	۷۱	حضور	•	۹۶	راغب	محمد جعفر خان
۲۲	بہار	ٹیک چند	۴۷	جرأت	یحییٰ اماں	۷۲	حضور	شیخ غلام یحییٰ	۹۷	راقم	بندرابن
۲۳	بیان	احسن اللہ	۴۸	جگن	•	۷۳	حیدری	غلام حیدر	۹۸	رخشاں	محمد چاند
۲۴	بیتاب	سنتوکھ رائے	۴۹	جنون	•	۷۴	حیدری	شیخ غلام علی	۹۹	رخصت	میر قدرت اللہ
۲۵	بیتاب	محمد علیم	۵۰	جنون	شیخ غلام مرتضیٰ	۷۵	حیران	میر حیدر علی	۱۰۰	رسائی	•
۲۶	بیتاب	میر مدن بہادر	۵۱	جوان	کاظم علی	۷۶	حیران	میر منو	۱۰۱	رستم	رستم علی خان
۲۷	بیدار	میر محمدی	۵۲	جودت	رائے ہرنے رام	۷۷	حیف	موتی لال	۱۰۲	رسوا	مہتاب رائے
۲۸	بیکل	سید عبدالوہاب	۵۳	جوشش	محمد روشن	۷۸	خادم	خادم حسین	۱۰۳	رشید	•
۲۹	بینوا	•	۵۴	جولاں	میر رمضان علی	۷۹	خاکسار	محمد یار	۱۰۴	رضا	میر محمد رضا
۳۰	پاکباز	میر صلاح الدین	۵۵	جوہر	مرزا احمد علی	۸۰	خاکسار	میر سبحان علی	۱۰۵	رضا	•
۳۱	پاکباز	شاہ مکھو	۵۶	جوہری	مولوی آیت اللہ	۸۱	خلیق	مرزا ظہور علی	۱۰۶	رفعت	شیخ محمد رفیع
۳۲	پروانہ	سید پروانہ علی	۵۷	جہاندار	مرزا جوان بخت جہاندار شاہ	۸۲	خوب	میر مظہر علی	۱۰۷	رند	مہربان خان
۳۳	پروانہ	راجہ جسونت سنگھ	۵۸	حاتم	شیخ محمد حاتم	۸۳	خیالی	راجہ خیالی رام	۱۰۸	رند	میر حمزہ (؟) علی
۳۴	پیام	شرف الدین علی خان	۵۹	حامد	میر حامد	۸۴	دانا	شیخ فضل علی	۱۰۹	رنگین	•
۳۵	تاباں	میر عبدالحی	۶۰	•	حبیب اللہ	۸۵	داؤد	داؤد بیگ	۱۱۰	زار	مغل بیگ
۳۶	تائید	خواجہ محمد علی	۶۱	حزیں	میر محمد باقر	۸۶	درخشاں	منکو بیگ	۱۱۱	زار	میر مظہر علی
۳۷	تجرد	میر عبداللہ	۶۲	حسرت	جعفر علی	۸۷	درد	خواجہ میر درد	۱۱۲	زکی	جعفر علی خان
۳۸	تصویر	شاہ جواد علی	۶۳	حسرت	رحمت اللہ	۸۸	درد	کرم اللہ خاں	۱۱۳	ساقی	میر حسین علی
۳۹	تقی	میر تقی معروف میر گھاسی	۶۴	حسرت	میر محمد حیات	۸۹	دردمند	فقیہہ	۱۱۴	سجاد	میر سجاد
۴۰	تمکین	صلاح الدین	۶۵	حسرت	مراد علی	۹۰	دل	شیخ محمد	۱۱۵	سراج	میر سراج الدین
۴۱	تمنا		۶۶	حسن	میر محمد حسن	۹۱	دل	محمد عابد	۱۱۶	ثروت ؟	مفتی غلام مخدوم

نمبر	تخلص	نام
۱۱۷	سعادت	میر سعادت اللہ
۱۱۸	سعادت	میر سعادت علی
۱۱۹	سکندر	•
۱۲۰	سلام	نجم الدین علی خان
۱۲۱	سلیمان	•
۱۲۲	سلیمان	سلیمان خان
۱۲۳	سلیم	میر محمد
۱۲۴	سودا	مرزا محمد رفیع
۱۲۵	سوز	میر سید محمد
۱۲۶	سوزاں	احمد علی خان
۱۲۷	سید	میر امام الدین
۱۲۸	سید	میر یاد علی
۱۲۹	شاداب	لالہ خوشوقت رائے
۱۳۰	شاعر	میر کلو
۱۳۱	شاقی	امین الدین
۱۳۲	شاکر	محمد شاکر
۱۳۳	•	میر شاہ علی خان
۱۳۴	شاہی	شاہ قلی خان
۱۳۵	شفا	حکیم یار علی
۱۳۶	شفیع	میر محمد شفیع
۱۳۷	شورش	میر غلام حسین
۱۳۸	شوق	میر حسن علی
۱۳۹	شہرت	مرزا محمد علی
۱۴۰	شہید	مولوی غلام حسین
۱۴۱	شیدا	میر فتح علی
۱۴۲	صادق	میر جعفر خان
۱۴۳	صانع	•
۱۴۴	صبر	میر محمد علی
۱۴۵	صفدری	•
۱۴۶	•	صمصام الدولہ
۱۴۷	صنعت	مغل خان
۱۴۸	ضاحک	میر غلام حسین
۱۴۹	ضیا	میر ضیاء الدین
۱۵۰	ضیا	مرزا ضیا بیگ
۱۵۱	طالع	میر شمس الدین
۱۵۲	طپش	•
۱۵۳	طرز	گردھاری لال
۱۵۴	ظاہر	خواجہ محمد خان
۱۵۵	ظہور	میر محمد باقر
۱۵۶	ظہور	رتنو سنگھ
۱۵۷	عاجز	عارف علی خان
۱۵۸	عارف	محمد عارف
۱۵۹	•	مرزا عباس علی
۱۶۰	عاشق	میر برہان الدین
۱۶۱	عاشق	علی اعظم خان
۱۶۲	عاشق	میر جی مخاطب بہ عاشق علی خان
۱۶۳	عاصی	نور محمد
۱۶۴	عزلت	عبد الوالی
۱۶۵	عزیز	بکھاری داس
۱۶۶	عشق	شاہ رکن الدین
۱۶۷	عشقی	سید ابو الحسن تانا شاہ
۱۶۸	عطا	محمد عطا
۱۶۹	عظیم	محمد عظیم
۱۷۰	عمدہ	سیتا رام
۱۷۱	عمر	معتبر خاں
۱۷۲	عیش	مرزا محمد عسکری
۱۷۳	غالب	نواب اسد اللہ خاں سید الملک
۱۷۴	غریب	میر تقی
۱۷۵	غواص	•
۱۷۶	فارغ	•
۱۷۷	فخر	میر فخر الدین
۱۷۸	فدا	سید امام الدین
۱۷۹	فدوی	•
۱۸۰	فدوی	مرزا محمد علی تھہور بہ مرزا بھجو
۱۸۱	فراق	مرتضیٰ قلی خان
۱۸۲	فرحت	فرحت اللہ
۱۸۳	فرخ	فرخ علی
۱۸۴	فرصت	مرزا الف بیگ
۱۸۵	فروغ	میر علی اکبر
۱۸۶	فریاد	صاحب رائے
۱۸۷	فضل	شاہ فضل علی
۱۸۸	فغاں	اشرف علی خاں
۱۸۹	فقیر	میر شمس الدین
۱۹۰	فیض	میر فیض علی
۱۹۱	قائم	شیخ محمد قائم
۱۹۲	قدر	محمد قدر
۱۹۳	قدرت	شاہ قدرت اللہ
۱۹۴	قربان	میر جیون
۱۹۵	قریں	شیخ برکت اللہ
۱۹۶	قلندر	غلام قلندر
۱۹۷	قاندر	لالہ بدھ سنگھ
۱۹۸	قناعت	مرزا محمد بیگ
۱۹۹	کافر	میر علی نقی
۲۰۰	کاکل	شاہ کاکل
۲۰۱	کلیم	شیخ محمد حسین
۲۰۲	گرفتار	•
۲۰۳	گریاں	میر علی امجد
۲۰۴	گماں	نظر علی خان
۲۰۵	لسان	میر کلیم اللہ
۲۰۶	لطفی	•
۲۰۷	مجنوں	میر حمایت علی
۲۰۸	مظہر	مرزا جان جاناں
۲۰۹	میر	میر محمد تقی

سید مسعود حسن رضوی

نوٹ: اگر کسی صاحب کے علم میں اس تذکرے کا کوئی مکمل نسخہ کہیں موجود ہو تو براہ کرم سید صاحب کو براہ راست یا "ہمایوں" کی معرفت جلد از جلد مطلع فرمائیں۔ "مدیر ہمایوں"

فرصت

اگر فکرِ معیشت سے نہ ہو دم بھر کو بھی فرصت
تو ایسی زندگانی میں کہاں گنجائشِ راحت
نہ ہو فرصت کبھی بیٹھیں گھنے جنگل کے سایوں میں
جہاں چرتی ہیں دن بھر گائیں، بھینسیں، بکریاں، بھیڑیں
نہ ہو فرصت کہ اک جنگل کا رہرو بھید یہ پائے
کہ ننھے پھل گلہری گھاس میں رکھ کر کہاں جائے
نہ ہو فرصت کہ دیکھیں دن کو اُن چشموں کے نظارے
شعاعیں منعکس جن میں ہیں، جیسے رات کو تارے
نہ ہو فرصت نگاہِ حسن کی دیکھے کوئی شوخی،
ہے رقصِ جانفزا میں جس کے مستی خُلد کی مے کی
نہ ہو فرصت کہ دیکھیں وہ تبسّم ہونٹ پر آتا،
کیا جو چشمِ مے گونِ صنم نے بارہا پیدا
عجب کیا ہے جو ایسی زندگانی غم سراپا ہو!
سرورِ زندگی کا ذکر ایسے میں بھلا کیا ہو!

(ماخوذ از انگریزی)

شمیم ازدیناگر

جادوگر

شہر میں سخت بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ہڑتال پر ہڑتال ہو رہی تھی۔

یہ فتنہ کارخانوں سے شروع ہوا اور آہستہ آہستہ آگ کی طرح شہر کے ہر گوشہ میں پھیل گیا۔

اس شورش کو فرو کرنے کے لیے پولیس ہر ممکن کوشش عمل میں لائی۔ مگر بے سود! یہ شورش مٹنے والی نہ تھی۔

شہر اگرچہ پہلے کی طرح گوناگوں دلچسپیوں کا مرقع تھا۔ اس کے بازاروں میں ویسی ہی رونق تھی اور خرید و فروخت حسب معمول جاری تھی مگر بایں ہمہ کوئی شخص بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ شہر میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ رہی ہے اور معمولی سے معمولی واقعہ ایک عظیم ہیجان کا موجب بن رہا ہے ——— برقنداز کی سیٹی کی آواز لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کر دیتی تھی۔

اکثر لوگ تو اس سیٹی کی آواز سنتے ہی بھاگ کر جاتے کہ دیکھیں کیا ماجرا ہے لیکن بعض فوراً دکانوں میں چھپ کر پناہ لے لیتے ——— مگر وہ آخر کس سے چھپ رہے تھے؟ ——— وہ کونسی شے تھی جو انہیں اس قدر خوف زدہ کر رہی تھی ——— کسی شخص کو معلوم نہ تھا اور پھر بھی ہر شخص کو ڈر تھا کہ کوئی خوفناک اور ہیبتناک واقعہ ضرور پیش آ کر رہے گا۔

عموماً چیتھڑوں میں ملبوس مزدور بازار میں کھڑے دبی زبان سے باتیں کرتے نظر آتے ——— راستہ چلتے ہوئے وہ امیر لوگوں کی طرف تحقیر آمیز منتقم نگاہوں سے دیکھتے مگر اس کے برعکس امیر ان کے زرد اور غلیظ چہروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ ایسے شخص ناخوانده مہمانوں کی طرح شہر کے بارونق بازاروں میں آوارہ چکر لگاتے گماں سے کوئی شخص ہمکلام نہ ہوتا کہ مبادا اس سے اُن کے جسم بھی ویسے ہی غلیظ ہو جائیں ——— لیکن جونہی کسی برقنداز کی ان پر نگاہ پڑ جاتی وہ عوام کے دلوں میں ارتعاشِ خفی پیدا کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں بھاگ جاتے تھے۔

"امّی! یہ مزدور ہیں کیا؟"

"ہاں! ہاں . . . لیکن تم چلتے جاؤ اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔"

"لیکن امّی! وہ بھاگ کیوں رہے ہیں؟"

"پولیس سے ——— دیکھو اب ایسی باتیں نہ کرو۔"

"لیکن کیوں؟ کیا انہیں سڑک پر چلنے کا حکم نہیں؟"

"انہیں اجازت نہیں۔"

"انہیں اجازت کیوں نہیں؟"

"خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو ——— اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ اور جلدی جلدی چلنے کی کوشش کرو ——— ورنہ ہمیں بھی کسی برقنداز کا کوڑا ———"

"سرگ نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ دوڑنا شروع کر دیا —— مزدوروں کے گروہ کے منتشر ہونے پر سرگ کی ماں سخت خوفزدہ ہوگئی تھی اس کی اُس وقت یہی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اپنے مکان میں جلد پہنچ جائے۔

"کیا یہ مزدور شریر ہیں۔ امّی!"

"کون؟ کون؟"

"مزدور؟"

"مجھے معلوم نہیں —— وہ اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی۔ مگر وہ کام ہی نہیں کرتے۔"

"کیا وہ سست ہیں؟"

"ہاں! ہاں! —— مگر تم ٹھہرو مت —— اور اُن کی طرح سست نہ بنو!"

"کیا وہ بُرے ہیں امی؟"

وہ ابھی جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ چند گھوڑ سوار سپاہی بازار میں نمودار ہوئے ان میں سے ایک نے اپنے گھوڑے کے ایک کوڑا رسید کیا —— کوڑے کی آواز سرگ کی ماں کے کانوں میں اس طرح گونجی جیسے بندوق کی آواز —— وہ چلائی اور بغیر کرایہ طے کئے سرگ کو ایک گاڑی میں دھکیل کر کوچوان کی طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا "جلدی کرو —— جہاں تک جلدی ہو سکے"۔

"مگر کہاں مادام؟ کوچوان نے مودبانہ لہجہ میں کہا۔

"تم سیدھے چلے چلو —— آہ! میرے خدا!! —— جلدی چلو!!"

"خوف مت کیجئے مادام! وہ ہمیں ہاتھ تک نہیں لگائیں گے"۔

جب گاڑی بازار کا پہلا موڑ مڑی تو سرگ کی ماں کی جان میں جان آئی اور اطمینان کا سانس لے کر بولی۔

"دیکھو —— میں تمہیں ساڑھے چار آنہ سے زیادہ کرایہ نہیں دینے کی"

"مگر یہ مناسب کرایہ نہیں محترمہ!!"

"تو پھر گاڑی کو یہیں ٹھہرالو —— ہم ٹریم کار میں گھر چلے جائیں گے"۔

"بہت بہتر مادام۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ آپ کو بے فائدہ وقت ضائع کرنا پڑے گا —— ٹریم کاریں آج نہیں چلیں گی"۔

"کون کہتا ہے؟"

"میں نے کل سنا تھا کہ ٹریم کار چلانے والے مزدور اتوار کو ہڑتال کر رہے ہیں"

اسی اثنا میں مزدوروں کا گروہ گاڑی کے قریب سے گذرا —— سرگ کی ماں پھر خوفزدہ ہوگئی اور کوچوان کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی کو پھر چلا دے۔

سرگ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا اس گروہ کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس ان لوگوں کے لئے اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہے اگر وہ کام کرنے سے انکار کرتے ہیں تو کریں —— کچھ عرصہ کے بعد وہ بھوک سے تنگ آکر خود ہی سیدھے ہو جائیں گے"۔

کوچوان نے اپنی گھنی داڑھی کو کھجلاتے ہوئے کہا۔

"آپ درست فرما رہی ہیں مادام! ـــــــ آپ ایک حیوان کو فاقہ کشی کے حربہ سے مطیع کر سکتی ہیں اور یہی حربہ انسان کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے ـــــــ مگر ایک غریب انسان کو اس طرح آزار پہنچانا گناہ ہے ـــــــ گناہ کبیرہ"۔

کچھ دیر خاموش رہ کر کوچوان پھر سرگی کی ماں کی طرف متوجہ ہُوا اور بولا:۔

"دیکھئے آپ ایک قیمتی جبّہ پہنے ہوئے ہیں اور میں ایک بھدا کوٹ ـــــ مگر یہ بتایئے ان دونوں چیزوں کو تیار کرنے والا کون ہے؟"

"اس کے متعلق زیادہ غور وفکر کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے پاس بھی روپیہ ہو تو تم بھی ایسے قیمتی کپڑے پہن سکتے ہو۔ اگر ہمارے آدمی کام نہیں کریں گے تو کیا غیر ممالک سے چیزیں منگائی نہیں جا سکتیں؟"

"لیکن اگر ذرائع آمد و رفت ہی بند ہو گئے تو یعنی اگر ریلوے کے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی تو پھر آپ وہ چیزیں کہاں سے منگوائیں گی؟"

"ایسا خیال کرنا محض بے وقوفی ہے ـ حکومت کیا ایسا کرنے کی اجازت دے گی؟"

معلوم نہیں مادام! مگر میں نے سنا ہے کہ ریل والے بھی عنقریب ہڑتال کرنے والے ہیں"۔

سرگی اپنی ماں اور کوچوان کی گفتگو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سن کر سخت حیران تھا کہ وہ لوگ جو دوسروں کے لئے کپڑے اور دیگر اشیا تیار کرتے ہیں بازاروں میں پولیس سے اس طرح کیوں بھاگے پھرتے ہیں۔ اس کی ماں نے ابھی ابھی اسے ایک نیا کوٹ خرید کر دیا تھا جو اس وقت اس کے گھٹنوں پر کاغذ میں لپٹا ہُوا پڑا تھا۔ سرگی اس بات پر بہت خوش تھا کہ اس کی ماں نے اسے کپڑوں کی ہڑتال سے پہلے ہی یہ کوٹ خرید دیا۔

"امی! کیا میرا کوٹ بھی انہوں نے ہی تیار کیا ہے؟"

"ہر ایک چیز ننھے میاں ـــ ہر ایک چیز انہی کی تیار کردہ ہے؟ آپ کے جسم پر کوئی بھی ایسی شے نہیں جو انہوں نے تیار نہ کی ہو"۔

کوچوان نے ماں کے بجائے جواب دیا

ماں نے سرگی کے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے سخت غصّے کے لہجہ میں کہا "زیادہ بک بک نہ کرو سرگی! تمہیں کوچوان سے گفتگو نہیں کرنی چاہیئے"۔

مگر کوچوان چپ نہ ہُوا اور اسی موضوع پر بہت دیر تک اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔

"معلوم نہیں وہ تمہیں گرفتار کیوں نہیں کرتے؟" سرگی کی ماں نے کوچوان سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ نہایت سخت لہجے سے کہے اس پر کوچوان چپ ہو گیا اور تمام راستہ اس بارے میں کوئی گفتگو نہ کی۔

سرگی خیالات کا ہجوم لئے گھر میں داخل ہُوا ـــ وہ ہنوز یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مزدور بُرے ہیں یا اچھے۔

"سرگی نے اپنی بہن سے پراسرار لہجہ میں کہا۔ "سونیا! آج ہم نے مزدور دیکھے"۔

"وہ کیسے ہوتے ہیں سرگی؟"

"وہ —— وہ کسانوں کی طرح ہیں میرے خیال ہیں"

گھر میں ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے کارخانوں کو بند کر دیا تھا اور کام کرنے سے انکار کرتے تھے روز گفتگو ہوتی مگر سرگ اس گفتگو سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ وہ تاحال وثوق سے نہ کہہ سکتا تھا کہ آیا وہ لوگ بُرے ہیں یا اچھے۔

ایک روز اس نے اپنے خادم اگنیش سے دریافت کیا:-

"کیا یہ لوگ کارخانے کو بند کر سکتے ہیں"

"بہت آسانی سے۔ ننھے میاں!"

"لیکن کس طرح؟"

"بس وہ کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں"

"لیکن اُن کے بغیر کارخانہ چل ہی نہیں سکتا کیا؟"

"کارخانے کس طرح چلیں ننھے آقا! جبکہ اُن کے بغیر کوئی کام ہی نہیں ہو سکتا"

"اچھا تو یہ بات ہے! اسی طرح میرا نیا کوٹ بھی اُن کے بغیر تیار نہ ہو سکتا؟"

"یقیناً!"

"اور میرا چھوٹا کوٹ بھی"

"چھوٹا کوٹ، پاجامہ اور قمیص بھی —— اگر وہ یہ سب چیزیں تیار نہ کرتے تو آپ ویسے ہی ہوتے جیسے قدرت نے آپ کو پیدا کیا تھا"

"بالکل عریاں! —— بیوقوف آدمی! —— مگر میری امی مجھے دوسرے ملک سے کپڑے منگوا دیتیں"

"مگر اس طرح آپ کو بہت انتظار کرنا پڑتا —— لیکن اگر وہاں بھی اسی طرح ہڑتال ہوتی —— یا اگر ذرائع آمد و رفت ہی بند ہو جاتے تو —؟"

"ریل گاڑیاں بھی بند ہو جائیں گی؟"

"افواہ تو یہی ہے"

"تو پھر میرے ابا کس طرح آئینگے؟ میں اُن سے کس طرح مل سکونگا؟"

"اس حالت میں انہیں پیدل سفر کرنا پڑیگا"

"خبردار! جو ایسی بات منہ سے نکالی۔ میں امی سے کہہ دونگا کہ تم میرے ابا کی نسبت ایسے الفاظ استعمال کر رہے تھے"

یہ کہہ کر سرگ تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا لیکن چند منٹ کے بعد ہی اپنے کوٹ کی آستین کو پکڑ کر کہنے لگا

"اور تم کہو گے یہ آستین بھی انہی کے ہاتھ کی سلی ہوئی ہے"

"کیوں نہیں؟ —— آپ کی والدہ نے صرف آپ کو جنم دیا ہے —— باقی ——"

دو دن کے بعد ٹریم کاریں چلنی بند ہو گئیں —— اخبار شائع نہ ہوئے —— غسلخانوں پر قفل لگ گئے۔ وہ بازار جو گیس سے بقعۂ نور بنے ہوئے ہوتے تھے اب سخت تاریک ہو گئے

اس کے دو دن بعد ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بھی یک لخت بند ہو گئی جس سے شہر میں سخت ہیجان برپا ہو گیا۔

سرگ کے ابا کبھی کے آ گئے ہوتے مگر گاڑیوں کے بند ہو جانے سے وہ گھر نہ پہنچ سکے اس واقعہ نے گھر بھر کو سخت بے چین کر دیا۔

اب سرگ کو صحن میں کھیلنے کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ سارا دن کھڑکی میں بیٹھا بازار کے واقعات کو غور سے دیکھتا رہتا

سرگ نے ایک روز اپنی ماں سے پوچھا "کیا ابا گھر

نہیں آئیں گے امی"۔

"وہ مجبور ہیں سرگ — گاڑیوں کی آمد ورفت ہی بند ہو"۔

"امّی! کیا یہ مزدور جو چاہیں کرسکتے ہیں؟"

"کیا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آیا یہ لوگ گاڑیوں کی آمدورفت بھی بند کرسکتے ہیں؟"

"واقعات تو یہی بتارہے ہیں — مگر تم مجھے ستاؤ مت" یہ کہتے ہوئے سرگ کی ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے . . . .

یہ دیکھ کر سرگ خاموش ہوگیا اور پھر کھڑکی سے بازار کی طرف جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔"اگر میرے بس میں ہو — تو میں ان مزدوروں کو ایک ایک کرکے جان سے مار ڈالوں"۔

شہر کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہورہی تھی بصورتِ حالات لمحہ بہ لمحہ نازک ہورہی تھی۔

اب بازاروں میں وہ پہلی سی رونق نہ رہی — بہت سی دکانوں میں تالے پڑ گئے — بازاروں میں رات کو مسلح پولیس نے گشت لگانا شروع کردیا تاکہ شہر میں کوئی شورش برپا ہونے نہ پائے۔

ایک روز نصف شب کے قریب بازار میں اس قدر شور ہوا کہ سرگ اپنے بستر سے برہنہ پا بھاگ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا گیا تاکہ معلوم کرے یہ شور کیسا ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں آگ کا ایک بڑا سا الاؤ جل رہا ہے جس کے اردگرد لوگ وحشیوں کی طرح چل پھر رہے ہیں۔ سرگ نے سوچا کہ یہ چیزیں ضرور کسی خوفناک واقعہ کا پیش خیمہ ہیں۔ اس خیال نے اس کی رگوں میں خون منجمد کردیا۔ اور یہ خیال کرکے کہ وہ جن بھوتوں کی طرح اسے آگ پر بھون کر کھا جائیں گے وہ اس قدر خوفزدہ ہوا کہ چلا اٹھا"امّی! امّی!! مجھے سخت ڈر لگ رہا ہے"۔

"سرگ کی ماں نے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے کہا "سرگ! تم سوتے کیوں نہیں؟ جاؤ اپنے بستر پر لیٹو"۔

"امّی! دیکھو بازار میں آگ جل رہی ہے — مجھے اس آگ سے سخت ڈر لگ رہا ہے"۔

"جاؤ سرگ اپنے بستر پر جا لیٹو — یہ آگ واگ کچھ بھی نہیں — کاش! تمہارے ابا یہاں موجود ہوتے"۔

"امّی! ——"

"ہاں! میرے بچے"۔

"میں آپ کے پاس آجاؤں؟ — مجھے خوف معلوم رہا ہے"

"کس سے میرے پیارے؟"

"جادوگروں سے امّی"۔

"وہ کون جادوگر؟"

"بہت سے جادوگر ہیں امّی — مختلف قسم کے جادوگر"

"تو پھر میرے پاس آجاؤ"۔

سرگ خوشی خوشی اپنی ماں کے پاس جا لیٹا اور اپنے آپ کو لحاف میں چھپا کر کہنے لگا"امّی! یہ لوگ سب کچھ کرسکتے ہیں"

اس کی ماں تو تھوڑی دیر کے بعد سوگئی مگر سرگ لحاف سے منہ نکال کر سوچنے لگا کہ یہ لوگ برے ہیں یا اچھے — مگر کوئی قابلِ اطمینان نتیجہ نہ نکال سکا —

دوسرے روز صبح کو جب سرگ کو ناشتہ ملا۔ تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب گرم گرم توس کے بجائے اس نے میز پر سخت اور ٹھنڈی روٹی کے ٹکڑے دیکھے۔

سرگ نے خشک روٹی کے ٹکڑوں کو میز سے ہٹاتے ہوئے کہا "مجھے بسکٹ لا کر دو! میں ایسی فضول چیز نہیں کھانے کا!!"

نوکر نے سرگ کو سمجھاتے ہوئے کہا "ننھے آقا! آپ کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ ہمارے ہاں یہ خشک روٹی بھی موجود ہے"

"کیا کہا؟ جاؤ جاؤ یہ اٹھائے جاؤ — امی! امی! مجھے بسکٹ لا کر دو۔"

"سرگ پیارے! میں تمہیں بسکٹ کہاں سے لا کر دوں۔ بسکٹ بنانے والے کارخانے ہی بند ہیں۔"

پھر وہی مزدور۔ سرگ ان مزدوروں کی حرکات سے تنگ آگیا تھا تنک کر بولا: "مگر بسکٹوں کے بغیر صبح کا ناشتہ کیسے ہوگا؟"

"ہم کوشش کریں گے کہ کہیں سے بسکٹ دستیاب ہو سکیں"

"کیا گورنر انہیں مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ بسکٹ تیار کریں؟"

"سرگ پیارے! گورنر بیچارہ کیا کرے۔ وہ تو کسی کا بھی حکم نہیں مانتے۔"

سرگ نے حیران ہو کر پوچھا "گورنر کا حکم نہیں مانتے؟"

"وہ گورنر کیا کسی کا بھی حکم نہیں مانتے۔"

"تو پھر وہ گورنر سے بھی بڑے ہوئے نا!!"

"سرگ ان باتوں کو چھوڑو اور خدا کا شکر کرکے یہی روٹی کھا لو"

"میں تو ایسی بھدی روٹی نہیں کھانے کا۔"

"مگر تمہیں مجبوراً کھانی پڑے گی"۔

"وہ کیوں؟"

سرگ کی حیرانی لحظہ بلحظہ اور روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ وہ سخت حیران تھا کہ وہ لوگ جو کارخانوں کو چشم زدن میں بند کر سکتے ہیں۔ جو گورنر تک کا حکم نہیں مانتے پولیس سے اس طرح کیوں بھاگے پھرتے ہیں۔

اُس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ویسے ہی جادوگر ہیں جن کا حال میں عموماً کہانیوں میں پڑھا کرتا ہوں اور یہ کہ ان کے پاس بھی ان جادوگروں کی طرح ایسی ٹوپیاں ہونگی جن کے پہننے سے وہ غائب ہو جاتے ہوں گے۔

جب گورنر ان سے کام کو کہتا ہوگا تو وہ جھٹ ٹوپی پہن گورنر کی آنکھوں سے غائب ہو جاتے ہوں گے!

بے چینی کی لہر آہستہ آہستہ بازاروں میں سے ہوتی ہوئی ان سربفلک محلات میں بھی داخل ہوگئی جن کے ساکنوں نے آج تک مصیبت اور تکلیف کا نام تک نہ سنا تھا۔

اب ان محلوں میں وہ پہلی سی شان وشوکت نہ رہی۔ خوشی کے نغمے اور قہقہے جن سے اُن کی دیواریں ہمیشہ گونجا کرتی تھیں — آہستہ آہستہ غائب ہوگئے اب اُن کی جگہ ایک نامعلوم خوف نے لے لی۔ وہ جن کے کان خوف سے بالکل ناآشنا تھے اب ہر وقت کسی نامعلوم خوف سے ہراساں رہنے لگے۔ وہ شخص جو ناز و نعمت کے عادی تھے اب "مجبوراً" روکھی سوکھی روٹی پر گزارہ کرنے لگے ایسے افراد میں سرگ کی والدہ کا بھی شمار تھا۔

ایک روز شام کے قریب سرگ کے گھر میں بجلی کی رو

بند ہوگئی۔

سرگ نے اپنی والدہ سے کہا "امی! معلوم ہوتا ہے بجلی گھر کا انجن خراب ہوگیا ہے"۔

"ملاقات کے کمرے کا لیمپ تو جلا کر دیکھو"۔

"امی! اُس کمرے کا کیا، کوئی لیمپ بھی نہیں جلتا"۔

"کیا بجلی گھر میں بھی تو ہڑتال نہیں ہوگئی؟"

خادم آگنیش نے کہا "جی ہاں! میں نے سنا ہے کہ بجلی گھر والوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے"۔

"آگنیش! دیکھو گھر میں موم بتیاں ہیں؟"

"جی ہیں! مگر بہت تھوڑی"۔

اب اُسی گھر میں جو بجلی کی روشنی سے بقعہ نور بنا ہوتا تھا —تاریکی— قیامت کی تاریکی مسلط تھی— ہال میں بجلی کے قمقموں کے بجائے موم بتی کی زرد روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اس روشنی کے گرد سرگ اور اُس کی ماں دونوں بیٹھے دن کے واقعات پر غور کر رہے تھے کہ باورچی خانہ سے خدام تازہ خبر لائے کہ تھوڑے دنوں کے بعد نلوں میں پانی آنا اور گوشت بکنا بند ہو جائے گا۔

سرگ ان ہوشربا خبروں کو حیرت و استعجاب کی تصویر بنا ہوا سن رہا تھا اب اس کے ننھے دماغ میں یہ خیال پوری طرح مسلط ہوگیا کہ مزدور لوگ ضرور جادوگر ہیں— بہت بڑے جادوگر جو صرف الہ دین کے چراغ ہی سے مطلع ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ جادوگر چاہیں تو ایک اشارے سے ریل گاڑیاں چلنی شروع ہو سکتی ہیں اس کا باپ فوراً گھر آسکتا ہے اُن کے حکم سے بجلی کی رو پھر واپس آسکتی ہے اور کمرے پہلے کی طرح پھر جگمگا سکتے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اُسے ہر روز صبح ناشتے کے ساتھ گرم اور تازہ توس مل سکتے ہیں۔

سرگ نے یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اپنے دل میں کہا یہ جادوگر بڑے نڈر ہیں۔

سرگ اس بات کا متوقع بھی نہ تھا جب پندرہ دن کے بعد ایک دن یک لخت کئی معجزے رونما ہوئے یعنی— ٹرام کاریں چلنی شروع ہوگئیں، بجلی کی رو آگئی، اخباروں کی اشاعت از سر نو جاری ہوگئی، صبح کے ناشتے کے ساتھ تازہ توس ملنے لگ گئے، اور اس کا باپ گھر آگیا— غرضکہ اتنی اچھی باتیں بہ یک وقت ہوگئیں۔

ایک روز جب وہ اپنے ابا کے ساتھ بازاروں میں گھومنے کے لئے گیا۔ تو اس نے خلافِ توقع بہت سے "جادوگروں" کو آزادانہ چلتے پھرتے دیکھا جو ہاتھ میں جھنڈے پکڑے مختلف قسم کے راگ گاتے ہوئے بازاروں میں چکر لگا رہے تھے۔

وہ اب کسی سے خوفزدہ نہ تھے اور نہ اب پولیس ہی انہیں ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ جب سرگ گھر واپس آیا تو اُس نے چاہا کہ اب کی دفعہ اکیلا بازار میں جا کر ان جادوگروں کا تماشا دیکھے

"امی— میری پیاری امی! بازار میں جادوگر گزر رہے ہیں۔ کیا میں انہیں دیکھنے جاؤں؟"

"ہرگز نہیں!"

"امی! اب تو وہ بُرے نہیں"۔

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے— اب پہلے کی طرح امن تھا،

کسی قسم کی شورش یا ہڑتال رونما نہ ہوئی، گھروں میں پھر خوشی کے نغمے اور قہقہے گونجنے لگے اور وہ نامعلوم خوف جو لوگوں کے دلوں پر مسلط ہو گیا تھا رفتہ رفتہ بالکل غائب ہو گیا

ایک روز سرگ بڑا اداس ہو گیا۔ اس کی ماں اور باپ دونوں تھیئٹر میں گئے ہوئے تھے، گھر کی خادمہ کسی کام میں مشغول تھی اور اس کی بہن اپنی گڑیوں میں کھیل رہی تھی سرگ حیران و پریشاں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وقت کاٹنے کے لئے کیا کروں۔

"دادی اماں! بتائیے میں کیا کروں"۔

"آؤ میرے پاؤں دباؤ"۔

"میں نہیں دباتا۔۔۔ پاؤں دبانے میں کوئی دلچسپی نہیں"

یہ کہہ کر وہ اسی خیال میں مستغرق دوسرے کمرے میں گیا اور اپنی بہن کی نئی گڑیا توڑ ڈالی۔ اس حرکت پر ماما سخت خفا ہوئی اور اس نے اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ باورچیخانہ میں جا کر نئی باورچن کو دیکھے مگر خادمہ اجازت نہ دیتی تھی اس لئے کہ سرگ کی ماں اس سے کہہ گئی تھی کہ اُسے باورچیخانے میں ہرگز ہرگز نہ جانے دے۔

سرگ نے تنگ آ کر کہا "مگر میں کیا کروں۔ میں اکیلا ہوں"

خادمہ نے سرگ سے پوچھا "کیا تمہارے لئے کوئی اور دلچسپی باقی نہیں رہی؟"

"یہ کون باتیں کر رہا ہے؟"

"باورچن کا خاوند آیا ہوا ہے۔ وہی باتیں کرتا ہوگا"۔

"یہ دلچسپ چیز نہیں تو اور کیا ہے؟"

"وہ دلچسپ کس طرح ہؤا؟ وہ معمولی سا آدمی ہے۔ ایک غریب مزدور"۔

"باورچن کا خاوند ایک مزدور؟"

"کیوں؟"

"ایک جادوگر۔۔۔ اب تو میں ضرور اندر جاؤنگا"۔

"سرگ! اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہاری اماں سے کہہ دوں گی کہ تم نے ان کی نافرمانی کی ہے"۔

"تم چغل خور بھی ہو؟۔۔۔ چغل خور! کہہ کر تو دیکھو میں نے بھی انہیں بتانہ دیا ہو کہ تم نے صبح دودھ پر سے بالائی اتار کر کھالی تھی"۔

"یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے تو دودھ میں سے مکھی نکالی تھی"

سرگ بہت عرصے تک خادمہ سے جھگڑتا رہا مگر اُس نے اُسے باورچی خانے میں جانے کی اجازت نہ دی۔

جب خادمہ کمرے سے چلی گئی تو سرگ نے اطمینان کا سانس لیا اور باورچی خانے کے دروازے کے قریب جا کر اُسے آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیا۔ سرگ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ دروازہ ایک دم کھول دے اس لئے وہ کچھ عرصہ سانس بند کئے دروازے کے ساتھ لگا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمت کر کے اس نے کمرے کے اندر جھانکا۔۔۔ ایک بھدا سا آدمی میز پر بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ اس کی حرکات سے معلوم ہوتا تھا گویا وہ ڈر رہا ہے کہ کوئی شخص اس کا کھانا نہ چھین لے۔ اسی لئے وہ دوسرے ہاتھ سے پلیٹ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

سرگ حیران تھا کہ وہ جادوگر کہاں ہے؟۔۔۔ ایسا بھدا

مزدور اتنا طاقتور جادوگر نہ ہوسکتا تھا۔

اُس نے باورچی خانے کے ہر گوشے میں نگاہیں دوڑائیں مگر اس شخص اور باورچن کے سوا کسی اور کو موجود نہ پایا۔ تو پھر اس کے یہ معنی تھے کہ وہ بدنما شخص ہی جادوگر ہے۔

سرگ اس راز کو معلوم کرنے کے لئے باورچی خانے میں داخل ہوگیا —— جس پر جادوگر اس قدر چونکا کہ اس کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی۔

باورچن نے اپنے خاوند کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم کھانا کھائے چلو —— ننھے آقا تمہیں کچھ نہیں کہیں گے"۔

سرگ نے حیران ہوکر پوچھا۔ "ہیں؟"

"اپنی امّی سے مت کہیئے کہ یہ شخص شوربا پی رہا تھا —— یہ کھانے سے بچا ہوا تھا ننھے آقا!"

"یہ شخص بہت بھوکا ہے ننھے آقا! آپ کو اس پر رحم کرنا چاہیئے"

"کون؟"

"یہ شخص —— میرا خاوند"

"تمہارا خاوند؟"

سرگ نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی خاطر اس شخص کی طرف غور سے دیکھا اور اپنے دل میں کہا "اس جادوگر نے ضرور اپنی شکل تبدیل کر رکھی ہے"۔

اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "تم جادوگر ہو —— مجھے اچھی طرح معلوم ہے تم جادوگر ہو!"

مزدور نے ڈرتے ہوئے پوچھا "کون؟"

"تم اور کون؟"

"میں ایک غریب مزدور ہوں میرے آقا!"

"لیکن تم جادوگر ہو —— مجھے یقین ہے کہ تم جادوگر ہو۔ تم سب کچھ کرسکتے ہو۔ یہ سب حرکتیں تمہاری ہی تھیں۔ لیکن دیکھو! اب ایسی حرکات نہ کرنا —— بغیر بجلی کے گھر میں سخت اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اور کارخانے بند کرنے سے مجھے بسکٹ نہیں ملتے"۔

"جناب! میں نے تو ایسی حرکت کبھی نہیں کی۔ میں ابھی جاتا ہوں"

"تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ تم تو کسی سے خوفزدہ ہی نہیں ہوتے۔ میرا خیال تھا کہ تم مکان جتنے بڑے ہوگے۔ مگر معلوم ہوتا ہے تم نے شکل تبدیل کر رکھی ہے"۔

آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ اس طرح مذاق کرنا گناہ ہے میرے آقا!"

"میں نے خیال کیا تھا کہ تم بہت سنجیدہ ہوگے مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم مسخرے بھی ہو۔ شوربا پیتے وقت تمہارے ہاتھ کانپ رہے تھے اس لئے میں تم سے ذرّہ بھر بھی خوف زدہ نہیں۔"

اتنا کہہ کر سرگ باورچی خانہ سے باہر نکل کر دروازہ میں کھڑا ہوگیا تاکہ اگر جادوگر اس کا تعاقب کرے تو وہ جلدی سے گھر میں بھاگ جائے مگر خلافِ توقع جادوگر نے اس کا تعاقب نہ کیا۔

سرگ نے مڑکر دیکھا تو جادوگر —— ہاں! وہی جادوگر۔ ایک کونے میں کھڑا رو رہا تھا اور اپنے آنسوؤں کو اپنی غلیظ آستین سے صاف کر رہا تھا۔

"ایک جادوگر ہوکر تم رو رہے ہو۔ اچھا ہوا تمہیں ایسی ہی سزا ملنی چاہیئے —— تم نے میرے ابّا کو گھر میں کیوں نہ آنے دیا تھا؟ —— تم نے بجلی کی روشنی کیوں بند کر دی تھی؟ تم نے میرے بسکٹ بنانے کیوں بند کر دیئے تھے؟ —— اب تمہیں خدا نے خوب سزا دی ہے۔ روؤ —— اور خوب روؤ ——"

یہ کہہ کر سرگ خوشی کے نعرے مارتا ہوا گھر میں چلا گیا اور دادی کے پاس جاکر کہنے لگا "اب میں اس جادوگر سے نہیں ڈرتا —— ذرّہ بھر نہیں ڈرتا"۔

(ترجمہ) ———— سعادت حسن

نوائے مجاز

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہوگیا ہوں میں
اُسی کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

بتانے والے وہیں پر نشاں بتاتے ہیں
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ!
تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں

تجھے یہ ناز کہ تیرا نشاں نہیں ملتا
مجھے یہ فخر کہ تیرا ہی نقشِ پا ہوں میں

اِس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے
جہاں سے چاہتا ہوں تجھ کو دیکھتا ہوں میں

پھر ایک سلسلۂ نقشِ پا نظر آیا
پھر اپنی دُھن میں کسی سمت جا رہا ہوں میں

کبھی یہ زعم کہ تو مجھ سے چھپ نہیں سکتا
کبھی یہ وہم کہ خود بھی چھپا ہوا ہوں میں

مرا نشاں نہ ملے گا مرا نشاں مت پوچھ
جو کھو گئی ہو فضاؤں میں وہ صدا ہوں میں

مجھے سنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجازؔ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

اسرار الحق مجاز ردولوی

والٹر

والٹر ایک قدآور اور شہ زور جرمن تھا۔ وہ فطرتاً صلح پسند بلکہ بزدل واقع ہوا تھا۔ اس کی شادی ایک نوجوان حسین لڑکی سے ہوئی تھی جس سے اُس کے چار چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ اسے بیوی بچوں سے بیحد محبت تھی۔ وہ سرِشام سو جانے اور صبح دیر میں اٹھنے کا عادی تھا۔ پیٹ بھر کر کھانا اور بیوی بچوں میں وقت گزارنا اسے بہت بھاتا تھا۔ یہ پُرلطف خانگی زندگی اسے بے انتہا پسند تھی۔ اور یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ میدانِ جنگ، بندوق اور سنگین کے نام سے نفرت کرتا تھا۔ وہ فوج کا سپاہی ضرور تھا۔ مگر ان خطرناک جنگی آلوں کے استعمال میں اُس نے کبھی مہارت اور سبکدستی نہ دکھائی۔ بلکہ تمام عمر ان سے دور ہی دور رہا۔

وہ کسی حالت میں بھی مرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ قطع نظر اپنی ذات کے اُسے کم از کم بیوی بچوں ہی کے لئے زندہ رہنا ضروری تھا۔ دولتمند وہ تھا نہیں، بلکہ اس کی مالی حالت کبھی قابلِ اطمینان نہ رہی۔ خدانخواستہ اگر وہ مارا جاتا تو اس کے بیوی بچوں کا کیا حشر ہوتا۔ الغرض میدانِ جنگ اور دشمن کا خیال آتے ہی اس کا جسم تھرتھرانے لگتا۔ گولی کی سنسناہٹ اور تلواروں کی جھنکار کے خیال ہی سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اور پھر تو وہ کسی شرط پر بھی میدانِ جنگ میں جانے کے لئے آمادہ نہ ہوتا۔

جب سے جرمن اسکاوٹ کے ہمراہ وہ فرانس کی سرحد میں داخل ہوا اپنی قسمت کو کوستا ہی رہا۔ دراصل اس کی تمام زندگی میں گزشتہ چند ماہ بیحد پریشانی اور خطرے میں گزرے۔ اس مرتبہ بڑی مشکل سے وہ جرمن اسکاوٹ کی ایک مختصر سی جماعت کے ہمراہ سرحدی علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ فرانسیسی استحکامات اور سرحدی سرزمین کی کیفیت معلوم کر کے جرمنی اطلاع دینا اس جماعت کا کام تھا۔ اتفاقاً اس وقت تمام علاقے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کہیں بھی جنگی فضا کا وجود نہ تھا۔ چنانچہ آخری وقت تک اس جماعت کو کہیں بھی دشمنوں کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

ایک صبح یہ جماعت اپنا کام کامیابی سے ختم کر کے جرمنی واپس ہو رہی تھی۔ یکایک ایک طرف سے بندوقوں کی باڑھ چلی اور بیس پچیس آدمی زخمی ہو کر زمین پر آ رہے۔ پلک جھپکتے ہی فرانسیسیوں کا ایک مختصر سا دستہ قریب کے جنگل میں سے نکل کر حملہ آور ہوا اور بہت جلد ہی دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ یہ خونریز سماں دیکھ کر والٹر بدحواس ہو گیا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نے اس کے پیر پکڑ لئے ہیں اور وہ چل نہیں سکتا۔

مگر فوراً ہی اُس نے رُخ پھیرا اور بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اُسے سامنے ہی ایک طول طویل خندق

دکھائی دی جو خشک جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ والٹر بے توقف اس میں کود پڑا اور جلد ہی گھاس پھوس اور جھاڑیوں میں سے ہوتا ہؤا تہ میں پہنچ گیا۔ اس کا منہ اور سارا بدن لہولہان ہوگیا ایک نوکیلے پتھر سے اُس کے سر میں چوٹ بھی آگئی۔ مگر اس وقت اسے اس کی بھی پروا نہ تھی۔ اس وقت تو فرانسیسیوں کی نگاہ سے بچ کر نکل جانا ہی غنیمت تھا۔ اس نے جھاڑیوں میں سے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا اور اس طرح تھوڑی دیر میں وہ میدانِ جنگ سے بہت دور نکل گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر جیسے ہی اس نے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا اسے نیلا نیلا آسمان دکھائی دیا اور ساتھ ہی وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھا۔ کیا میں یہاں بھی محفوظ نہیں ہوں؟ خوش قسمتی سے قریب ہی کھائی میں ایک طرف چھوٹا سا غار دکھائی دیا اور والٹر جلدی سے اس میں ہو رہا۔

آہستہ آہستہ دن ڈھلتا گیا اور شام ہو چلی۔ تاریکی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ اب تو والٹر نے پریشان ہو کر سوچنا شروع کیا کہ رات کہاں بسر کی جائے۔ کیا فوج میں واپس چلوں اور پھر وہی بندوق وہی سنگین وہی تلوار؟ نہیں! اور پھر بھاگے ہی کیوں تھے؟ آس پاس پتیوں میں کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور ایک مرتبہ وہ پھر کانپ گیا۔ کہتے ہیں "مصیبت تنہا نہیں آتی"۔ دیکھئے نا فرانسیسیوں کا ڈر، پتھر کی چوٹ، کانٹوں کی خراش ہی کیا کم تھی کہ غریب سپاہی کو بھوک پیاس نے بھی ستانا شروع کیا۔ والٹر ان لوگوں میں سے نہ تھا جو ہوا پی کر زندہ رہ سکتے ہیں اور نہیں تو پیٹ ہی بھرنے کے لئے اسے اس محفوظ خندق کو مجبوراً چھوڑنا تھا۔ مگر ہموطنوں سے دور دشمن کے ملک میں تن تنہا۔ اور اس پر غضب یہ کہ فوجی وردی میں جرمن سپاہی۔ اس خیال ہی سے اس کے ہوش و حواس غائب ہوگئے۔

یک بہ یک اسے خیال آیا کہ کیوں نہ جنگی قیدی بن جاؤں۔ مزے سے پیٹ بھر کھانے کو ملے گا اور پھر بے مشقت میدان جنگ سے دور۔ گولی بارود سے محفوظ۔ ایک بے خطر قید خانے میں بس بس چلو فرانسیسی کیمپ میں چل کر گرفتار ہو جاؤں۔ لیکن اگر کہیں کچھ فرانسیسی گھات لگائے راستے ہی میں بیٹھے ہوں اور جرمن جاسوس سمجھ کر نکلتے ہی حملہ کردیں؟ یا اگر کسانوں نے دیکھ پایا کہ ایک جرمن وردی پوش سپاہی اور وہ بھی تن تنہا۔ توبہ ارے وہ تو کتے کی موت مار ڈالیں گے۔ اور اپنی پے در پے ہزیمتوں کا بدلہ ایک جرمن سپاہی سے دل کھول کر نکالیں گے ارے غضب اور پھر میری غریب بیوی اور پیارے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ اور پھر دشمن کے کیمپ میں وردی پہن کر جانا بھی تو خطرناک ہے کہیں کوئی پہلی ہی نظر میں فیر کردے تو کیا ہو۔ تو پھر قیدی کیسے بنوں؟"

غریب سپاہی نہ معلوم کب تک اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہا مگر اب دوسری مصیبتیں سر پڑیں، رات بھیگ چکی تھی اور ہر طرف ناقابل برداشت تاریکی چھا گئی تھی۔ یہ ہیبت ناک خاموشی اور تاریکی دیکھ کر اس کی نبض چھوٹ چلی تھی۔ اور اب تو اس نے ڈر کے مارے ہلنا جلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کسی طرف سے ایک چمگادڑ اڑتی ہوئی آئی اور اس کے سر سے ٹکرا کر گری اور بس اس کی جان ہی تو نکل گئی! ایک مرتبہ ایک لومڑی پاس ہی سے بھاگتی ہوئی نکل گئی اور اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا کہ کہیں کوئی فرانسیسی تو نہیں آرہا ہے۔ اتنے میں سرد ہوا کے جھونکے چلنے لگے اور غریب سپاہی ایک مرتبہ پھر سکڑ کر اپنے غار میں بیٹھ رہا۔ بیچارے نے تمام

رات اسی کرب اور بے چینی میں گزاری۔

علی الصباح جب کچھ روشنی ہوئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہوگئے اور سرزانو سے لگ گیا جلد ہی وہ بے خبر ہو کر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو سورج سر پر چمک رہا تھا اور اسے بیحد بھوک لگی ہوئی تھی۔ اُبلے ہوئے آلو۔ بھنے ہوئے گوشت اور فرانسیسی شراب کا خیال آتے ہی اُس کی آنتوں میں درد سا ہونے لگا۔ اس نے کوشش کر کے سر سے خود اتارا اور بڑی احتیاط سے سر خندق کے باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دور افق تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ البتہ ایک طرف دور بہت دور ایک چھوٹا سا گاؤں ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ جھونپڑوں کی چمنیوں سے دھواں نکل نکل کر بتا رہا تھا کہ دوپہر کا کھانا بس تیار ہی ہے مگر اسے اب بھی باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ رات آئی اور ختم ہوگئی۔ تمام شب وہ پُر لطف کھانوں اور شراب ہی کا خواب دیکھتا رہا مگر صبح سویرے وہی بھوک اور اب بھی اسی خندق میں۔

تیسرا دن بھی گزر گیا اور اب تیسری رات آگئی۔ وہ ڈرا کہ کہیں فاقہ کشی کرتے کرتے مر نہ جاؤں۔ اُس نے تصوّر کیا کہ وہ مر گیا ہے۔ اس کی لاش خندق میں پڑی ہے۔ مردار خور جانور نوچ نوچ کر اس کا گوشت کھا رہے ہیں۔ پاس ہی دو کتے اس کی ہڈیوں پر غرا رہے ہیں۔ یہ سوچتے ہی وہ کانپ اٹھا۔ آہ! میں یہ ذلیل موت نہیں مروں گا۔ اور پھر میں شہادتِ ملّی کے اعزاز سے بھی تو محروم ہی رکھا جاؤں گا۔ کیا میں میدان جنگ سے بے انتہا دور نہیں نکل آیا ہوں۔ اور پھر مجھے کوئی گہرا زخم بھی تو نہیں لگا۔" وہ ڈرا کہ کہیں بھوک پیاس کی شدت سے بیہوش نہ ہو جائے کہ پھر اس کا اس خندق سے نکلنا معلوم اس نئے خیال سے وہ اتنا خوفزدہ ہوا کہ اس نے خندق سے نکل بھاگنے ہی کی ٹھہرائی۔ مگر ابھی ارادہ ہی کیا تھا کہ پاس ہی چند دیہاتیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اب تو وہ آناً فاناً پھر اسی غار میں اور بالکل بے حس وحرکت۔ خیریت ہوئی کہ وہ دوسری طرف مڑ گئے۔ ورنہ بیچارے کی بے بلائے موت آجاتی۔

مگر جب رات زیادہ گزر گئی اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو اس سے نہ رہا گیا۔ گاؤں یا کیمپ جانے کی تو اب بھی اُسے جرأت نہ ہوئی۔ چار و ناچار اس نے قلعے کی راہ لی۔ کہ وہاں نسبتہً کم خطرہ تھا۔ چھپتا چھپاتا نہایت احتیاط اور بڑی خاموشی کے ساتھ وہ قلعے کے پاس جا پہنچا۔ خیریت ہوئی کہ راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ اس وقت اس قلعے کی کھڑکیوں میں سے نہایت تیزی سے روشنی باہر نکل رہی تھی اور اتفاقاً ایک کھڑکی بالکل کھلی ہوئی تھی جس میں سے بھنے ہوئے گوشت کی سوندھی سوندھی خوشبو باہر نکل رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے والٹر تمام خطرے بھلا بیٹھا اور کھڑکی ہی سے بے اختیار اندر جست کر گیا۔ یہ باورچی خانہ تھا اور بالکل خالی۔ پاس ہی دوسرے کمرے میں آٹھ دس آدمی ایک لمبی سی میز کے گرد اگرد بیٹھے ہوئے مزے لے لے کر کھانا کھا رہے تھے۔ والٹر جھانک کر انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک عورت کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اور فوراً اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

اس نے اس کی طرف اشارہ کر کے چلانا شروع کیا۔ "دیکھو وہ دیکھو جرمن حملہ کر رہے ہیں"۔ یکے بعد دیگرے سب کی نگاہیں اُس کی طرف اٹھیں اور بدحواس ہو کر سب نے چلانا اور بھاگنا شروع کیا۔ عورتیں مرد اور بچے۔ ایک کے پیچھے ایک۔ گرتے پڑتے ایک لمحے میں سب دروازے کی طرف بھاگے اور دوسرے لمحے میں کمرہ خالی تھا۔

میز پر لذیذ کھانوں سے بھری ہوئی پلیٹیں بدستور پڑی تھیں اور والٹر تین شبانہ روز کا بھوکا تھا۔ وہ بے صبری کے ساتھ آگے بڑھا اور چاہتا تھا کہ سارا کھانا ایک ساتھ نگل جائے۔ مگر باہر کی بھاگ دوڑ سن کر ایک میز کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا تھوڑی دیر میں شور و غل بند ہوا معلوم ہوتا تھا تمام لوگوں نے سانس روک لی ہے۔ البتہ کچھ دور دوسری طرف لوگوں کے زینے سے نیچے اترنے کی آواز ضرور آرہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ تہ خانے میں گھس رہے ہیں! ورجب ہر طرف موت کا سناٹا چھا گیا تو والٹر میز کے نیچے سے نکلا اور جھپٹ کر کھانا بلکہ نگلنا شروع کیا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں فرانسیسی آکر کھانا چھین نہ لیں اس لئے وہ دونوں ہاتھوں سے اٹھا اٹھا کر ہر چیز بڑی تیزی سے نگل رہا تھا! ورجب تمام پلیٹیں صاف ہوگئیں تو اُس نے کرسی سے پیٹھ لگا کر کوٹ کے بٹن کھولے اور شراب کی کئی بوتلیں خالی کر ڈالیں۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کمرہ۔ میز کرسیاں سب چکر کھا رہی ہیں۔ اس کا سر ایک بازو پر جھک گیا اور وہ بے سُدھ ہو کر اسی کرسی پر تمام شب پڑا رہا۔

علی الصباح قلعے کے باہر چند سپاہیوں کے ادھر اُدھر گھومنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں کبھی کبھی چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں آہنی سنگینوں اور تلواروں کی چمک بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ ٹھیک اسی وقت اس تاریخی قلعے کی دو کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سے پھوٹ پھوٹ کر روشنی باہر نکل رہی تھی ـــــ یک بہ یک ایک گرج سنائی دی۔ "آگے بڑھو" قلعہ پر حملہ کرو" ـــــــــ

آواز کے ساتھ ہی ہزاروں بندوقیں اٹھیں اور ایک ساتھ قلعے پر باڑھ پڑی۔ قلعے کی کھڑکیاں اور بڑا دروازہ ٹوٹ کر نیچے آرہا۔ اور فوراً تمام دستہ قلعے میں داخل ہوگیا۔ پچاس منتخب اور تجربہ کار دلاوروں نے ادھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد باورچی خانے کا رخ کیا۔ غریب والٹر اب تک میز پر پیر پھیلائے۔ اطمینان سے سو رہا تھا۔ یکدم ان پچاس بہادروں نے بندوقیں اٹھائیں اور اس کے سینے کا نشان باندھ دیا۔ "ہاتھ اوپر اٹھاؤ"۔ نیم خوابیدہ، نیم مردہ جرمن نے کانپتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔ چند جوانمرد آگے بڑھے اور اُسے گرفتار کر لیا۔

ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔ "اب تم ہمارے قیدی ہو"۔ یہ سنتے ہی غریب جرمن کانپ اُٹھا مگر فوراً اس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اس وقت اس کے دونوں خواب "روٹی" اور "قید" پورے ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک معمر افسر آپہنچا جسے دیکھ کر سپاہیوں نے راستہ خالی کر دیا۔ نوجوان افسر نے چلا کر کہا۔ جناب ہم نے دشمنوں کو بھگا دیا۔ ایک بچ رہا

ہے سو وہ بھی ہمارا قیدی ہے" معمر فرانسیسی نے جولبشرے سے سالارِ لشکر معلوم ہو رہا تھا، اپنی پیشانی پر بل ڈال کر اور گرج کر کہا "فتح عظیم الشان فتح" ساتھ ہی جیب سے ایک چرمی نوٹ بک نکال کر بہ عجلتِ تمام اس میں یہ عبارت درج کر ڈالی ۔

"آج صبح ایک زبردست حملے کے بعد ہمارے بہادر سپاہیوں نے جرمن دستوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا ۔ ایک شدید مزاحمت کے بعد جرمن قلعے کو خالی چھوڑ کر اور اپنے زخمیوں اور مقتولین کو ہمراہ لے کر بھاگ گئے ۔ اُن کے نقصان کا اندازہ سوسوا سو کے قریب ہے ۔ جن میں سے ایک معقول تعداد گرفتار بھی ہوگئی ہے ۔ مگر صرف ایک ہی کے زندہ بچ رہنے کی اُمید ہے ہمارا بہت خفیف سا نقصان ہُوا ۔

دستخط ——— تاریخ ———

اس کے بعد اُس نے اپنے ماتحت افسروں کو حکم دیا ۔" اب ہیڈ کوارٹر واپسی ہوگی ۔ نصف بندوقچی ہراول اور نصف عقب میں اتفاقی حملے کے لئے ہمہ وقت تیار ۔ باقی ماندہ فوج قیدی کے ہمراہ ۔ اچھا صف بندی ۔"

فرانسیسی دستے فتح و کامرانی کے نشے میں بڑی آن بان کے ساتھ واپس ہوئے ۔ والٹر سلاح بند سپاہیوں کے حلقے میں لے لیا گیا ۔ اور اس طرح تمام فوج روانہ ہوئی ۔ راستے میں سورج نکل آیا ۔ دیہاتیوں نے پابجولاں جرمن کو دیکھ کر قومی نعرے بلند کئے ۔ ایک کرنیل نے آگے بڑھ کر سپاہیوں کو قیدی سے ہوشیار رہنے کا حکم دیا اور اس طرح یہ ٹڈی دل ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا ۔ وہاں پہنچ کر والٹر سنگین پہرے میں رکھا گیا اور اس طرح شمپن گنٹ (Champen Gent) کا یہ تاریخی قلعہ جرمن حملہ آوروں سے چھ گھنٹے کی مدت میں واپس لے لیا گیا ۔ اخباروں نے اس عظیم الشان فتح پر افتتاحی مقالے لکھے ۔ قومی مجلس میں بہادر سپاہیوں کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا ۔ افسروں کو تمغے عنایت ہوئے اور سپہ سالار کو خطابات ۔

غریب والٹر کو ابتداءً میں سوئے ہضمی کی شکایت ضرور ہوگئی تھی ۔

(ماخوذ) عزیز الرحمٰن ہاشمی گورکھپوری

دل آشفتہ و دیدہ خونبار داری — مگر با محبت سر و کار داری

کہ نشتر فرو برد در مغز جانت؟ — کہ رگ ہائے مژگاں گہربار داری

گلِ نازپروردِ من بے قراری — ہمانا کہ در پیرہن خار داری

وجدانیات

رباعی

گردابِ ملامت سے نکالا تو نے — ساقی کے قدم پر مجھے ڈالا تو نے

مستی میں بہکنے کا بہت امکاں تھا — اے لغزشِ پا خوب سنبھالا تو نے

تھوڑی سی خودی سے گر لے کام یہ دیوانہ — خود شمع پھرے آ کر گردِ پرِ پروانہ

پھر شورِ انا الحق سے دنیا کو اُٹھا سر پر — ربِ ارنی کب تک اے ہمتِ مردانہ

تقدیر کھلی مر کر دی اُس نے جگہ در پر — سنگِ سرِ تربت ہے سنگِ درِ جانانہ

کس رند کی حسرت نے مے جام سی چھلکا دی — دستِ حنائی میں تڑپا خطِ پیمانہ

بلبل! کہیں نالوں سے دل گُل کا پگھلتا ہے؟ — اِس کے لئے لازم ہے سوزِ دلِ پروانہ

اے لختِ جگر میری پلکوں پہ ذرا تھم جا! — تو زینتِ مژگاں ہے اشکوں ہیں یہ جانا

اے وجد خودی اپنی پامال نہ ہونے دے

سر کو نہ جھکا ہرگز کعبہ ہو کہ بُت خانہ

سکندر علی وجد

ماں

ماں اپنے بچے کے قریب بیٹھی ہے، وہ غمگین ہے اور اُداس، کیونکہ بچہ بیمار ہے۔ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ آنکھیں بند ہو چکی ہیں۔ اور سانس بھی رُک رُک کر آ رہی ہے بار بار رہ رہ کر زور سے سانس لیتا ہے اور ماں اور اُداس ہو جاتی ہے۔ ... اسی وقت کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی اور ایک پیر مرد کمبل اوڑھے ہوئے اندر داخل ہُوا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ چاروں طرف برف گر رہی تھی اور ہوا تیز و تند تھی۔ چبھتی ہوئی! نووارد کانپ رہا تھا چونکہ بچے پر اس وقت غنودگی سی طاری ہو گئی تھی اس لئے ماں اُٹھی اور چھوٹے سے پیالے میں تھوڑی سی شراب لائی اور آگ پر گرم کرنے کے لئے رکھ دی نووارد بیٹھا پالنے کو جھلاتا رہا۔ ماں اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور متفکرانہ نگاہوں سے اپنے بچے کو دیکھنے لگی۔ سانس اب بھی رُک رُک کر آ رہی تھی۔

ماں (بچے کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر) "میں اسے جانے نہ دونگی۔ خدا ارحم الراحمین ہے وہ میرے بچے کو مجھ سے جدا نہ کرے گا،"

اس پر نووارد نے عجیب انداز سے سر ہلایا جس سے نہ تو یہ پتا چلتا تھا کہ اس کا جواب نفی میں ہے اور نہ یہ کہ اثبات میں ہی! ماں نے آنکھیں نیچی کر لیں جن سے آنسوؤں کا دریا امنڈ پڑا۔ وہ سرگرانی محسوس کر رہی تھی۔ تین دن سے جاگ رہی تھی۔ اس لئے ذرا آنکھ لگ گئی لیکن فوراً ہی ——— ایک منٹ کے بعد ——— چونک پڑی۔ سردی سے کانپ رہی تھی۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پیر مرد جا چکا تھا اور لڑکا بھی! یقیناً پیر مرد اسے اپنے ساتھ لیتا گیا! سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی بھی بند ہو چکی تھی۔ کمرے میں بالکل سکون تھا لیکن چین نہ تھا تو بیچاری غمزدہ ماں کے لئے! وہ اپنے لڑکے کی تلاش میں باہر دوڑ گئی۔ باہر ایک ضعیفہ سے جو ایک بڑے سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی تھی ملاقات ہوئی:۔

ضعیفہ:۔ "موت تمہارے گھر میں جا گزیں تھی! میں نے ابھی ابھی اس کو تمہارا لڑکا لئے جاتے دیکھا ہے وہ ہوا کے مانند چلتی ہے اور جس کو ایک دفعہ لے جاتی ہے پھر واپس نہیں دیتی"۔

ماں:۔ "ہائے وہ کس راستے سے گئی؟! مجھے صرف راستہ بتا دو۔ میں پتا چلا لوں گی!"

ضعیفہ:۔ "میں راستہ جانتی ہوں لیکن جب تک تم مجھے وہ سب گیت جو تم اپنے لڑکے کے پاس گایا کرتی تھیں نہ سناؤ گی نہ بتاؤنگی میں اُن کو پہلے بھی سُن چکی ہوں۔ مجھے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ میں 'رات' ہوں۔ میں نے اکثر تمہارے رخساروں پر گانے کے وقت آنسو بہتے دیکھے ہیں!"

ماں:۔ "میں سب سنا دونگی، مگر اس وقت نہ ٹھہراؤ۔ مجھے موت کو پکڑنے دو۔ کمبخت سے اپنا بچہ چھڑانا ہے!" لیکن رات خاموش رہی۔

وہ سنگدل بنی بیٹھی تھی! چار و ناچار ماں نے سب گیت سنائے۔ گیت بہت سے تھے لیکن قطراتِ اشک جو اس کی آنکھوں سے گرے اُن سے بھی زیادہ!!

رات: "اچھا تو تم داہنے ہاتھ صنوبر کے کنج سے ہو کر جاؤ۔ میں نے اُسے اسی طرف جاتے دیکھا ہے"۔

لیکن کنج میں کئی راستے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے گزر گئے تھے اور مصیبت زدہ ماں حیران تھی کہ کدھر جائے۔ وہیں ایک کانٹے دار جھاڑی تھی جس میں کوئی برگ و بار نہ تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ کچھ برف کے ٹکڑے برہنہ شاخوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

ماں: "کیا تم نے اس طرف موت کو میرا بچہ لے جاتے دیکھا ہے"؟

جھاڑی: "ہاں میں نے دیکھا ہے۔ لیکن جب تک تم مجھے اپنے گرم جسم سے ہم آغوش نہ کر وگی میں نہ بتاؤں گی۔ سردی سے میرا بُرا حال ہے۔ تمام یخ ہو رہی ہوں"۔

ماں نے فوراً اسے اپنے سینہ سے چمٹا لیا۔ تمام کانٹے چبھ گئے اور خون کے بڑے بڑے قطرے جسم پر چھلک آئے لیکن موسم سرما کی اُس سرورات میں بھی جھاڑی سر سبز ہو گئی۔ پھول لگنے لگے۔ پتیاں نکل آئیں ——— مصیبت زدہ ماں کے سینے میں اپنے لڑکے کے غم کی وجہ سے گرم آنسوؤں کا سمندر موجزن تھا۔

سامنے ہی ایک وسیع جھیل ملی جس میں نہ کوئی جہاز تھا نہ کشتی۔ نہ پانی ابھی پوری طرح منجمد ہوا تھا کہ وہ اُس پر سے گزر جائے اور نہ اتنا کم تھا کہ وہ پایاب اُتر جائے۔ پھر بھی موت سے اپنا بچہ واپس لینے کے لئے جھیل کو عبور کرنا ضروری تھا۔ اس نے پانی پی کر جھیل کو خشک کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک تنہا انسان کی بساط سے یہ بات باہر تھی۔ پھر بھی شمعِ امید کی ایک ہلکی سی کرن اس کے سینے میں لرزاں تھی!... اسی فکر میں کنارے آئی:-

جھیل: "اس طرح تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں! البتہ ایک تجویز ہے۔ شاید تمہارے لئے مفید ہو۔ مجھے موتی جمع کرنے کا بہت شوق ہے! اور تمہاری آنکھوں سے زیادہ شفاف موتی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر تم رو کر اپنی آنکھیں میرے پانی میں بہا دو تو میں تم کو "مقبرِ اجل" تک پہنچا دوں۔ موت وہیں اپنے سب پھولوں کے پودوں کی جن میں سے ہر ایک درخت درحقیقت ایک انسانی روح ہے نگہداشت کرتی ہے"۔

ماں: "ہائے میں اپنے بچے کے لئے کیا کچھ قربان نہیں کر سکتی"!

یہ کہہ کر وہ یہاں تک روئی کہ اس کی آنکھیں جھیل کی تہ میں پہنچ گئیں اور دو بیش بہا موتی بن گئیں۔ مسرت کی موجیں جھیل کے سینے میں بڑے زور و شور سے اٹھیں اور اُس نے ماں کو اُٹھا کر دوسرے کنارے پر پہنچا دیا ——— یہاں ایک عجیب سیاہ عمارت تھی جو میلوں تک چلی گئی تھی۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ حقیقتہً کوئی عمارت ہے جسے انسانی ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے یا کوئی پہاڑ جس میں لاتعداد غاریں اور

پُرخطر جنگل! لیکن غریب ماں جو پہلے ہی اپنی آنکھیں جھیل کی نذر کر آئی تھی اِن کو نہ دیکھ سکی :-

ماں :- "ہائے میں موت کو کدھر ڈھونڈوں کہ میں اس سے اپنا بچہ طلب کروں!"

اس وقت قصرِ اجل میں صرف ایک سفید بالوں والی ضعیفہ تھی جو موت کی غیر حاضری میں اس کے باغ کی نگہبانی کرتی تھی :-

ضعیفہ :- "وہ یہاں ابھی تک نہیں آئی ہے . . . لیکن تم یہاں تک کیونکر پہنچ سکیں؟ تمہیں راستہ کس نے بتایا؟"

ماں :- "مجھے میرا خدا یہاں تک لایا ہے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ خدا کے لئے تم بھی رحم کرو اور بتاؤ میرا لڑکا کہاں ہے؟"

ضعیفہ :- میں نہیں جانتی لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ آج کی رات تو بہت سے تازہ پھول اور درخت کملائے ہیں۔ وہ آتی ہی ہوگی اُسے اِن سب کو از سرِ نو دوسری جگہ بونا ہے۔ یہاں کا پتہ پتہ ایک فرد سے مخصوص ہے۔ ہر پھول پتی میں دل ہے ہر دل دھڑکتا ہے۔ زیادہ بےچین نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ تم ان پھولوں میں کان لگا کر اپنا لڑکا پہچان لو لیکن اگر میں تم کو اس سے زیادہ مفید باتیں بتاؤں تو تم مجھے کیا دوگی؟"

ماں :- میرے پاس کچھ نہیں۔ ہاں میں تمہارے لئے ایک سرزمین سے دوسری سرزمین تک جا سکتی ہوں۔"

ضعیفہ :- "لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ؟ ہاں مجھے تمہاری لمبی سیاہ زلفیں بہت پسند ہیں تم مجھے یہی دے دو اور ان کے عوض میرے سفید بال لے لو۔"

ماں :- "بس یہی؟ یہ میں تم کو بخوشی دیتی ہوں"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے سیاہ بال سفید کے عوض دے دیئے۔ اس کے بعد دونوں موت کے باغ میں آئیں۔ یہاں طرح طرح کے پھول پودے اُگے ہوئے تھے کہیں تو نرگس و لالہ کی بے شمار قطاریں تھیں اور کہیں رنگ برنگ کے آبی پودے جن میں بعض تو بالکل تر و تازہ تھے اور بعض بالکل زرد! طرح طرح کے آبی کیڑے اور زہریلے سانپ اُن کی جڑوں میں لپٹے ہوئے تھے! کہیں بڑے بڑے تاڑ اور بلوط کھڑے تھے تو کہیں کرفس کی بیلیں اور دوسرے خوشبودار ننھے ننھے پودے بھی لہک رہے تھے۔ ہر پھول، ہر پودے کا ایک انسانی نام تھا اور ان میں ہر ایک کسی انسان کی زندگی سے متعلق تھا بعض بڑے پودوں کے چھوٹے گملوں میں ہونے سے ان کی جڑیں کمزور ہو گئی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ گملے عنقریب پھٹ جائیں گے بعض چھوٹے پودے وسیع اور زرخیز جگہوں میں لہلہا رہے تھے۔ ان کی جڑوں میں کائی لگی ہوئی تھی۔ لیکن ان کی کافی خبرگیری اور نگہداشت کی جاتی تھی مصیبت زدہ ماں چھوٹے پودوں کے پاس آئی۔ ہر ایک میں اُسے انسانی دل کی دھڑکن سنائی دی۔ اپنے لڑکے کو وہ ہزاروں میں پہچان گئی :-

ماں :- "میرا لختِ جگر یہی ہے!"

اور اس نے ایک نیلے رنگ کے چھوٹے سے پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا جو مرجھا کر ایک طرف لٹکا ہوا تھا!

ضعیفہ:۔ خبردار! ہاتھ سے نہ چھونا۔ تم یہیں کھڑی رہو! اور جب موت آئے ــ اور مجھے ہر لمحہ اس کے آنے کی امید ہے ــ تو اس کو یہ پھول توڑنے نہ دو بلکہ یہ کہہ کر دھمکاؤ کہ میں بہت سے دوسرے پھولوں کا بھی یہی حشر کر دوں گی۔ شاید اس سے وہ ڈر جائے کیونکہ اسے خدا کے یہاں اس کا حساب دینا ہوگا۔ وہ کوئی پھول بلا اجازت نہیں توڑ سکتی!"

دفعتہً ایک نہایت سرد ہوا چلی جس سے اندھی ماں کو معلوم ہوگیا کہ موت آگئی۔

موت:۔ "تم کون؟ اور مجھ سے پہلے یہاں کیونکر آسکیں؟"

ماں:۔ "میں ایک ماں ہوں!"

موت نے اپنا لمبا ہاتھ اس نازک نیلے پھول کی طرف بڑھایا۔ مگر ماں اسے اپنے ہاتھوں سے بالکل ڈھکے ہوئے تھی۔ اس پر موت نے ایک پھونک ماری جو اس قدر سرد تھی کہ ماں نے فوراً اپنے ہاتھ ہٹا لئے:۔

موت:۔ "تم مجھ پر غالب نہیں آسکتیں"۔

ماں:۔ "میرا خدا تو آسکتا ہے۔ وہ ارحم الراحمین ہے!"

موت:۔ "تو میں بھی تو جو کچھ کرتی ہوں اسی کی مرضی سے کرتی ہوں۔ میں اس کی باغبان ہوں۔ اُس کے پھولوں اور پودوں کو یہاں سے لے جاکر باغِ جناں میں جس سے تم واقف نہیں بو آتی ہوں۔ رہا یہ امر کہ وہ باغ کہاں ہے تو میں تمہیں یہ نہیں بتاتی۔"

ماں:۔ (بصد منت وزاری) "مجھے میرا لڑکا دے دو۔"

یہ کہہ کر اُس نے جھٹ سے دو خوبصورت پھول مضبوط تھام لئے! اور بولی "میں تمہارے سب پھولوں کو توڑ ڈالوں گی میں بے چین ہو رہی ہوں!"

موت:۔ "خبردار! ہاتھ سے نہ چھونا۔ تم تو بے چین ہو ہی رہی ہو اور ماؤں کو بھی ہلکان کرنا چاہتی ہو؟!"

ماں:۔ (پھولوں کو ہاتھ سے چھوڑ کر) "اور ماؤں کو؟"

موت:۔ "لو اپنی آنکھیں لو، میں انہیں جھیل سے لیتی آئی ہوں۔ یہ جھیل میں چمک رہی تھیں لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ تمہاری ہیں اب یہ پہلے سے بھی زیادہ شفاف ہیں۔ ان سے اس گہرے کنوئیں میں دیکھو۔ یہاں کا ہر پھول ذی روح ہے۔ جن پھولوں کو تم ابھی ابھی توڑنا چاہتی تھیں میں ان کا نام تمہیں نہ بتاؤں گی لیکن اُن کی انسانی زندگی کا پورا مستقبل تمہیں اس میں منعکس نظر آئیگا اور جنہیں تم ہلاک کر رہی تھیں ان کے حالات بھی اس میں دیکھو۔"

ماں نے دیکھا تو حقیقتہً ایک عجیب نظارہ تھا! ایک تو بڑا خوش نصیب تھا۔ طرح طرح کی نعمتیں اس کی قسمت میں تھیں اور اس کے کارناموں سے دنیا گونجنے والی تھی لیکن دوسرے کی زندگی سرتا پا مصائب و آلام سے پُر تھی اُس کی قسمت میں بجز افلاس کے کچھ نہ تھا۔

موت:- "دونوں خدا ہی کے بندے ہیں مگر ایک دوسرے میں زمین آسمان کا فرق ہے!"

ماں:- (پھولوں کی طرف اشارہ کرکے) "ان دونوں میں بدبخت کون ہے اور خوش نصیب کون؟"

موت:- "میں نہیں بتا سکتی۔ ہاں ان میں سے ایک تمہارے لڑکے کی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ تم نے اپنے لڑکے کے مستقبل کو دیکھ لیا!"

یہ سُن کر ماں خوف سے چیخ اُٹھی:-

"خدا کے لئے بتاؤ میرا بچہ کون ہے؟ معصوم بچے کو بچاؤ۔ اس کو اس کے مصائب سے چھڑاؤ۔ لے جاؤ۔ اسے خدا کے اس باغ میں لے جاؤ جہاں کسی زندہ انسان کے ناپاک قدم نہیں پہنچ سکتے۔ اے موت! بھول جا میری منتوں کو۔ میرے آنسوؤں کو۔ اور جو کچھ میں نے کیا ہے اس کو بھول جا!"

موت:- "میں نہیں سمجھی تمہارا کیا مطلب ہے۔ اپنا لڑکا واپس لوگی یا میں اسے لے جاؤں؟"

ماں فوراً سجدے میں گر پڑی اور خدائے بزرگ و برتر سے ملتجی ہوئی "اے میرے معبود۔ میری نہ سن۔ میری دعاؤں کو نہ قبول کر۔ جو تیری مرضی ہے عین صواب ہے۔ تو دانا و بینا ہے۔ ارحم الراحمین ہے۔ تیری مصلحت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میری نہ سن۔ اے میرے مالک میری نہ سن . . . ."

اور ماں اب مطمئن تھی۔ اس کا سر اُس کے سینہ پر گر پڑا اور اُسے سکون حاصل تھا! اور موت اس کے بچے کو لے گئی وہاں! جہاں کی خبر آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوئی۔ وہ جگہ جو ابد تک انسان کے لئے نامعلوم ہی رہے گی!! . . . .

(ترجمہ) **زبیر احمد**

غزل

کوئی بہرِ خبر نہیں آتا — کوئی آتا، نظر نہیں آتا
دل جو اک بار عشق سے بھٹکا — پھر کبھی راہ پر نہیں آتا
جب سے اُن کا نقاب اُٹھا ہے — لطفِ ذوقِ نظر نہیں آتا
لوگ محفل میں آئے بیٹھے ہیں — میرِ محفل نظر نہیں آتا
دل میں بیٹھا ہے درد کی صورت — جو کسی کو نظر نہیں آتا

لاکھ کوشش ظفرؔ نے کی ہمدم
دل کسی پر، مگر نہیں آتا

ظفر ہاشمی

دوشیزہ اور مرغِ باد نما

اے چمکتے پروں والے سنہری پرند! اے مرغِ باد نما!!
گرجے کے کلس کے اوپر گاؤں کے مینار کی چوٹی پر سے دیکھ کر بتا تجھے کیا کیا دکھائی دے رہا ہے؟

"مجھے مینار پر سے مکانوں کی چھتیں اور گاؤں کے بازار نظر آ رہے ہیں۔
جن میں لوگ ادھر اُدھر پھرتے دکھائی دے رہے ہیں۔
اور دُور بہت دُور بغیر کسی چھت اور بازار کے نمکین پانی کا وسیع سمندر پھیلا ہے۔
جس میں مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں نظر آ رہی ہیں۔

اور جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے ـــ لائن کی بندرگاہ سے بھی بہت پرے ـــ ایک جہاز سمندر سے خشکی کی طرف آ رہا ہے۔
عرشۂ جہاز پر ایک نوجوان گلے کے گرد ایک ریشمیں رومال لپیٹے کھڑا ہے۔
اب وہ اس رومال کو ہونٹوں سے لگا کر بھینچ رہا ہے۔
اب وہ اپنی انگلیوں کے سرے چوم رہا ہے۔
اب وہ دور سے رومال ہلا رہا ہے۔
اور دور ہی سے بیتاب عاشق کے بوسے ساحل کو آ رہے ہیں۔"

"آہ یہی ہے میرے محبوب کا جہاز جس میں وہ باوفا اس قدر بے تاب واپس آ رہا ہے۔
اے مرغِ باد نما وہ تیری طرح نہیں کہ ہوا کے رُخ کے ساتھ ہی بدل جائے۔ اس کی محبت غیر فانی ہے۔"

"اے مخمور نگاہوں والی دوشیزہ! اے سنہری بالوں والی خوبصورت پری!! ذرا ٹھہر تھوڑی ہی دیر میں جب تیرا محبوب تجھ سے ہمکنار ہوگا اور میرا رُخ دوسری طرف پھر جائیگا تو اس وقت دل ہی دل میں خود تو بھی میری ممنون ہوگی۔

(ترجمہ)

مہدی علی خاں

نبی اور رسول

اُصلاحِ ادب کے عنوان سے مولانا نشتر جالندھری کی طرف سے ایک نہایت مفید مضمون ہمایوں میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے جس میں وہ ادبی اغلاط کی اصلاح کر کے ساتھ ہی دلائل بھی پیش کر رہے ہیں۔ اسی مضمون میں ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ اس نام کے ساتھ رسول کی جگہ نبی کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے کیونکہ رسول ایسے پیغمبر کو کہتے ہیں جو صاحبِ کتاب ہو۔ گویا اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرت ابراہیم صاحبِ کتاب پیغمبر نہیں ہیں۔ نیز وہ پیغمبر جو صاحبِ کتاب نہیں اس پر رسول کی جگہ نبی کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔

اس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے قرآنِ کریم سے بڑھ کر کوئی حَکَم نہیں۔ جب ہم قرآن کریم پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبِ کتاب پیغمبر ہیں اور اُن کی کتاب کا ذکر سورہ اعلیٰ کی آخری آیات میں بایں الفاظ کیا گیا ہے:۔ اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُولیٰ صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسیٰ۔ (یقیناً یہ پہلے صحیفوں میں ہے ابراہیم کے صحیفوں میں اور موسیٰ کے صحیفوں میں) اس سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اسی طرح کے صاحبِ کتاب رسول ہیں جس طرح کے حضرت موسیٰ علیہ السلام بلکہ بعض محققین نے تو یہاں تک ثابت کیا ہے کہ وید جنہیں ہندو برہما پر نازل شدہ مانتے ہیں وہ درحقیقت صحفِ ابراہیمی ہی میں سے ایک صحیفہ تھا جس کا نام الوداد تھا اور جو مرورِ زمانہ کے تغیرات سے وید بن گیا! اور برہما دراصل حضرت ابراہیم ہی کا بگڑا ہوا نام ہے چنانچہ مولوی نعمت اللہ خان صاحب گوہر بی۔اے اپنی کتاب تحفۂ ہند و یورپ کے صفحہ ۳ پر فرماتے ہیں:۔ "وید دراصل الوداد ہے جو صحفِ ابراہیمی میں سے ایک گرامی صحیفہ تھا۔ اس کی تدوینِ اوّل ۶۰۰؁ ق م میں بیاس جی کے ہاتھوں ہوئی۔ اسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ بدھ مت کے دور میں ان پر سخت آفت آئی اور قریب قریب دنیا کر مفقود ہو گئے۔۔۔۔ موجودہ وید کو دسکر نامی ایک کشمیری پنڈت نے مرتب کیا جس نے بقول البیرونی غزنویوں کے زمانے میں سہل ترین پہلو ی جس کو آریہ غلطی سے سنسکرت سمجھے بیٹھے ہیں میں مرتب کیا"۔ زیادہ تفصیل اور ثبوت دیکھنے کے لئے خان صاحب موصوف کی کتاب ملاحظہ فرمائی جائے۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبِ کتاب ثابت ہو جانے کے بعد مولانا نشتر صاحب کے مقررہ معیار کے مطابق بھی حضرت ابراہیم کے نام کے ساتھ رسول کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن مولانا موصوف کا معیار بھی قرآن کریم کی رو سے کوئی صحیح معیار معلوم نہیں ہوتا کیونکہ قرآن کریم میں ایسے انبیا کے اسمائے گرامی کے ساتھ بھی رسول کا لفظ آیا ہے جنہیں عموماً مسلمان صاحبِ کتاب تسلیم نہیں کرتے۔ عام طور پر چار ہی کتابیں مشہور ہیں یعنی زبور۔ تورات۔ انجیل اور قرآن لیکن انبیا ایک لاکھ سے بھی زیادہ بیان کئے جاتے ہیں جن میں سے وہ لوگ جو حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ وہ تمام کے تمام تورات ہی پر عمل کرتے رہے۔ اُن کی طرف کوئی علیحدہ کتاب نازل نہیں کی گئی جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں آتا ہے:۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسیٰ الْکِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ (اور ضرور ہم نے موسیٰ کو دی کتاب اور اس کے بعد ہم پے در پے رسول لائے) اس آیت میں حضرت موسیٰ کے بعد پے در پے آنے والوں کو رسول کہا گیا ہے حالانکہ وہ کوئی جدید کتاب لانے والے نہ تھے۔ اسی طرح سورہ طٰہٰ میں خداوند تعالیٰ حضرت موسیٰ اور ہارون سے کہتا ہے کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم رسول ہیں۔ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا (سورہ طٰہٰ آیت ۴۷) یہاں حضرت ہارون کو بھی رسول ہی کہا گیا ہے۔
اسی طرح سورہ شعرا کو ملاحظہ فرمائیے اس میں حضرت نوح حضرت ہود حضرت صالح حضرت لوط حضرت شعیب علیہم السلام کا ان کی اپنی زبان سے رسول کے نام سے ذکر کیا گیا ہے اب قرآن کریم کی اس قدر صراحت کے باوجود یہ کہنا کہ رسول کا اطلاق اسی پیغمبر پر ہوتا ہے جو صاحبِ کتاب ہو انصاف سے بعید ہے ۔

میر اللہ بخش تسنیم

محفلِ ادب

حضرت آدمؑ و حوّا کا قصہ اور آثارِ قدیمہ

حضرت آدمؑ و حوّا کا قصہ کتبِ مقدسہ تورات و انجیل وغیرہ میں مذکور ہے، اور نصرانی علما کا اس خیال پر اتفاق ہے کہ سفرِ تکوین جس میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح میں تحریر فرمایا تھا۔ حال ہی میں کچھ آثار تقریباً دو ہزار سال پہلے کے بعض ماہرانِ آثارِ قدیمہ کو ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن پر حضرت آدمؑ و حوا کا قصہ منقوش ہے۔

یہ قصہ حقیقی ہو یا مجازی، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کی اشاعت قدیم ترین زمانہ سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اخلاف اپنی اسلاف سے اس روایت کو بہ تواتر نقل کرتے رہے ہیں۔ یہ قصہ تورات میں جس نہج سے سطور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کرکے ان کی خاک میں روح پھونکی۔ پھر اُن کی رفاقت کے لئے حضرت حوا کو پیدا کیا جس کی شکل یہ ہوئی کہ حضرتِ آدم پر نیند طاری فرمائی جب وہ سو کر اُٹھے تو اپنی ایک جانب حوا کو پایا۔ حضرتِ آدم اُن کے ساتھ جنت میں عیش و آرام سے بسر کرتے رہے۔ جنت میں جتنے پھول پھل اور میوے وغیرہ تھے ان میں سے کوئی چیز اُن کے لئے ممنوع نہ تھی۔ البتہ ایک درخت کو چھونے اور اس کے پھل کھانے کی سخت ممانعت تھی جو خیر و شر کی معرفت کا درخت تھا اس ممانعت نے دونوں کے دل میں اس کے پھل کھانے کی حرص پیدا کردی۔ اس سے شیطان نے فائدہ اٹھایا اور سانپ کی صورت بن کر حضرت حوا کے پاس پہنچا اور انہیں شجرِ ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب دی۔ حضرت حوا اس کے بہکانے میں آگئیں۔ اس کے پھل خود بھی کھائے اور حضرت آدم کو بھی لالچ دلا کر کھلائے۔ اس نافرمانی سے دونوں پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ یہ جنت سے نکال دیئے گئے اور زمین بھی اُن کی وجہ سے لعنت میں مبتلا ہوگئی۔

جزئیات کو چھوڑ کر نفس روایت قرآنِ کریم میں بھی تقریباً اسی طرح مذکور ہے اور دوسری اقوام قدیمہ کے یہاں بھی کم و بیش اسی قسم کی تفصیل پائی جاتی ہے۔ بہرحال قصہ کا خلاصہ جو زیادہ سے زیادہ ہوسکتا ہے اتنا ہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔ اب مضمون کے دوسرے اجزا سے بحث کی جاتی ہے۔

علمائے آثار کا اتفاق ہے کہ انسانِ اول کا ظہور ان شہروں شہروں میں ہوا جو دو دریاؤں کے مابین واقع تھے اور روایاتِ توریت کے تمام قرینے اس پر دلالت کرتے ہیں کہ باغِ عدن خواہ اس سے مکان حقیقی مراد ہو یا مکان مجازی ایسی ہی جگہ تھا۔ اس مقام کی آب و ہوا وہاں کے چشمے اور کنوئیں اور پھل پھول وغیرہ سب چیزیں انسانی رغبت کے لحاظ سے بہترین تھیں۔

حفریات کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے آثار کو کچھ چیزیں ایسی دستیاب ہوئی ہیں جن سے قصۂ آدمؑ و حوا کی کامل تائید ہوتی ہے۔ یہ اشیا ایسے شہر کے کھنڈروں میں ملی ہیں جو بلاشبہ انسان کے آباد کئے ہوئے شہروں میں سب سے زیادہ قدیم ہے یعنی شہر "تیپ جورا" جو چھ ہزار

سال پہلے تعمیر ہوا تھا۔

ان چیزوں میں ایک ٹھیکری کا ٹکڑا خصوصیت سے اہم اور قابل ذکر ہے اس ٹکڑے پر ایک مرد اور ایک عورت کی شکل کندہ ہے تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ رنج و ملال نے دونوں کی کمر جھکا دی ہے اور حزن و ملال کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ یہ دونوں جنت سے برہنہ نکلے ہیں۔ اُن کے پیچھے ایک سانپ کھڑا ہوا اُن کی نگرانی کر رہا ہے جو گویا ان کی نحوست کی تصویر ہے جس کی بدولت یہ مصیبت میں مبتلا ہوئی ہیں۔

ان مرد اور عورت کا نام تو نہیں لکھا ہے لیکن تصویری قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہ دونوں سانپ کے جال میں پھنس گئے تھے جو اُن کے جنت سے نکالے جانے کا باعث ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اس امر کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ جس نقاش نے اس شکل کو کندہ کیا ہے وہ تقریباً تین ہزار سات سو قبل مسیح یعنی اب سے کوئی پانچ ہزار سات سو برس پہلے موجود تھا۔ یہ زمانہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے قصۂ تخلیق عالم اور قصۂ آدم و حوا کے لکھنے سے دو ہزار سال پہلے کا ہے ٹھیکری پر جو نقش بنا ہوا ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قصہ اس زمانہ میں بھی متداول تھا اور کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ قصہ اپنی نوعیت کا پہلا قصہ ہو جسے انسان نے اپنے جد امجد کی سرگزشت کے طور پر نسلاً بعد نسل روایت کیا ہو اور اسے مختلف طریقوں سے محفوظ رکھنے کی سعی کی گئی ہو۔

شہر "تیب جورا" جس کا اوپر ذکر کیا گیا بلاد بین النہرین کے شمال مشرق میں واقع ہے جن لوگوں نے اس شہر کے کھنڈر دریافت کئے ہیں وہ ایک علمی مہم کے ممتاز ارکان ہیں۔ یہ مہم امریکہ کے کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اہتمام سے ڈاکٹر اسپیزر مشہور ماہر آثار کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھی۔ اس مہم کے کئی سال شہر "ادر" کی کھدائی میں صرف ہوئے۔ یہ وہی شہر تھا جس کے متعلق گمان ہے کہ حضرت ابرہیم خلیل اللہ کا مولد تھا۔ اور اب سے پہلے یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ "ادر" ہی انسان کا بسایا ہوا قدیم ترین شہر ہے۔ جب یہ مہم شہر "ادر" سے فارغ ہوئی تو دوران تلاش میں اُسے شہر "تیب جورا" کے کھنڈروں کا پتہ ملا جن کی کھدائی سے واضح ہوا کہ یہ شہر تو کلدانیوں کے شہر سے بھی زیادہ پرانا ہے بلکہ علمائے آثار کے پوری تجسس اور غور کرنے کے بعد بعض چھوٹے قریوں، غاروں کو مستثنےٰ کر کے انسان کا قدیم ترین شہر "تیب جورا" ہی کو قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قدامت معلوم ہونے کے بعد حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے قصہ والی ٹھیکری ملنے پر کوئی تعجب کی گنجائش نہیں رہتی۔

جو لوگ نص تورات کی بنا پر اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ باغِ عدن بین النہرین واقع تھا اُن کا عقیدہ توریت کی ان آیات سے ماخوذ ہے:۔

"مشرق عدن میں ایک باغ لگایا اور اس میں آدم کو رکھا۔ عدن سے ایک دریا نکلتا ہے جو اس باغ کو سیراب کرتا تھا اور وہاں سے تقسیم ہو کر چار دریا بننے لگے تھے۔ ایک دریائے فیشون جو سرزمین "حویلہ" کو محیط تھا جس میں سونا، گوگل اور حجر الجزع درنگ، پیدا ہوتا تھا دوسرا دریائے جیحون جو سرزمین کوس کو احاطہ کئے ہوئے تھا تیسرا دریائے حدقل جو اشور کے جانب مشرق رواں ہے۔ چوتھا دریائے فرات (سفر تکوین الاصحاح ۲ : ۸)۔"

بعض مفسرین تورات کا خیال ہے کہ فیشون بحر ہند کا نام ہے اور باغ عدن اس کے ساحل پر ہندوستان میں تھا بعض کی رائے میں

لکھنؤ اب سے پچاس سال قبل

حال یہ ہے کہ نو بجے تو خواب سے جاگے اور مجرد آنکھ کھلنے کے ارشاد ہوا کہ حقّہ لاؤ خدمت گار جھٹ پٹ طیار کر کے لایا اُسے بیٹھے بیٹھے پیا کئے جب وہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا تو جمائیاں لیتے ہوئے اُٹھے اور فرمایا میاں الٰہی بخش افیون جلد طیار کرو میں اس وقت بہت بےچین ہوں کل رات کو تو افیون نے ایسا کم نشہ کیا کہ رات بھر نیند نہیں آئی اور ہاتھ پیر ٹوٹا کئے ہر وقت یہی جی میں آتا تھا کہ تمہیں جگواؤں اور تھوڑی افیون پھر منگا کر پیوں چونکہ رات زیادہ بڑھ گئی تھی لاچار اسی بےچینی کے عالم میں پڑا رہا انہوں نے جواب دیا حضور بیت الخلا تشریف لے جائیں افیون تیار ہے۔ اچھا لوٹا رکھواؤ۔ ہم بھی اُٹھتے ہیں۔ حقّہ بھی بھر کر رکھوا دینا۔ دس بجے چوکی پر سے حقّہ اور لوٹا ہاتھ میں لئے ہوئے برآمد ہوئے اور افیون نوش کی حکم ہوا کہ ہمارے بٹیروں کی کابک لاؤ اور شبیر علی بٹیر باز کو بلاتے لانا۔ دیکھوں تو کہ انہوں نے رات کو بھک بھی دی یا نہیں ایسا نہ ہو کہ بھول گئے ہوں پھر پرسوں پانی میں ساری شیخی کرکری ہو۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئے اور منہ دھونے کو پانی طلب کیا بعد فراغ پان نوش کیا۔ خدمتگار نے حقہ بھر کر رکھ دیا۔ اب بٹیروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوست احباب جمع ہوئے چوسر یا گنجفہ ہونے لگا اتنے میں بارہ بجے آدمی نے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ حضور خاصہ طیار ہے۔ فرمایا بازی تمام ہو لے تو چلتے ہیں ایک بجے کے قریب اندر گئے اور کھانا نوش کیا تو اب گویا چوہے نے پارہ پیا۔ اب کب بیٹھا جاتا ہے پان کھاتے ہوئے خسخانہ پہنچے۔ پنکھا کھنچنے لگا۔ پھر آرام کیا۔ چار بجے اگر آنکھ کھل گئی اور کسی سے پوچھا کہ دن کتنا ہوگا۔ ذرا ٹٹی تو ہٹاؤ۔ ٹٹی ہٹانے کے ساتھ ہی دن تو دیکھنا بھول گئے۔ بند کرو صاحب بند کرو۔ اوفوہ کس قدر دھوپ ہے کہ منہ پھنکا جاتا ہے چلانے لگے اگر کسی نے کہا کہ اے حضور چار بج گئے اُٹھئے تو فرماتے ہیں کہ چاہے چار بجیں یا پانچ بجیں ہم تو جب تک یہ دھوپ کی گرمی ہے نہ اٹھیں گے۔ خلاصہ یہ کہ دو گھڑی دن رہے جمائیاں لیتے ہوئے اُٹھے اور منہ دھو کر حقہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ مرغ باز مرغ لے کر آیا۔ اور اس نے بیان کرنا شروع کیا کہ حضور کے نمک کی قسم رن سور ایسا لڑا کہ طرف ثانی کے مرغ کا بالکل خون خرابا ہو گیا اور تمام پالی بھر میں حضور کی دھوم ہو گئی اور دو دو پانی ان پٹھوں کے بھی ہو گئے شام تک اس مشغلہ میں مصروف رہے۔ آٹھ بجے اور چانڈو کی کشتی سامنے لا کر رکھی گئی۔ سب احباب جمع ہوئے اور شغل شروع ہوا معاً شروع ہونے کے داستان گو نے بیچارے امیر حمزہ صاحبقران پر جھوٹ کے پل باندھنے شروع کئے۔ اور عمرو عیار کی جھوٹی عیاریاں اور دروغ بے فروغ بیان کرنا شروع کیا اور وہ جھوٹ کہ جس کا زمین و آسمان پر کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کسی صاحب نے بعد کچھ دیر کے اٹھنے کا قصد کیا تو صاحب خانہ نے اسی وقت اُن کا ہاتھ پکڑا اور کہا میاں ابھی دس بھی نہیں بجے اور تم نے چلتا دھندا کیا۔ میرے سر کی قسم دو چار چھینٹے تو اور پیو۔ دیکھو تو آج مرزا نے کیا عمدہ قوام بنایا ہے جب بارہ بجے خدمتگار نے آکر کہا کہ رات دوپہر سے زیادہ آئی محل میں تشریف لے چلئے۔ خاصہ ٹھنڈا ہوتا ہے ہنس کر کہنے لگے کہ آج تو کیا جلد بارہ بج گئے ہمیں تو ابھی نشہ بھی نہیں ہوا۔ خدا خدا کر کے کشتی سامنے سے اٹھی اور لڑکھڑاتے ہوئے محل میں داخل ہوئے۔ دسترخوان بچھا خاصہ نوش کیا۔ بعد فراغ ہاتھ منہ دھو کر پان کھاتے ہوئے پلنگ پر گئے۔"

"نگار بحوالہ ہندوستانی"

مشرقی و مغربی شعرا کا معشوق

جسٹس شاہ دین بالقابہ نے اپنے تعلیمی خطبہ میں "اردو شاعری" پر حسب ذیل گہرافشانی کی ہے :-

"انسانی تحریکات کا ایک شعبہ جس میں ہم مسلمان فقدانِ تربیت نفس کی وجہ سے نقصان اٹھا رہے ہیں، ہمارا علم ادب ہے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کی توجہ اپنی عاشقانہ شاعری کے ایک شعبے کی طرف مبذول کرانی چاہتا ہوں۔ پرانی طرز کے مسلمان اردو شاعر کا معشوقِ خیالی جو انسانی حسن کا اعلیٰ معیار سمجھا جاتا ہے ایک فوق العادت کرشمۂ قدرت ہے جس کا دہن ھندسہ کے نقطہ سے بھی چھوٹا اور جس کی کمر بال سے بھی زیادہ باریک ہے۔ نقطہ کے ساتھ دہن کی تشبیہہ کی مثال کے لئے تو میں اس فارسی شاعر کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ جس کے طرزِ بیان اور مذاق کی تقلید کی کوشش ہمارے اردو شعرانے کی ہے :-

اے ناقصِ کلام حکیماں بیانِ تو　　کردی بہ نطق نقطۂ موہوم را دونیم!

اور کمر کی تشبیہہ کی مثال میں میں ایک اردو شاعر کے ایک مشہور شعر کا حوالہ دیتا ہوں ؎

کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے　　صنم! کہتے ہیں تیرے بھی کمر ہے

اگر آپ حضرات ایک لحہ کے لئے غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قلمرو ادب میں اس قسم کی شاعری جو شاعر کے انتہائی مبالغہ کے شوق کو ظاہر کرتی ہے، قوتِ شاعری میں تربیتِ ضبط کے فقدان پر دال ہے اور جب آپ بھی یہ خیال فرمائیں گے کہ علم بلاغت کے جید مصنفین صنعت مبالغہ کو ان استعارات میں بلند مرتبہ دیتے ہیں جن سے ہماری شاعری میں خوبی اور قوت پیدا ہوتی ہے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ضبط و تربیت کا فقدان نہ صرف ہماری روزمرہ کی زندگی میں پایا جاتا ہے بلکہ تخیل کے ان قدرتی سرچشموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو ہماری ذہنی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔"

اس پر لسان العصر حضرتِ اکبر نے یہ دلچسپ منظوم لطیفہ خاص نقاد میں درج ہونے کے لئے مرحمت فرمایا جس کی شوخی و ستم ظریفی ناظرین نقاد سے خراجِ تحسین و آفرین وصول کئے بغیر نہ رہے گی۔ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :-

کمر پتلی سنا کرتے تھے آگے　　مگر اب اس کو سب کہتے ہیں معدوم

ٹٹولا اس قدر ان شاعروں نے　　مچائی اس قدر گردِ کمر دھوم

جو کچھ تھی بھی ندارد ہو گئی وہ　　بہ ظاہر تو یہی ہوتا ہے معلوم

پھر ایسی عاشقانہ شاعری کیا　　یہی ہے وعظِ شاہ دین کا مفہوم

مشرقی شعرا کا معشوق تو آپ دیکھ چکے۔ اب اسی سلسلہ میں مغربی شعرا کا معشوق بھی ملاحظہ ہو جس کی تصویر مولانا عبدالحلیم صاحب شرر دلگداز میں یوں کھینچتے ہیں :-

۱۹۰۵ء میں لندن میں "پنچ میگزین" ایک ماہوار رسالہ نکلا کرتا تھا جس میں صرف تصویریں ہی ہوا کرتی تھیں۔ اس کے بہت سے نمبر میرے پاس بھی موجود ہیں۔ اس کے کسی نمبر میں وہاں کے شعرا کے معشوق کے خیالی حلیہ کی ایک تصویر بنا کے دکھائی گئی تھی اس کی گردن تو ہنس کی پتلی خمدار گردن تھی۔ ہونٹوں کی جگہ پر مونگے کے ٹکڑے تھے اور ان کے درمیان موتیوں کی دو لڑیاں تھیں۔ گالوں کی جگہ گلاب کے پھول تھے اور کانوں کی جگہ سمندر کے دو مدوّر لہر دار شل (سیپ اور شاخ مرجان کی قسم سے سفید سفید مختلف الوضع چیزیں جو سمندر سے نکلتی ہیں) لگے ہوئے تھے اور بالوں کی جگہ سیکڑوں ہزاروں قفل جڑے ہوئے تھے (انگریزی میں بالوں کے گھونگروں کو "لاک" کے لفظ سے تعبیر کیا کرتے ہیں جس کے اصل معنی قفل کے ہیں)۔

اب دونوں معشوقوں کے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا نکتہ سنج ناظرین نقاد کا کام ہے۔ کہ مشرقی معشوق اچھا ہے یا مغربی؟ ہمارے خیال میں کسی زبان کی شاعری ان شاعرانہ نازک خیالیوں اور خیالی نقطہ آفرینیوں سے خالی نہیں لیکن خشک دماغ والے ان نازک مسائل کے جذب کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

دلبستان بحوالہ نقاد جنوری ۱۹۱۴ء

محبّت

مترجمہ مرحوم آنریبل سر میاں محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لاء لاہور

بتائے کوئی عشق کیا چیز ہے؟ | زباں ہیں جس کے بیاں پر فدا
یہ کیسی تڑپ ہے کہ جس کے بغیر | نہیں چین انساں کو آتا ذرا

یہ ہے کیوں مثالِ ہوا بے قرار | شناسا تغیّر سے ہے کیوں مدام
یہ موجِ خوشی ہے کہ طوفانِ غم؟ | دیا ہے یہ دونوں کے ملنے کا نام

محبت ہے آقا محبّت غلام! | یہ ہے مہرباں بھی دلآزار بھی
اگر ہو تو رہتا ہے دل بے قرار | نہ ہو تو نہیں دل کو راحت کوئی

ہے ممکن کہیں اس سے ہم اجتناب | یقیناً مجھے اس میں شک ہی کمال
خوشی ہے یہی اس کے صدمے سہول | بغیر اس کے ہے زندگانی محال

دلبستان بحوالہ مخزن ۱۹۰۲ء

مطبوعات

اقبال اس کی شاعری اور اس کا پیغام۔ مصنفہ شیخ اکبر علی صاحب بی اے ایل ایل بی یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کا موضوع جو اس کے نام سے ظاہر ہے موجودہ ادبیات میں بہت اہم ہے ہمیں مسرت ہے کہ شیخ صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال اور اس کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اقبال کے متعلق اس قسم کی تصنیفات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارا ملک ابھی زندہ ہے اور جوہر شناس نگاہوں سے محروم نہیں ہوا۔ کتاب کا حجم ۲۰۰ صفحات ہے قیمت مجلد چار روپے۔ پتا :- شیخ اکبر علی صاحب ایڈوکیٹ ہسپتال روڈ لاہور

غالب کے دس جواہر۔ یہ ایک خوبصورت چھوٹی سی انگریزی کتاب ہے، جو ہمارے نوجوان ادیب اور مصور دوست مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ کے حسن مذاق کی آئینہ دار ہے۔ غالب کے دس اشعار مع انگریزی ترجمے اور تصاویر کے دبیز آرٹ پیپر پر حسن اہتمام سے شائع کئے گئے ہیں۔ انگریزی ترجمہ بھی نظم میں ہے اور قابل تعریف ہے مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ کی کھینچی ہوئی کئی تصاویر ہمایوں میں اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں اور ناظرین ہمایوں ان کی مصورانہ قابلیت سے واقف ہیں۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے۔ ہر شعر کی تصویر خوبصورت اور موزوں ہے۔ قیمت ایک روپیہ
پتا :- مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ صاحب۔ یوسف بلڈنگ۔ فریزر روڈ۔ پٹنہ

نخلستان۔ یہ ایک ماہوار ادبی و اصلاحی رسالہ ہے جو کچھ عرصہ ہوا ملتان سے جاری ہوا تھا ستمبر ۱۹۳۳ء سے اس کی نگرانی کا کام ہمارے قابل دوست ن۔ م۔ راشد صاحب ایم۔ اے نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ناظرین ہمایوں حضرت راشد کے اشعار سے بارہا لطف اندوز ہو چکے ہیں ان کی نظمیں اردو شاعری میں ایک نئے دور کی نقیب ہیں پیش نظر پرچے کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک قابل ادیب کی نگرانی نے یک لخت نخلستان کا معیار کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے چندہ سالانہ تین روپے اور ششماہی اڑھائی روپے سالانہ ہے۔ پتا :- مینجر "نخلستان" ملتان۔

تعلیم غذا اور تعلیم علاج :- یہ دو کتابیں کویراج ہرنام داس بی اے کی تصنیف ہیں کویراج صاحب کو فن طب میں بہت شہرت حاصل ہے۔ زیر نظر دونوں کتابوں میں غذا اور علاج کے متعلق بہت سی ایسی ہدایات درج ہیں جن سے لوگ عموماً غافل ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ہر شخص کے زیر مطالعہ رہنی چاہئیں تعلیم علاج کا حجم سوا سو صفحات اور قیمت ۶ر ہے تعلیم غذا کا حجم ۱۶۰ صفحات اور قیمت ۸ر ہے۔ پتا :- کویراج ہرنام داس بیرون لوہاری دروازہ لاہور

زندگی مصنفہ ملا رموزی۔ حجم ۲۱۲ صفحات قیمت دو روپے۔
ملا رموزی صاحب کے مزاحیہ طرز تحریر سے ملک روشناس ہے۔ بالخصوص ان کی گلابی اردو بہت مشہور ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں ملا صاحب کے حسب ذیل مضامین ہیں (۱) اپنے علی گڑھ کالج کا مشاعرہ (۲) ساڑھے پانچ دن کا علی گڑھ (۳) علی گڑھ سے بگڑ تک (۴) ہندوستانی اولاد (۵) کھانسی (۶) طلبہ کا سفر (۷) سقے کے پیچھے (۸) ذرا کان پور تک (۹) دست بدست (۱۰) عید کے بعد وغیرہ کل تیرہ مضامین ہیں ملا رموزی کی تصانیف ادب میں ایک خاص درجہ رکھتی ہیں اور اس قسم کی اچھی کتابیں بلا شبہ قدر کے قابل ہوتی ہیں۔ پتا :- ملا رموزی توحیدی صاحب بھوپال۔

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔